پاکستان اور ایشائی امن

مُرتب
وی۔ ڈی۔ چوپڑا

تعارف
رشید الدین خاں

پاکستان اور ایشیائی امن

مرتب

وی۔ ڈی چوپڑا

تعارف

رشید الدین خاں

انڈین سینٹر فار ریجنل افیسیرس کی جانب سے

پیٹیریاٹ پبلیشرز، نئی دہلی

نے شائع کیا

پاکستان اور ایشیائی امن

پہلا اردو ایڈیشن، دسمبر ۱۹۸۵ء

ناشر
پیٹریاٹ پبلیشرز
رلنک ہاؤس
بہادر شاہ ظفر مارگ
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فہرستِ مضامین

مُصنّفین

ڈاکٹر رشید الدین خاں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں 'اسکول آف سوشل سائنسز کے پولیٹیکل سٹڈیز سینٹر کے پروفیسر ہیں۔ وہ پارلیمنٹ کے ممبر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف حیثیتوں میں کئی سرکاری اور پیشہ وارانہ اداروں کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ 'ہندوستان میں حکومت اور سیاست'، 'وفاقیت اور علاقہ پرستی'، 'سماجی تبدیلی اور تشدد'، 'خارجہ پالیسی سے تعلق سٹڈیز'، اور 'بین الاقوامی سیاست' ان کی تحقیق کے خاص موضوع ہیں۔ انھوں نے دور دور تک سفر کیا ہے اور تقریباً تمام براعظموں کے چھیالیس ملکوں کا دورہ کیا ہے۔ انھوں نے بہت سے تحقیقی پراجیکٹوں کی رہبری بھی کی ہے اور علم و تحقیق کے سلسلے میں اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ وہ تقریباً ڈیڑھ سو مقالات، مضامین اور درجنوں کتابوں اور مونوگرافس وغیرہ کے مصنف ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں یہ شامل ہیں: "عراق: دی سٹرگل فار انڈیپنڈنس ۱۹۳۲ — ۱۹۱۴ء" 'چارمینار: اے پروفائل ان کمیونل پالیٹکس'، 'این ڈے جینس ان ٹیلیکچول کریئیٹویٹی: دی اے تھوس آف دی کمپوزٹ کلچر آف انڈیا'، 'دی اسلامک کینسپٹ آف ہیومن ایکویلٹی از این ایکسیل پرنسپل آف سوشل ٹرانسفارمیشن'۔ اس کے علاوہ وہ 'وائیلنس اینڈ اٹس کازیز' کے ساتھی مصنف ہیں اور انھوں نے 'پرسپیکٹیو آف نان الائن مینٹ' اور 'انڈیا اینڈ سوویت یونین: کوپریشن اینڈ ڈیولپمینٹ' کو مرتب کیا ہے۔

وی ڈی چوپڑا ایک آزمودہ کار صحافی اور مصنف ہیں وہ 'پیٹریاٹ' اور 'لنک' کے اڈیٹوریل بورڈ کے ڈپٹی چیرمین ہیں۔ انھیں اپنی تصنیف 'انڈیا اینڈ دی سوشلسٹ ورلڈ' کے لیے سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ حاصل ہوا ہے۔ ایک اور کتاب 'پینٹاگن شیڈو اوور انڈیا' کے مصنف ہونے کے علاوہ انھوں نے "اسٹڈیز ان انڈو پاک ریلیشنس" کتاب کو مرتب کیا ہے۔ 'اگونی آف پنجاب' اور 'انڈیاز یونٹی اینڈ سی کیورٹی: چیلنجز' کے وہ ساتھی مصنف ہیں۔

فیروز احمد پاکستان، کناڈا اور امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں میں معلم رہے ہیں۔ ان میں ہارورڈ شامل ہے چار کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ ان کے تقریباً دو درجن مقالے علمی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ مشہور میگزین 'پاکستان فورم' کے تب تک اڈیٹر، پبلشر رہے جب تک اس پر پابندی لگائی گئی۔

پیش لفظ

پاکستان کو ایشیا میں ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ وہاں کے فوجی ڈکٹیٹروں کی بیرونی اور اندرونی پالیسیوں سے ایشیا اور خاص طور پر جنوبی ایشیا کے حالات و واقعات بہت حد تک متاثر ہونے لگے ہیں۔ پاکستان اور بیرونی ممالک کے سکالروں کے مطالعہ کا دائرہ آج تک ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کی اندرونی پالیسیوں، ملکی نظام کے ارتقا اور نئے حکمراں طبقے، جمہوریت اور جدید ڈھنگ کی مملکت کے لیے عوام کی جدوجہد، برصغیر میں پاکستان کے رول اور سب سے بڑھ کر ہند، پاک تعلّقات کی تحقیق و تفتیش تک محدود رہا ہے۔

علاقائی امور سے متعلق ہندوستانی مرکز، جو سکالروں، عالموں، صحافیوں اور سابق سفارت کاروں کی ایک خود مختار انجمن ہے، کی طرف سے ۱۸، مارچ سے ۲۰، مارچ تک تین دنوں کا ایک بین الاقوامی سیمنار منعقد کیا گیا۔ جس کا موضوع "جنوبی ایشیا کے سیاسی نظام اور علاقائی استحکام" تھا۔ سیمنار کے ایک مکمل اجلاس میں پاکستان میں سیاسی نظام کے ارتقا اور علاقائی امن واستحکام پر اس کے اثرات پر غور ہوا۔ مرکز کی دعوت پر پاکستان کے ایک جانے پہچانے سکالر فیروز احمد نے سیمنار میں شرکت کی۔ انھوں نے پاکستان کے حکومتی ڈھانچے اور اس کی اندرونی و بیرونی پالیسیوں پر قابل قدر خیالات کا اظہار کیا۔ پاکستان کے ایک اور نامور سکالر حسن این گردیزی سیمنار میں شرکت نہ کرسکے لیکن انھوں نے اپنا ایک مقالہ بھیجا۔ پاکستانی امور کے دو ہندوستانی ماہروں کلیم بہادر اور پانڈو نائک نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ یہ مقالے کتاب کے دوسرے حصّے میں شامل ہیں۔

مقالہ نگار حضرات کو علم وتحقیق کے مختلف شعبوں میں دسترس حاصل ہے اور یہ ایک دوسرے سے الگ الگ طور پر کام کر رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ پاکستان میں مطلق العنانیت اور مذہبی بنیاد پرستی کے فروغ کے بارے میں یکساں نتیجوں پر پہنچتے ہیں۔ اپنی چار دہوں کی تاریخ میں پاکستان نے نہ صرف اپنے مشرقی حصّے کو آزاد ہوتے ہوئے دیکھا بلکہ اسے بیرونی

دباؤ اور اندرونی تضاد کی ان تمام تر صورتوں کا سامنا کرنا پڑا جو ایک نئے نو آباد ملک کو کرنا پڑتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان کے وجود نے وہاں کے لوگوں میں یہ توقعات پیدا کیں کہ اب وہ اپنی قسمت کے خود مالک بن جائیں گے۔ لیکن ان کی یہ آرزو آج تک پوری نہیں ہوئی۔ عوام آج بھی بے انتہا ظلم و ستم کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ حالاں کہ فوجی حکمراں ٹولہ "مسلم قوم"، "مسلم معیشت" اور "مسلم سیاسی نظام" جیسے نعروں سے ان کی توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے وقت اس کا بیشتر حصہ کم ترقی یافتہ تھا۔ مسلم لیگ، جس نے مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ مملکت قائم کرنے کی تحریک کی سربراہی کی تھی، کی قیادت پر جاگیردار طبقے اور متمول پیشہ وروں اور تاجروں کے ایک گروپ کا غلبہ تھا۔ اور ان رہنماؤں کا تعلق ان علاقوں سے تھا جو آج ہندوستان میں ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مشرقی بنگال، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ میں اس تحریک کی کوئی سماجی بنیاد موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے پاکستان کے سیاسی تانے بانے میں ایک تضاد پیدا ہو گیا۔ اس تضاد کو جمہوری سیاسی نظام اور ایسی اقتصادی پالیسی پر عمل کر کے ہی دور کیا جا سکتا تھا جس کا مقصد آزادانہ ترقی ہو۔

سیمنار میں بحث و مباحثہ کے دوران میں پی این ہاکسر نے جنوبی ایشیا کے ممالک میں سیاسی نظاموں کے ارتقا کی مختصر تاریخ اور ان ملکوں کی سماجی اور اقتصادی ترقی کے مختلف عالمی پہلوؤں کی وضاحت کی اور کہا کہ ان کا عالمی پس منظر کو نظر انداز کر کے مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب کے دوسرے حصے میں پاکستان کے سیاسی حالات کے تجزیہ کے لیے تاریخی اور نظریاتی بنیاد پیش کی گئی ہے اور کتاب کے پہلے حصے میں عالمی سیاسیات میں پاکستان کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کتاب میں پہلی بار یہ کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کو ہند۔ پاک اور افغان۔ پاک تعلقات کے پس منظر میں دیکھنے کی روایت سے آگے بڑھ کر ایشیا میں پاکستان کے حکمراں طبقے کے رول کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے۔

پاک۔ امریکہ اور پاک۔ چین تعلقات اور بدلتے ہوئے بین الاقوامی مناظر میں ان

دونوں ملکوں کی پالیسیوں کا پاکستان کی طرف جھکاؤ کا اسی زاویۂ نگاہ سے جائزہ لیا گیا ہے ۔

علاقائی امور سے متعلق ہندوستانی مرکز کا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب سے ان طلبا اور قارئین حضرات کی ضروریات پوری ہوں جو تاریخی اور دوسرے مختلف پہلوؤں کے پس منظر میں مملکت پاکستان، پاکستان کے معاشرے اور یہاں کے حکمراں طبقے کی پالیسیوں کے بارے میں مفصل اور جامع معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ پاکستان کے سماج کے تغیر و تبدل اور حکمراں طبقے کی خارجہ پالیسیوں پر اس کے اثرات کی طرف اکثر وہ توجہ نہیں دی گئی ہے جس کے یہ مستحق تھے۔ مرکز کو امید ہے کہ زیر نظر کتاب اس موضوع پر موجود مواد میں اضافہ ہوگا۔

کتاب میں یہ دکھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان میں خاص طور پر پاکستان کی نوجوان نسل میں سیکولر اور جمہوری رجحانات کو ایک ٹھوس قوت کی حیثیت حاصل ہے۔ پاکستان کے حکمرانوں کا تنقیدی جائزہ اس صورت میں غیر متوازن رہے گا اگر اس میں ملک کے ان اہم عصری رجحانات کو نظرانداز کیا گیا۔

کتاب میں شامل مضامین میں اگر نقطہ نظر اور نتائج میں یکسانیت پائی گئی، تو اس میں نہ تو ارادے کو دخل ہے اور نہ اتفاق کو۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تجزیے بے لاگ ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان مقالوں اور مضمونوں میں ظاہر کیے گئے خیالات مقالہ نگاروں اور مضمون نگاروں کے ہیں، مرکز کے نہیں۔ مرکز نے اس کتاب کو صرف اس لیے شائع کیا ہے کہ بحث و مباحثہ کی ترغیب ملے۔

مرکز مضمون نگار حضرات کا شکرگزار ہے کہ انھوں نے ان مقالوں کو کتابی صورت میں چھاپنے سے اتفاق کیا۔ "پیٹریاٹ" پبلشرز کا بھی مرکز شاکر ہے جنھوں نے اس کو تندہی اور جانفشانی کے ساتھ شائع کیا۔

نئی دہلی
جون ۱۹۸۵ء

وی ۔ ڈی ۔ چوپڑا

تعارف

اسّی کی دہائی کے وسط میں جب کہ اکیسویں صدی کی شروعات میں محض پندرہ سال باقی رہ گئے ہیں، ہم نے عالمی تاریخ اور عالمی سیاست کے ہنگامہ خیز چالیس سال پورے کر لیے ہیں۔ ان چالیس برسوں میں بنی نوع انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں خواہ وہ مقامی ہوں، قومی یا عالمی سطح پر، متنوع تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ انسانی تاریخ میں کوئی بھی چالیس سال اتنے تخلیقی، جدّت سے پُر، ولولہ انگیز اور پُراز واقعات ثابت نہیں ہوئے ہیں جتنے کہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۵ء تک کی مدّت کے۔ اور اس سے پہلے عالمی سطح پر اتنے بڑے پیمانے پر کبھی بھی ایسا ردو بدل نہیں ہوا جن سے علاقے، خطّے، جزیرے اور خشکی سے گھرے ہوئے ممالک اور معاشرے وغیرہ متاثر نہ ہوئے ہوں۔ بے شک یہ تبدیلیاں مقامی حالات، اور تہذیب وتمدن کے مطابق کہیں زیادہ ہیں اور کہیں کم۔

یہ تبدیلیاں اور تغیر اتنی تیزی سے رونما ہوا کہ اس سے قبل انسانی تاریخ کے مختلف عہدوں میں ان تبدیلیوں کے لیے صدیوں لگ گئے تھے۔ لیکن ان چالیس برسوں کی تبدیلیاں اتنی وسیع اور متنوع ہیں کہ انسان کی بنیادی ضروریات مثلاً خوراک، کپڑا، مکان اور ماحولیاتی توازن کے علاوہ ایک طرف صحت و ادویات، تعلیم، اطلاعات، مواصلات، ذرائع ابلاغ اور مجلسی ثقافت پر اثر پڑا اور دوسری طرف اس شعبے میں انقلابی نوعیت کی تبدیلیاں آئیں جسے لطیف اور شائستہ زبان میں دفاعی ٹیکنالوجی کہا جاتا ہے۔ ہتھیاروں کے نظاموں کو وسعت دی گئی اور نئے سسٹم تیار کیے گئے اور اس طرح روایتی اور ایٹمی ہتھیاروں کو زمین، سمندر اور خلا میں زبردست فروغ ملا۔ اجتماعی موت کے یہ ذرائع بظاہر اقوام متحدہ کے اجتماعی سلامتی کے نظریے کے ڈھانچے کے اندر مختلف حکومتوں اور باہم دشمنانہ اتحادوں کو دستیاب ہیں۔ ان ہتھیاروں کو باہم یقینی تباہ کاری کے نام نہاد اصول کی بنیاد پر حق بجانب قرار دیا جاتا ہے جو بنی نوع انسان کے سر پر تلوار کی طرح لٹکا ہوا ہے اور اس سے انسانی ذہانت کی کامیابیوں اور شاندار کارناموں کے وجود کے نیست و نابود ہونے کا خطرہ درپیش ہے۔

دنیا اور انسانی زندگی میں اس زبردست کایا پلٹ میں کچھ ایسے بھی واقعات ہیں جو فیصلہ کن نوعیت کے ہیں اور کافی اہمیت کے حامل۔ بہ یک وقت رونما ہونے والے ایسے دس فیصلہ کن واقعات آپسی ربط اور باہمی اثر کی وجہ سے ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔ ہم ان دس واقعات کو پانچ جوڑوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ عالمی سیاست : نوآبادیت سے آزادی / ملکوں کی تعداد میں اضافہ
۲۔ عالمی سفارت کاری : عالمی برادری / عالمی طاقتیں
۳۔ عالمی معیشت : دوسرا صنعتی انقلاب / کثیر الملکی کارپوریشنیں
۴۔ عالمی تمدّن : آبادی میں اضافہ / معاشرۂ عامّہ۔ تمدن عامّہ
۵۔ عالمی حکمت عملی اور سلامتی : ہتھیاروں کی دوڑ / ترک اسلحہ جات اور امن کی تجاویز

اِن دس واقعات میں تضاد اور مصالحت کے پہلو ہیں، جیسے ٹکراؤ اور میل مِلاپ کے علاقے ہیں جو ان کو ایک مجموعی ہیئت کی صورت میں ایک جدلیاتی رشتے میں جوڑ دیتے ہیں۔

اِن پہلوؤں کے آپسی ربط اور انسانی حالات پر ان کے مجموعی اثرات کے نتیجے میں عالمی پیمانے پر ایک دوسرے پر انحصار کا رجحان نظر آتا ہے۔ یہ رجحان فن سیاست، قومی تعمیر نو، سفارت کاری، سماجی و اقتصادی عمل، دفاعی حکمت عملی اور سلامتی کے نظام، سائنس و ٹیکنالوجی، تعلیم، مواصلات اور اطلاعات ہر جگہ نظر آرہا ہے۔ بین انحصاری اور بقائے باہم میں بین انحصاری کی مجبوریوں نے ملکوں اور عوام کو ایک دوسرے کے بالکل نزدیک لایا ہے۔ اور اس کو ایک پے چیدہ بین الاقوامی نظام کی صورت حاصل ہوئی ہے۔ سمٹی ہوئی اور باہم مربوط دنیا کے لازمی اثرات وسیع پیمانے پر اجتماعی انسانی زندگی اور تہذیبی سرگرمیوں میں ظاہر ہورہے ہیں۔ لہٰذا بہتر اور زیادہ منصفانہ، انسان نواز اور جمہوری عالمی نظام کی تشکیل، و ترقی کے عمل میں بین انصاری کے انتظام کو ایک لازمی اور ناگزیر عنصر کی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

نوآباد ملکوں کی آزادی اور نئی مملکتوں کا قیام

یوروپی نوآبادیاتی نظام انیسویں صدی کے وسط تک ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ اور جزائر اوشینیا میں اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اس نظام کو عالمی پیمانے پر وسعت لگ جانے سے سرمایہ دارانہ نظام کے پھیلاؤ میں مدد ملی۔

پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) جو سامراجی طاقتوں کے درمیان ایک بہت بڑا ٹکراؤ تھا، کے خاتمے سے نوآبادیت کو ختم کرنے کے سلسلے میں کوئی قابل قدر عمل شروع نہیں ہوا۔ محض جرمنی کے سامراج کو توڑا گیا اور اس کی افریقی بستیوں پہ برطانوی اور فرانسیسی سامراج نے مال غنیمت سمجھ کر قبضہ کیا۔ تاہم روسی زار کی سلطنت کے خاتمے سے نوآبادیت ختم کرنے کا ایک نیا نظام وجود میں آیا۔ ۱۹۱۷ء کے سوشلسٹ انقلاب سے ایک ایسی مملکت اور سیاسی نظام وجود میں آیا جو مختلف اور انقلابی تھا اور جو اپنے

عقائد کی بنا پر سامراجیت کا مخالف تھا۔ اس نے نو آباد ملکوں کو خود مختار ملک بنانے کی منادی کی۔ ۴۵-۱۹۳۹ء کی دوسری جنگ عظیم کے بعد آٹھ یورپی ملکوں، گریٹ برٹن، فرانس، سپین، پرتگال، ہالینڈ، جرمنی، بلجیم اور اٹلی کے زوال سے نو آبادیت کے خاتمے کا زبردست دور شروع ہوگیا اور اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ چالیس کی دہائی کے اواخر میں برطانیہ کو ہندوستان چھوڑنا پڑا اور انڈونیشیا آزاد ہوگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سو بیس سابق کالونیاں خود مختار بنا دی گئیں۔ موجودہ دنیا کے ایک سو ساٹھ ملکوں میں تین چوتھائی ایسے ہیں جنھیں نو آبادیاتی نظام سے نجات ملی ہے۔

جن ملکوں کو نو آبادیت سے چھٹکارا ملا ہے ان میں اکثر رقبے اور آبادی کے اعتبار سے بہت چھوٹے ہیں اور ان کی نہ صرف قومی آمدنی اور فی کس آمدنی بہت کم ہے بلکہ پروٹین کا استعمال، توانائی کی کھپت، ادویات کی فراہمی، اوسط عمر، خواندگی اور پینے کے صاف پانی تک رسائی وغیرہ بہت کم ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے کسی ملک کی سماجی و اقتصادی ترقی کو پرکھا جا سکتا ہے اور جو معیار زندگی کے دائرے میں آتی ہیں۔

جہاں تک رقبے کا تعلق ہے۔ بارہ ملک ایسے ہیں جن کا کم سے کم رقبہ ایک سو مربع کلومیٹر ہے اور زیادہ سے زیادہ دس ہزار کلومیٹر۔ پچیس ملک ایسے ہیں جن کا کم سے کم رقبہ دس ہزار مربع کلومیٹر ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ کلومیٹر۔ ترپن ملک ایسے ہیں جن کا کم سے کم رقبہ ایک لاکھ ایک مربع کلومیٹر ہے اور زیادہ سے زیادہ دس لاکھ مربع کلومیٹر۔ ایسے صرف بیس ملک ہیں جن کا رقبہ دس لاکھ مربع کلومیٹر اور ایک کروڑ مربع کلومیٹر کے درمیان آتا ہے۔ ان میں سے بہت سے ملک ایسے ہیں جو بس چھوٹے جزیرے ہیں کئی خشکی سے گھرے ہوئے چھوٹے ملک ہیں، کچھ درمیانی سائز کے ہیں اور صرف [illegible] ایسے ہیں جن کا رقبہ وسیع ہے۔

آبادی کے اعتبار سے بتیس ۳۲ ملک ایسے ہیں جن کی آبادی فی کس دو لاکھ سے کم ہے، تیس ایسے ہیں جن کی آبادی دس لاکھ اور پچاس لاکھ کے درمیان ہے۔ باقی چونسٹھ ملکوں میں سے، جن کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے، صرف اکتیس ملک ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد ملک ہیں اور ان اکتیس ملکوں میں سب سے زیادہ آبادی والے گیارہ ملکوں میں چار جنوبی ایشیا میں ہیں۔ ہندوستان، بنگلہ دیش، پاکستان، اور سری لنکا۔ دو جنوب مشرقی ایشیا میں۔ ملائشیا اور انڈونیشیا۔ اور پانچ افریقہ میں۔ نائجیریا، تنزانیہ، کینیا، یوگنڈا اور گھانا۔

سالانہ قومی آمدنی کے لحاظ سے ستہتر ملک سب سے کم ترقی یافتہ ملکوں کے زمرے میں آتے ہیں اور ان میں چھ ملک اس فہرست کے سب سے نیچے ہیں اور ان کی قومی آمدنی ایک سو ڈالر سے

بھی کم ہے۔ اکہتر ملک ۱۰۱ ڈالروں سے لے کر ایک ہزار ڈالروں کے زمرے میں ہیں۔ اٹھائیس ملکوں کی فی کس آمدنی ایک ہزار ایک اور دس ہزار ڈالروں کے درمیان ہے۔ صرف تین ملک ایسے ہیں جہاں فی کس سالانہ آمدنی دس ہزار ڈالروں سے زیادہ ہے نو آبادیات سے چھٹکارا حاصل کرنے والی ترقی پذیر دنیا کے سب سے زیادہ آبادی والے گیارہ ملکوں میں چھ غریب ترین مانے جاتے ہیں۔ تین غریب اور باقی دو ملک ایسے ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ مفلسی اور امید کی نیم ظلمت میں ہیں۔

ان ملکوں کی سماجی اور اقتصادی ترقی کے مرحلے اور طریقے بھی مختلف نوعیت کے ہیں۔ موٹے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اٹھائیس قبائلی دور سے نکل چکے ہیں اور صنعتی دور میں داخل ہونے کے مرحلے کے نزدیک ہیں۔ اکتیس جاگیردارانہ نظام سے نکل چکے اور سرمایہ دار دور کے باہر ہیں۔ چونتیس سرمایہ دارانہ نظام کے ابتدائی دور کے مختلف مرحلوں پر ہیں جن میں چند ملکوں کے ہاں ملی جلی معیشت کا نظام ہے یعنی سرکاری اور پرائیویٹ سیکٹر دونوں۔ بیس ملکوں نے سماجی اور اقتصادی ترقی کے کام کو سوشلسٹ سمت دی ہے اور اس زمرے میں شامل ملک قبائلی دور اور جاگیردارانہ دور سے نکل کر صنعتی دور کے باہر ہیں۔ ان کے علاوہ سات ترقی پذیر سوشلسٹ ملک ہیں جو ترقی کے صنعتی دور سے پہلے کے مرحلوں پر ہیں۔

نو آزاد ترقی پذیر ملکوں کی سب سے زیادہ نمائندہ کثیر الملکی فورم غیر جانبدار تحریک ہے جس کو ۱۹۶۱ء میں اس کے پچیس بانی کاروں نے اپنی بلگراد کی پہلی کانفرنس میں تشکیل دیا تھا۔ بلگراد کی کانفرنس کے بعد سے اس کے ممبروں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور ۱۹۶۴ء میں قاہرہ کی دوسری چوٹی کانفرنس میں ۴۷ تک، لوساکا کی ۱۹۷۰ کی تیسری کانفرنس میں ۵۳، ۱۹۷۳ کی الجیرس کی چوتھی کانفرنس میں ۷۵، ۱۹۷۶ء کی کولمبو کی کانفرنس میں ۸۵، ۱۹۷۹ء کی ہوانا کی کانفرنس میں ۹۲، اور ۱۹۸۲ء کی دلی کانفرنس میں ۱۲۰ تک پہنچ گئی۔ ان ۱۲۰ ملکوں میں مہمان ملک اور ممبر ملک شامل ہیں۔ تحریک کے ممبروں میں اضافہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف نسلوں اور علاقوں اور تمدنوں سے تعلق رکھنے اور مختلف سماجی و اقتصادی اور سیاسی نظام رکھنے کے باوجود ان نو آزاد ملکوں کو ایک دوسرے سے اتحاد عمل اور یک جہتی کا احساس ہے اس تحریک سے ان کو اپنی بات کہنے اور احتجاج کرنے کا فورم اور مشترکہ کارروائیوں اور اس کے لیے ایک ٹریڈ یونین کا کام دیتا ہے۔ غیر جانبدار تحریک کے قیام سے مشترکہ بھلائی کے لیے ایک موزوں ڈھانچہ اور قواعد تیار کرنے کا عمل شروع ہوا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں قاہرہ کی دوسری چوٹی کانفرنس میں انکٹاڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو میزان کا رخ غریب اور کمزور ملکوں کی طرف موڑنے کا کام کر سکے۔ انکٹاڈ کی پہلی میٹنگ میں ۷۷ ملکوں

کا ایک گروپ (اس میں اب ۱۲۶ ملک شامل ہوگئے ہیں) قائم کیا گیا جو اقوام متحدہ میں ان نوآزاد ملکوں کے لیے مؤثر ڈھنگ سے حمایت منظم کر سکے۔ اس گروپ نے نہ صرف اقوام متحدہ کو نیا بین الاقوامی اقتصادی نظام کا اعلان نامہ منظور کرانے پر مجبور کیا بلکہ اس نے ترقی پذیر ملکوں کے درمیان بھی تعاون کو بڑھادیا ہے۔

اقوام متحدہ اور اس کی مختلف ایجنسیوں میں نوآزاد ملک برابر کے شریکوں کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ جس سے عالمی سیاست اور کثیر الملکی فورموں میں فیصلے لینے کے عمل میں ان کو تعداد کے لحاظ سے اکثریت حاصل ہوگئی جس سے اس عمل میں پہلے سے زیادہ جمہوری ڈھنگ پیدا ہوگیا۔ ترقی پذیر ملکوں کے پاس تعداد تو ہے مگر طاقت ابھی بھی ترقی یافتہ اقلیتی ملکوں کے پاس ہے کیونکہ عالمی اقتصادی نظام پر انہی ملکوں کا کنٹرول ہے۔ اس لیے جب یہ ملک اپنی اکثریت کو سوشلسٹ ملکوں کی مدد سے اقوام متحدہ یا دوسری فورموں میں اتفاق رائے حاصل کرنے کے لیے یا معاملے طے کرانے کی کارروائیوں میں استعمال کرتے ہیں تو دھڑے بندی ہوجاتی ہے اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوجاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مصالحت کے بدلے تعطل پیدا ہوجاتا ہے، موقفوں میں سختی آجاتی ہے اور تقریروں میں برہمی۔

اہم انسانی مسئلوں کی عالمی صورت اور عالمی طاقتوں کا رول

مملکتوں کی تعداد بڑھنے سے بین الاقوامی سیاست کی صورتوں اور پہلوؤں میں معیار کے لحاظ سے تبدیلی آئی ہے۔ بین الاقوامی تجارتی لین دین، ٹیکنالوجی کا تبادلہ، تعلیم اور سائنس، ہتھیاروں، گولہ بارود اور دفاعی ضرورتوں میں بے پناہ اضافہ اور نئے اتحادوں کی ضرورت اور شمال اور جنوب اور مشرق اور مغرب کے درمیان بڑھتے ہوئے رابطوں سے انسانی مسئلوں کو عالمی نوعیت حاصل ہوگئی ہے۔ دنیا میں خودمختار قوموں میں اس وقت اضافہ ہوا جب خودمختار حکومتیں متروک ہو کے رہ گئی تھیں اور سمٹی ہوئی اس دنیا میں قوموں کی حیثیت ترکیبی اجزا کی سی بن کر رہ گئی تھی اس لیے ہم اس کو "قومی بین قومی تسلسل" کا دور کہہ سکتے ہیں کیوں کہ نوآبادیت کے دور کے بعد ایک ایسی دنیا ہمارے سامنے آئی جس کو قوموں کی بین انحصاری کی دنیا کہا جاسکتا ہے اور جس میں مفادات، اقتصادی عمل، اور تجارتی لین دین میں قوموں کو ایک دوسرے پر دارومدار کرنا پڑتا ہے۔

نوآبادیت سے آزاد ہوئے ملکوں کو اپنی ترقی کے لیے جن ضروریات کا سامنا ہے ان کو پورا کرنے کے لیے انھیں ترقی یافتہ ملکوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جس سے ترقی یافتہ ملکوں پر ان کا انحصار بڑھ جاتا ہے۔ دوسری طرف صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ان سابق نوآباد ملکوں کو نوآزاد ملکوں کے وسیلوں، افرادی قوت اور

منڈیوں کی ضرورت ہے۔ نتیجہ کے طور پر بین انحصاری کو جنم ملتا ہے۔ پہلے قوموں کے درمیان تعلقات کی بنیاد اس بات پر تھی کہ ایک طرف طاقت ور تھا اور دوسری طرف اس کا دست نگر۔ لیکن اس تعلق میں اب جو تبدیلی آگئی ہے، حقیقی دنیا میں وہ عملی معنوں میں آزادی نہیں تھی، اور نہ اسے آزادی کہا جاسکتا ہے اس کا مطلب ہے بین انحصاری۔

سیاست اور سفارت کاری کو عالمی صورت حاصل ہوجانے کی کئی وجوہ ہیں:۔ (۱) ٹیکنالوجی اور سائنس کی ترقی کا عالم گیر اثر (۲) مواصلات اور ٹرانسپورٹ کے عالمی نظام میں حیرت انگیز تبدیلی۔ (۳) معاشیات اور سماجی واقتصادی پراجیکٹوں پر بین انحصاری (۴) عالمی تجارت اور کامرس میں زبردست اضافہ۔ (۵) دفاع اور سلامتی کے ڈھانچوں میں رشتۂ اتحاد (۶) مشترکہ دلچسپی کے معاملے کے سلسلے میں عالمی اور علاقائی تنظیموں کا وجود اور (۷) اقوام متحدہ کے نظام میں پھیلاؤ اور اثر۔

بین الاقوامیت کے اس دور کے آغاز کے ساتھ ہی دو بڑی طاقتوں کا ظہور بھی عمل میں آیا۔ جس سے دنیا دو دھڑوں، مشرق اور مغرب میں بٹ گئی۔ یہ دو بڑی طاقتیں ہیں امریکہ اور روس۔ ان دو ملکوں کے بڑائی اور برتری حاصل کرنے کے میلان فطری تھے۔ ان کی چوٹی کی طاقتیں بننے کی ایک وجہ بھی ہے اور استدلال بھی۔ ارضی اور معاشی اعتبار سے یہ وسیع رقبوں پر پھیلے ہوئے ہیں، آبادی بہت ہے، قدرتی وسائل کی بہتات ہے، ملکی منڈیاں بڑی ہیں اور معاشی خودکفالت اور ترقی کے فطری سامان موجود ہیں اور جہاں تک نظریات اور سیاست کا تعلق ہے تو ان دو بڑے ملکوں نے صنعتی ترقی اور تہذیبی عمل کے دو بڑے اصولوں کی قیادت کی ہے۔

امریکہ میں آزادانہ سرمایہ کاری کے نظام کو پختگی حاصل ہوگئی تھی۔ اس نے صنعتی پیداوار اور زرعی پیداوار میں توازن قائم کرکے اور یورپ کے پرانے سرمایہ دارانہ نظام میں مقابلوں کے داؤ پیچ سے دور رہ کر اپنی ترقی کی منزلیں طے کی تھیں اور اس ترقی میں اسے وسطی اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں بے پناہ وسائل کا استحصال کرنے سے مدد ملی تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی میں امریکہ ٹیکنالوجی اور صنعتی لحاظ سے سب سے بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا۔ دنیا کے ہر طرف یورپ کی کالونیاں ہونے کی وجہ سے عالمی معاملوں پر جو اس کا تسلط تھا وہ ۱۹۴۵ء تک ختم ہوگیا تھا جس سے امریکہ کو عالمی معاملوں میں اپنا رول ادا کرنے کا موقع مہیا ہوگیا اور اُس نے کسی پس وپیش کے بغیر فطری طور پر یہ قیادت سنبھالی۔ اس کے لیے اگر کسی جواز کی ضرورت تھی تو وہ دوسری عالمی جنگ کو کامیابی کے ساتھ ختم کرنے کے سلسلے میں اس کے رول نے بہم کی۔ ۱۹۴۵ء کے بعد کی دنیا پر بہت حد تک امریکہ کا غلبہ رہا ہے۔

سوویت یونین میں جس نئی تہذیب کو صورت دی جارہی ہے اس کی بنیاد ایک ایسے فلسفہ پر ہے جس

میں نجی سرمایہ کاری، منافع کی نیت، مقابلہ آرائی اور منڈیوں کی اقتصادیات کا کوئی دخل نہیں۔ اس کے سماجی و اقتصادی نظام کی بنیاد مساوات، ذرائع پیداوار پر کنٹرول اور مرکزی منصوبہ بندی، اور اس میں پیداواری ترجیحات طے کرنے میں انسانی اور انسان کی بنیادی ضروریات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ جہاں تک سماجی اور سیاسی کلچر کا تعلق ہے اس میں تعلیمی، طبی، روزگار، مکان اور شہری سہولیات مہیا کرنے کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ جس وسیع پیمانے پر اور جس تیزی سے روس نے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اور تہذیب کی پچھلی صفوں سے نکل کر سوشلسٹ طرز نظام کی اگلی صفوں میں آیا ہے اس کو ہم کامیابی کی اپنے دور کی سب سے بڑی داستان کہہ سکتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد میں مغرب میں 'ناٹو'، 'سیاٹو' اور 'سنٹو' اور بعد میں 'سینٹو' جیسے فوجی اتحاد اور مشرق میں وارسا معاہدہ ملکوں کے اتحاد سے بالترتیب امریکہ اور روس کا مرکزی رول بڑھ گیا حالانکہ اقوام متحدہ کے منشور میں چوٹی کے ان دو ملکوں سمیت پانچ ملکوں کو سلامتی کونسل میں ویٹو کا اختیار دینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بین الاقوامی برادری نے ان پانچ ملکوں کو "پانچ بڑوں" کی حیثیت میں قبول کر لیا۔ تین ملکوں، برطانیہ، فرانس اور چین کو درمیانی درجے کے اہم علاقائی طاقتوں کی حیثیت حاصل ہے۔ جب کہ امریکہ اور روس کو چوٹی کی دو عالمی طاقتوں کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے نیوکلیائی ہتھیاروں، مسلح افواج کی عالمی پہنچ، سات سمندروں میں ان کی سمندری افواج کی رسائی اور جہازوں کے ذریعہ بڑی تعداد میں ان کی فوج کا ایک سے دوسری جگہ پہنچ جانے کی صلاحیت اور 'آئی۔ سی۔ بی۔ ایم'، 'ایس۔ ایل۔ بی۔ ایم' 'ایم۔ آئی۔ آر۔ وی'، اور کروز میزائیلوں کے ہونے کی وجہ سے ان کو دنیا میں اتنی طاقت حاصل ہے جس کو فیصلہ کن کہا جا سکتا ہے۔

دوسرا صنعتی انقلاب اور ٹرانس نیشنل کارپوریشنیں

نیوکلیائی اور جیٹ انقلاب سے ہماری صنعتی معاشرے کے ارتقاء میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس کے علاوہ ٹیکنالوجی، خاص طور پر کمپیوٹر اور مواصلات میں الیکٹرانکس کے بڑھتے ہوئے استعمال سے اعلا ٹیکنالوجی کا ایک نیا دور شروع ہوا جس کو کبھی صنعتی دور کے بعد کا معاشرہ اور کبھی ٹیکنوٹرانک کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا انقلاب صرف چار دہے پہلے شروع ہوا۔ اعداد و شمار والا الیکٹرانک کمپیوٹر امریکہ میں دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر تیار کیا گیا۔ مگر اب کمپیوٹر انقلاب سے ترقی یافتہ ملکوں میں لوگوں کی گھریلو زندگی بھی پرائیویٹ نہیں رہی ہے اور چونکہ زرعی اور صنعتی پیداوار کے لیے کم لوگوں کی ضرورت رہ گئی ہے اس لیے روزگار کے مواقع ثانوی درجے کے سیکٹر سے تیسرے درجے کے سیکٹر میں

ایلون ٹوفلر نے اپنی کتاب 'تھرڈ ویو' میں اکیسویں صدی کی دنیا کی تصویر کشی ہے کی جب کمپیوٹر کے

انقلاب سے کئی وہ بنیادی تبدیلیاں متروک ہو جائیں گی جو صنعتی انقلاب سے آئی تھیں اور جو پچھلے دو برسوں میں رائج رہی ہیں۔

کمپیوٹر انقلاب اپنے مائیکرو پروسیسر سے درجنوں نئی صنعتوں کے وجود میں آنے میں مدد مل جائے گی۔ اس انقلاب نے انسانی سرگرمی کے بہت سے شعبوں کو اپنے دائرۂ اثر میں لیا ہے جن میں مواصلات اور ابلاغ، تعلیم، تجارتی نظام، اکوئنٹس، تجارت اور کمرشیل لین دین، بنک کاری، زرعی اطلاعات، حکومتوں اور کارپوریشنوں کے کام، آئیرونانٹکس، خلائی تحقیق، میزائل سسٹم اور ہتھیاروں کے جدید سسٹم قابل ذکر ہیں۔ مائیکرو کمپیوٹر صحت کی پرداخت کے پروگراموں اور طبی سائنس میں مدد دے رہا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کو کمپیوٹروں سے ایک طرف، پہلے صنعتی انقلاب کے عمل سے گزرنے کی ضرورت نہیں رہے گی مگر دوسری طرف اس سے لازمی طور پر امیروں اور غریبوں کے درمیان فرق بڑھ جائے گا جس سے سربراہی کی بنیاد پر انصاف مہیا کرنے کا عمل التوا میں پڑ جائے گا۔

اسی دور میں، جس کو ٹیکنوٹرانک زمانہ کہا جاتا ہے۔ کثیر قومی کارپوریشنیں" انسانی تاریخ میں ایک ایسے پہلے ادارے کی" صورت میں ابھر کر سامنے آئی ہیں جو پوری دنیا میں اقتصادی سرگرمیوں کو اس طرح سے منظم اور مربوط کرتی ہیں کہ ان عالمی کارپوریشنوں کے لیے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جائے۔ یہ کارپوریشنیں ایک ایسا تنظیمی انقلاب لا رہی ہیں جس کے اثرات جدید انسان پر اتنے ہی گہرے ہوں گے جتنے صنعتی انقلاب یا قومی مملکتوں کے نمودار ہونے کے۔ یہ کارپوریشنیں معاشی زندگی کے تین بنیادی وسیلوں پر اپنے کنٹرول کے ذریعہ دنیا کی سیاسی معیشت میں زبردست تبدیلی لا رہی ہیں۔ یہ تین وسیلے ہیں۔ پیداواری ٹیکنالوجی، بنیادی سرمایہ کی رقوم اور مارکٹنگ۔ عالمی پیمانے پر سرمایہ کاری سے ان کارپوریشنوں کے منتظم ملکی نظاموں کو تبدیل کرنا چاہیے جن کی بنیاد ہر صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں میں چار سو سال سے زائد معاشرے کی تنظیم و تربیت کی گئی ہے اور نو آزاد ملکوں میں چالیس اور پچاس سال کی مدت سے۔

ان کارپوریشنوں کا سائز طاقت کا ایک ترکیبی جز ہے۔ جہاں تک لیڈروں، سرکاروں اور پالیسی وضع کرنے والے اداروں پر ان کے اثر و رسوخ کا تعلق ہے اس کا صحیح حساب لگانا مشکل ہے لیکن اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ اس غیر مساوی دنیا میں ان کے رول کو مختلف صورتوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹیکنوٹرانک ملکوں میں جن کو ان کارپوریشنوں سے فائدہ ملتا ہے اور جو ان کے "وطن" ہیں۔ ان کو ہینری کسنجر کے کہنے کے مطابق "ترقی کے مؤثر انجنوں کی صورت میں دیکھا جاتا ہے۔" مگر بحث طلب سوال ہے کہ کس کی ترقی؟ جہاں تک ترقی پذیر ملکوں کا تعلق ہے، جن کو ابھی

بیرونی صنعتی اور مالی سرمایہ سے آزادی نہیں ملی ہے۔ ان میں ان کارپوریشنوں کا رول وہی ہے جس کو "گلوبل ریچ" کتاب کے ساتھی مصنف نے "تیسری دنیا کی ترقی کی ایک بہت بڑی رکاوٹ کہا ہے۔"

لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ملکوں کی معاشیات کے بہت بڑے حصوں پر ان کارپوریشنوں کا کنٹرول ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۳ء میں یہ رپورٹ ملی تھی کہ میکسیکو میں ۷۸ فی صد پیداوار ان ٹرانس نیشنل کارپوریشنوں کے کنٹرول کے تحت ہیں جن کے صدر مقام امریکہ میں ہیں۔ اسی طرح برازیل میں تمام صنعتی برآمدات کا ۴۷ فی صد اور صنعتی پیداوار کا ۱۱ فی صد حصہ ان کے کنٹرول کے تحت ہے۔ نائجیریا میں تمام صنعتی سرمایہ کاری کا ۶۵ فی صد بدیشی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اطلاع کے مطابق ترقی پذیر ملکوں کی صنعتی پیداوار کا ۴۰ فی صد ان کارپوریشنوں کے کنٹرول میں ہے اور جہاں تک بیرونی تجارت کا تعلق ہے تو کنٹرول کی حد ۵۰ فی صد سے ۹۵ تک کی ہے۔ مثلاً چینی اور فاسفیٹ میں ۵۰ سے ۶۰ فی صد تک ربڑ اور خام تیل میں ۷۰ سے ۷۵ فی صد، ٹین میں ۷۵ سے ۸۰ فی صد، چائے، کافی، تمباکو، گیہوں، کپاس، پٹ سن، لکڑی اور تانبا میں ۸۵ سے ۹۰ فی صد، معدنی لوہے اور بکسایئٹ میں ۹۰ سے ۹۵ فی صد تک۔

تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی ہزار کوششوں کے باوجود تیل صاف کرنے اور مغربی یورپ اور جاپان میں اس کی مارکیٹنگ کا پچاس فی صد کام ابھی بھی ان سات کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے جو "سات بہنوں" کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مالی وسائل، ٹیکنالوجی کی جانکاری اور مارکٹنگ میں ان کی پوزیشن ناقابل تسخیر ہے۔

ستر کی دہائی کے اختتام کے تخمینوں کے مطابق دنیا میں گیارہ ہزار ٹرانس نیشنل کارپوریشنیں کام کر رہی تھیں جن کے تابع بیاسی ہزار بدیشی شاخیں تھیں۔ ۱۹۷۶ء میں ان کی پیداوار کا تخمینہ ۸۳۰ بلین ڈالر تھا۔ ۱۹۸۱ء میں ایسی سب سے بڑی دس کارپوریشنوں، جن میں آٹھ امریکی ہیں، کی بکری اور خالص منافع بالترتیب ۵۶۸.۹ بلین اور ۲۲.۹۹ بلین ڈالر تھا۔ اس میں ۷۶ فی صد بکری اور ۷۵ فی صد منافع امریکی کارپوریشنوں کا تھا۔" کلب آف روم کی طرف سے ٹن برجن رپورٹ نے ان تخمینہ جات کی تصدیق کی ہے کہ یہ کارپوریشنیں ہر سال ترقی پذیر ملکوں میں سے ۵۰ سے ۱۰۰ بلین ڈالر رقم لے جانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے دوران میں امریکی کارپوریشنوں نے اپنے منافع کی منتقلی دو عشاریہ تین بلین سے پانچ عشاریہ پانچ بلین ڈالروں تک بڑھا دی۔ ۱۹۶۷-۶۵ء کے دوران میں ترقی پذیر ملکوں کا بدیشی سکے کا نقصان چھ گنا بڑھ گیا اور یہ اٹھارہ

عشاره پانچ بلین ڈالروں تک پہنچ گیا۔

اصل سرمایہ کے لیے براہ راست طور رقوم لگانا ان بنیادی ترکیبوں میں سے ایک ہے جس سے عالمی پیمانے پر ان کارپوریشنوں کے مسلسل پھیلاؤ میں مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں ٹیکنالوجی اور ٹیکنالوجی کو ترقی پذیر ملکوں میں منتقل کرنے پر ان کو اجارہ داری حاصل ہے جس کی وجہ سے ترقی پذیر ملکوں کو سرمایہ دار ملکوں کا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔ ۷۸-۱۹۷۰ء کے دوران میں ترقی پذیر ملکوں میں ان کارپوریشنوں کی براہ راست سرمایہ کاری بیالیس عشاریہ دو بلین ڈالر تھی۔ اس مدت کے دوران انھوں نے ایک سو عشاریہ دو بلین ڈالروں کا منافع حاصل کیا یعنی ہر ایک ڈالر کے سرمایہ عوض انھوں نے دو عشاریہ چار ڈالر لیے۔ امریکہ کی ایسی کارپوریشنوں کا منافع کا تھوڑا زیادہ منافع رہا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں انھوں نے آٹھ عشاریہ سات بلین ڈالر کا سرمایہ لگایا تھا اور انھوں نے اُنتالیس عشاریہ سات بلین ڈالر واپس لیے یعنی ہر ایک ڈالر کے سرمایہ کے بدلے چار عشاریہ پانچ ڈالر۔ پاکستان کی منصوبہ بندی کے موجودہ وزیر ڈاکٹر محبوب الحق جن دنوں عالمی بینک کے ڈائرکٹر تھے انھوں نے لکھا تھا "ترقی پذیر ممالک غریب کے غریب رہتے ہیں۔۔۔۔ ان کو اپنے خام مال کی برآمد سے تیس بلین ڈالر مل جاتے ہیں جب کہ گاہک دو سو ڈالر ادا کرتے ہیں۔ ایک سوستر بلین ڈالر جو زیادہ آجاتے ہیں وہ کون لیتا ہے؟ وہ جو اس خام مال کی درجہ بندی کرتے ہیں، اس کو تقسیم کرتے ہیں اور سمندری جہازوں میں لاد کر لے جاتے ہیں اور جو ان سے بنی ہوئی چیزوں کی تشہیر کرتے ہیں وغیرہ" اسی نتیجے پر ۱۹۷۸ء میں یونائیٹڈ بھی پہنچی تھی اور عالمی بنک بھی۔ عالمی بنک کے "سیکنڈ ورلڈ ڈیولپمینٹ رپورٹ" جو ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے۔

برٹین ووڈس گاٹ کی طرف سے جو مالی اور مالیاتی ادارے قائم کیے گئے ان کا مقصد ترقی یافتہ میٹروپالیٹن ملکوں کو دوسری جنگ عظیم کی تباہی سے بحال ہونے میں مدد کرنا اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں استوار کرنا تھا۔ ایسے تین بڑے ادارون ۔ عالمی بنک (عالمی بنک برائے تعمیر نو و ترقی) بین الاقوامی مالی فنڈ اور گاٹ (تجارت اور محصول سے متعلق عام سمجھوتہ) پر امریکہ اور ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کا کنٹرول ہے جن کو دو تہائی اکثریت کے ووٹوں کا امتیازی حق حاصل ہے جس سے مالیاتی اور سرمایہ کاری کے ایک بڑے عالمی نظام پر ان کی بالادستی یقینی بن جاتی ہے۔ ۱۹۷۱ء سے بین الاقوامی مالیاتی نظام میں عام عدم استحکام، شرح تبادلہ میں اتار چڑھاؤ اور ترقی یافتہ ملکوں میں افراط زر کے حالات نے تیسری دنیا کی برآمدی اشیا کی قدر و قیمت کے امکانات پر ناموافق اثر ڈالا۔ اس لیے تیسری دنیا کے ملک اس

بات کو برا مانتے ہیں کہ ان کو عالمی بنک اور بین الاقوامی مالی فنڈ کے فیصلہ لینے کی کارروائی میں کوئی دخل نہیں۔ ایک طرف ٹرانس نیشنل کارپوریشنیں اور دوسری طرف سرمایہ کی منتقلی پر ترقی یافتہ ملکوں کا کنٹرول۔ اس سے عالمی معیشت پر ان کا اثر بڑھ جاتا ہے اور تیسری دنیا کی ترقی کے امکانات میں سنگین رکاوٹ آجاتی ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ترقی کے پہلے دہے کے آغاز پر، سنہ ۱۹۷۰ء میں ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں ممبروں سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی قومی آمدنی کا صفر اعشاریہ سات فی صد حصہ ترقیاتی امداد کے طور پر دیا کریں۔ مگر پندرہ سال گزرنے کے بعد بھی دولت مند ملکوں کی یہ امداد صفر اعشاریہ تین چھ فی صد سے زیادہ نہیں رہی ہے۔ یعنی نشانے سے نصف۔

نتیجہ کے طور پر تیسری دنیا کے ملکوں پر بین الاقوامی بنکوں اور مغربی ملکوں کی حکومتوں کا قرضہ سنہ ۱۹۸۴ء میں ۸۶۷ بلین ڈالر کی رقم تک پہنچ گئی (اس رقم میں سے کمرشیل بنکوں کا قرضہ ۴۱۲ بلین ڈالر ہے) جو تقریباً امریکہ کے سالانہ بجٹ کے برابر ہے۔ ۱۹۸۰ء میں قرضہ کی یہ رقم ۴۷۵ بلین ڈالر تھی۔ جب کہ سنہ ۱۹۷۱ء میں یہ رقم صرف ایک سو بلین ڈالر تھی۔ سنہ ۱۹۷۹ء میں ترقی پذیر ملکوں نے تیس بلین ڈالر سود کے طور پر اور ۴۱ بلین ڈالر اصل زر کے طور پر ادا کیے۔ انکٹاڈ کے سنہ ۱۹۷۹ کے تخمینہ کے مطابق ترقی پذیر ملکوں کی برآمدات کی کمائی کا چوتھا حصہ قرضوں کی ادائیگی میں صرف ہو جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۸۲ء میں قرضوں کا بل ۱۲۰ بلین ڈالر تھا اور سنہ ۱۹۸۴ء میں تقریباً ۱۴۰ بلین ڈالر۔ سود کی اوسط شرح سنہ ۱۹۷۵ء میں سات فی صد سے بڑھ کر سنہ ۱۹۸۰ء میں بارہ فی صد ہو گئی۔ مئی سنہ ۱۹۸۴ء میں امریکی بنکوں نے سود کی ابتدائی شرح کو ساڑھے بارہ فی صد تک بڑھا دیا۔ قرضوں کی ادائیگی کی نئی ترتیب سے متعلق پچھلے سال کی باتوں کے دوران بین الاقوامی مالی فنڈ نے اپنے جائزہ میں کہا کہ بنکوں کی شرح پر "ایک فی صد" کے اضافہ سے تیسری دنیا کی قرضوں کی مجموعی ادائیگی میں چار بلین، ڈالروں کا اضافہ ہوگا۔ مالی فنڈ کی رپورٹ کے مطابق سنہ ۱۹۸۱ء میں ۳۲ ملک قرضوں کی ادائیگی کے قسطوں میں پیچھے تھے جب کہ سنہ ۱۹۷۵ء میں ایسے ملکوں کی تعداد ۱۵ تھی۔ سنہ ۱۹۸۲ء میں بائیس ملکوں نے کہا کہ وہ قرضوں کی قسطیں ادا کرنے کے قابل ہی نہیں اور درخواست کی کہ ان کو نئے سرے سے ترتیب دی جائے۔ لاطینی امریکہ قرضوں میں ڈوب گیا ہے۔ اس پر ۳۵۰ بلین ڈالروں کا قرضہ ہے۔ ارجن ٹینا، برازیل اور میکسیکو بھی قرضوں کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں۔

قرضوں کا یہ بحران بنیادی طور پر چار ملکوں، امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی اور جاپان۔ اور دس امریکی بنکوں اور فیڈرل ریزرو کا مسئلہ ہے۔ قرضوں کے اس بم کا خطرہ الٹا میٹروپالیٹن ملکوں کی معاشیات کو بھی اپنے دائرے میں لے سکتا ہے

نوآزاد ملکوں کی ترقی کی بنیادی ضروریات میں ٹیکنالوجی کی منتقلی، قرضوں اور امداد کی دستیابی توانائی کی کافی سپلائی اور تجارت کی موافق شرائط شامل ہیں لیکن یہی وہ شعبے ہیں جہاں سرمایہ دارانہ معیشت اس کا نظام اور اس کے قواعد ان مفادات اور ضرورتوں کے خلاف کام کرتے ہیں جن سے ترقی پذیر ملکوں کی معاشی نوآبادیت سے نجات ملتی۔ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے اس مثلث کو جو ٹرانس نیشنل کارپوریشنوں (جو نجی سرمایہ کی نمائندہ ہیں) سرکاری ایجنسیوں (جو ترقی یافتہ ملکوں کے سٹیٹ سیکٹر کی نمائندگی کرتی ہیں) اور بین اقوامی مالی فنڈ اور عالمی بنک (جو عالمی اداروں کے نمائندے ہیں) پر مشتمل ہے۔ سرمایہ کاری، ٹیکنالوجی، توانائی، قیمتوں اور سود کی شرحوں کے اعتبار سے ہم عصر عالمی معیشت پر فیصلہ کن کنٹرول حاصل ہے۔ اس لیے ترقی پذیر ملکوں میں اِن کو جدید نوآبادیت کے ایک قسم کے کنسورشیم کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں ایسے ڈھانچوں کی حیثیت حاصل ہے جن سے عالمی نابرابری کو قوت حاصل ہو رہی ہے۔

(۲)
عالمی پس منظر
تحفظ کے پہلو

ہتھیاروں کے ذخیرے

نیوکلیائی توانائی کی دریافت کے نتائج پر غور و فکر کرتے ہوئے البرٹ آئنس ٹائین نے کہا "ایٹم کی بے قابو طاقت نے ہر چیز بدل دی ہے۔ ماسوا ہمارا اندازِ فکر۔" ہمارے عہد کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ جن مفروضات کی بنا پر بیشتر بااثر ملکوں کے لیڈروں کی طرف سے مختلف معاملوں پر فیصلے لیے جاتے ہیں، خواہ وہ جنگ کے معاملے ہوں یا امن کے، تعاون کے یا ٹکراؤ کے، مصالحت یا ہتھیاروں کی دوڑ کے، وہ مفروضات اگر متروک نہیں، غلط ضرور ہیں۔ آلوا مرڈال کا کہنا ہے "ہتھیاروں کی دوڑ کو جو چیز ایک عالمی حماقت بناتی ہے وہ یہ ہے کہ سب ممالک زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر زیادہ سے زیادہ عدم تحفظ خرید رہے ہیں۔" (رابرٹ

اوپین ہائی مر کو زندگی کے آخری دنوں میں جب اس تکلیف دہ احساس نے افسردہ کر دیا کہ من ہاٹن پراجیکٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ایٹم بم بنانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری اُنہی پر عائد ہوتی ہے، تو انھوں نے اطلاع کے مطابق کہا "کہ وقت گزرنے کے ساتھ ایٹم کے اس زمانے کو انسانی زندگی کا ایک ایسا مرحلہ مانا جائے گا جو عبوری تھا، خطرناک اور ذلت آمیز تھا۔ یا تو ایسا ہی سمجھا جائے گا، ورنہ فیصلہ دینے کے لیے کوئی موجود نہیں ہوگا۔"

آج کی دنیا ضرورت سے زیادہ حد تک مسلح ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں خوفناک حد تک ہتھیاروں کی بہتات ہے اور خطرناک حد تک غذا کی کمی۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو عجیب و غریب تو محسوس ہو سکتی ہے لیکن ہے صحیح اور ہماری دنیا کی ایک اہم حقیقت۔ اعداد و شمار پر نظر ڈال کر ہم اس حقیقت کے کچھ حصے کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ۵۰ ہزار نیوکلیائی بم موجود ہیں جن کی تباہی کی طاقت دس لاکھ ہیروشیما بموں کے برابر ہے۔ تقریباً پانچ کروڑ لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر فوجی سرگرمیوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان میں ڈھائی کروڑ افراد باقاعدہ فوج میں ہیں، چالیس لاکھ دفاعی محکموں میں غیر فوجی کام کرتے ہیں۔ تقریباً پچاس لاکھ افراد براہ راست طور پر اسلحہ سازی اور دوسرا فوجی ساز و سامان تیار کرنے کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور پانچ لاکھ سائنس داں اور انجینیر فوجی مقاصد کے تحقیق و ترقی کے کام میں مصروف ہیں۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ بیس فی صد سائنس داں اور انجینیر ہتھیار سازی کی صنعتوں اور فوجی نوعیت کے کاموں میں لگے ہیں)۔

عالمی فوجی اخراجات میں ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اخراجات ان رقموں سے تقریباً بیس گنا زیادہ ہیں جو او ای سی ڈی ملکوں کی طرف سے ترقی پذیر ملکوں کو ترقیاتی امداد کے طور پر دی جا رہی ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں فوجی اخراجات کی رقم پانچ سو بلین ڈالر تھی یعنی دوسری جنگ عظیم کے بعد کی مدت کے مقابلے میں چار گنا زیادہ اور اس صدی کے آغاز کے مقابلے میں بیس گنا زیادہ۔ ۱۹۸۳ء میں یہ خرچہ ۶۶۰ بلین ڈالر اور ۱۹۸۴ء میں ۸۰۰ بلین ڈالر تک پہنچ گیا۔ ۱۹۸۳ء میں حساب لگا کر یہ معلوم ہوا کہ عالمی فوجی بجٹ پر خزانہ عامرہ سے فی منٹ تیرہ لاکھ ڈالر کی رقم خرچ کی جاتی ہے۔ پچھلے چھتیس برسوں میں دنیا کی مجموعی پیداوار کا پانچ سے آٹھ فی صد حصہ فوج کے لیے مخصوص کیا گیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر یہ عمل روکا نہیں گیا یا اس کا رخ واپس موڑا نہیں گیا تو ۲۰۰۰ء میں ۱۹۸۰ء کی قیمتوں کی بنیاد پر عالمی فوجی بل ۹۴۰ بلین ڈالر کا ہو سکتا ہے۔ امریکہ کے پچھلے پانچ برسوں (۸۵-۱۹۸۱ء) کے فوجی بجٹ میں، ۱۰۵۱۰۷ بلین ڈالر کے اخراجات کا نشانہ تھا۔ اور آئندہ تین برسوں کے لیے اس میں ۱۰۳۸ بلین ڈالر کا اضافہ کیا جانا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ نو برسوں میں اس میں ۱۶۰ فی صد کا

اضافہ ہوگا۔ (۱۹۸۱ء میں ۲ء۴۲۲ بلین سے ۱۹۸۸ء میں ۳۷۷ بلین ڈالر تک)۔

اقوامِ متحدہ کی کمیٹی کے ایک تخمینہ کے مطابق ۱۹۸۰ء میں فوجی تحقیق و ترقی (آر اینڈ ڈی) پر ۳۵ بلین ڈالر کی رقم خرچ کی گئی۔ جو فوجی تحقیق و ترقی کے مجموعی کام کے اخراجات کا چوتھا حصّہ ہے۔

اسلحہ جات کی عالمی تجارت اور ہتھیاروں کی منتقلی

سپری کے "تیسری دنیا کے ملکوں کے ساتھ اسلحہ جات کی تجارت" نام کے ایک جائزہ میں کہا گیا ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں کے ساتھ اسلحہ کی تجارت کو بین الاقوامی تعلقات کے مرکب جال میں صرف ایک جز کی حیثیت حاصل ہے۔ اقتصادی امداد، صنعتی سرمایہ کاری، فوجی اعتبار سے اہم اور دوسرے سامان کی تجارت اور فوجی مداخلت اس کے دوسرے اجزا ہیں۔ اسلحہ جات کے سسٹموں کی پیچیدگی اور ان پر اخراجات کی زیادتی کے پیشِ نظر اِن کی تیاری اور پیداوار کا کام صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ چند ملکوں کے ہاتھ میں رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے اہم ہتھیاروں کی ۸۹ سے ۹۶ فی صد سپلائی صرف چار ملکوں سے ہوتی رہی ہے۔ یہ ملک ہیں امریکہ، روس، فرانس اور برطانیہ۔ مغربی جرمنی، جاپان، کناڈا، اٹلی، سویڈن، سوئزرلینڈ اور چین نے محدود پیمانے پر ہتھیار فراہم کیے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی ایک دستاویز میں کہا گیا ہے کہ اسلحہ جات کی تجارت کے بارے میں تجارت کے عالمی اعداد و شمار میں کوئی سرکاری اندراجات نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی اعداد و شمار کے بارے میں سرکاری طور پر کوئی مفصل رپورٹ دستیاب نہیں ہے۔" تاہم اندازہ یہ ہے کہ بین الاقوامی پیمانے پر ہر سال اسلحہ کی ۲۶ بلین ڈالروں کی مالیت کی تجارت ہوتی ہے۔ اسلحہ کی لین دین میں بڑے پیمانے پر تربیتی پروگرام بھی شامل ہیں جن پر ہتھیاروں کی تجارت کی مالیت کا پندرہ فی صد حصہ خرچ ہوتا ہے۔

"تیسری دنیا میں ہتھیاروں کے ذخیرے کرنے کے سلسلے میں بنیادی طور پر بڑی طاقتوں کے درمیان اور ان کے اتحادیوں کے درمیان طاقت اور اثر و رسوخ حاصل کرنے کی کشمکش اہم اور دوررس نتائج کی حامل رہی ہے۔" ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک ہتھیاروں کی سپلائی کا طریقہ یہ رہا ہے: ایشیا کے لیے ۷۵ فی صد (ان میں مغربی ایشیا کے لیے ۳۰ فی صد، مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا کے لیے ۳۰ فی صد، اور جنوبی ایشیا کے لیے ۱۵ فی صد) باقی افریقہ اور لاطینی امریکہ وغیرہ کے لیے۔ ۱۹۸۰-۸۴ء میں اس طریقہ میں تبدیلی آئی۔ ایشیا کو ۶۶ء۷ فی صد ہتھیار حاصل ہوئے (اس میں مغربی ایشیا کے لیے اضافہ یعنی ۴۴ء۷ فی صد اور مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا کے لیے کمی یعنی ۱۳ء۲ فی صد اور جنوبی ایشیا کے لیے بالکل نصف یعنی ۸-۸ فی صد) افریقہ کو ۲۲ء۳ فی صد اور لاطینی امریکہ کو ۱۰ء۷ فی صد

ہتھیار حاصل ہوئے۔ سنہ ۱۹۸۴ء میں تیسری دنیا کے لیے ہتھیاروں کی ۴ر۹۶ فی صد سپلائی چھ ترقی یافتہ ملکوں سے ہوئی۔ ناٹو، اتحاد کے پانچ ملکوں سے ۹ر۵۲ فی صد اور روس سے ۹ر۳۴ فی صد ۔ 'ناٹو' ملکوں میں سے امریکہ کا حصہ ۷ر۳۱ فی صد ہے۔ فرانس کا ۲ر۱۱ فی صد، برطانیہ کا ۹ر۴ فی صد، اٹلی کا ۵ر۳ فی صد اور مغربی جرمنی کا حصّہ ۶ر۲ فی صد ہے۔

امریکہ میں ملیٹری انڈسٹریل کمپلیکس

ہتھیاروں کی اس تجارت میں ایم آئی سی (ملیٹری انڈسٹریل کمپلیکس) جسے اب ملیٹری انڈسٹریل بیوروکریٹک کمپلیکس بھی کہا جاتا ہے، کا رول اہم رہا ہے۔ یہ آئزن ہاور تھے (جو یورپ میں اتحادی فوجوں کی سپریم کمانڈر رہ چکے تھے اور بعد میں امریکہ کے صدر بنے) جنھوں نے سنہ ۱۹۶۱ء میں وائٹ ہاؤس کی اپنی الوداعی تقریر میں یہ بات صاف صاف کہہ کر ہر کسی کو حیران کر دیا "فوجی سررشتہ اور ہتھیاروں کی بہت بڑی انڈسٹری کو ایک ساتھ ملانا امریکہ کے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔ ... ہمیں اس کے سنگین نتائج کا ادراک کرنے میں ناکام نہیں ہونا چاہیے، اور ہمیں چوکس رہنا چاہیے کہ کہیں یہ بے جا اثر اور طاقت حاصل نہ کرے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب ہتھیاروں کی انڈسٹری میں ٹرانس نیشنل کارپوریشنوں اور محکمہ دفاع نے اپنی ساجھے داری بڑھادی۔ پروفیسر جے کے گال بریتھ پچھلے بیس برسوں سے مسلسل طور پر ایم آئی سی کی نکتہ چینی کرتے رہے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے پھر اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی جس کو وہ امریکہ میں "فوجی طاقت" کہتے ہیں۔ انھوں نے لکھا:۔

" ہمیں امریکی محکمہ دفاع پر پھر سے موثر غیر فوجی کنٹرول پر زور دینا چاہیے۔ یہ ہمارا سب سے پرانا سررشتہ ہے۔ موجودہ فوجی کنٹرول تو غیر فوجی اختیارات کے پورے تصور کی تضحیک ہے" دو دہے پہلے بھی انھوں نے یہ کہہ کر اس پر واویلا کی تھی "کہ ہتھیار بند فوج یا ہتھیاروں سے متعلق ادارے پہلے فیصلے لیتے ہیں اور پھر کانگریس اور عوام کو اپنے فیصلوں سے بس مطلع کرتے ہیں .... فوج نے تو ہمارے آئین کے اصولوں کا رخ پلٹ دیا ہے۔ اس نے عوام اور کانگریس سے اختیارات چھین لیے ہیں اور پینٹاگن کو دیے ہیں۔"

پینٹاگن کے پاس رپورٹوں کے مطابق، امریکہ کی بڑی بڑی ۹۵ انڈسٹریل فرموں کے مقابلہ میں زیادہ اثاثہ ہے۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں یہ اثاثے ۲۰۰ بلین ڈالر کے تھے۔ اس کی طرف سے ہر سال ایک لاکھ بیس ہزار سپلائروں کے ساتھ دو لاکھ ٹھیکوں پر دستخط کیے جاتے ہیں۔ محکمہ بنیادی فوجی ٹھیکوں کی کل مالیت میں امریکہ

کی سب سے بڑی منوٰ کار پوریشنوں کا حصہ فی صد کے حساب سے ۱۹۷۰ء میں ۷ء ۶۹ فی صد، ۱۹۷۵ء میں ۳ء ۶۶ فی صد اور ۱۹۷۹ء میں ۲ء ۷۱ فی صد رہا ہے۔ بیس لاکھ فوجی اور دس لاکھ غیر فوجی پنٹاگن کے ملازم ہیں۔ یہ ۴۳ ملکوں کو اسلحہ سپلائی کرتا ہے، اور ۶۸ ملکوں کے دس ہزار فوجی عملہ کو ہر سال تربیت دیتا ہے۔ امریکہ میں منافع بخش روزگار کمانے والوں میں ۱۱ فی صد ایم آئی سی سے تعلق رکھتے ہیں۔ امریکہ میں ہوائی جہازوں اور میزائیل صنعتوں کی ۹۰ فی صد پیداوار، جہاز سازی کی ۶۰ فی صد، اور مواصلاتی ٹیکنالوجی کی ۴۰ فی صد پیداوار فوجی مقاصد کے لیے ہے۔ مجموعی طور پر امریکی اقتصادی سرگرمیوں کے لیے ۲۵ سے ۳۰ فی صد حصے کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے فوجی مقاصد کے ساتھ ہے۔

امریکہ اور روس: اسلحہ کی تجارت اور منتقلی اور باہمی ادراک

رسپری نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۵ء تک کے پچیس برسوں کی مدت کے دوران ہتھیاروں کی فراہمی کا جائزہ لینے کے بعد اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے " امریکہ دنیا میں فوجی ساز و سامان فراہم کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔ اور اس کی اسلحہ کی تجارت، دنیا کی اسلحہ کی کُل تجارت کے نصف کے برابر ہے..... تاہم ۱۹۷۹-۸۱ء کے دوران میں بڑے ہتھیار برآمد کرنے میں روس، امریکہ سے آگے نکل گیا۔" اگرچہ اس کے خریدار ابھی امریکہ (۶۷) سے کم ہیں (۲۸)۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکہ کی مجموعی دفاعی پیداوار کا پانچ فی صد سے زیادہ برآمد نہیں ہوتا ہے جس میں نصف سے زیادہ پیداوار یورپ اور مشرقی ایشیا میں اس کے اتحادیوں کو فراہم کی جاتی ہے تاکہ مغربی ملکوں کے اتحاد کی اس پالیسی پر عمل ہو جس کو "کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے " کی پالیسی کہا جاتا تھا۔ دنیا میں ایک امیر ترین اور فوجی اعتبار سے مضبوط ملک کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آنے کے بعد امریکہ نے اپنے فوجی اخراجات میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں امریکہ کا فی کس فوجی خرچہ ۸۵۵ ڈالر تھا جب کہ یکساں قیمتوں کی بنیاد پر ۱۹۳۹ء میں یہ خرچہ ۷۵ ڈالر تھا۔

چونکہ امریکی انتظامیہ میں ایک ہی جگہ مربوط طریقے سے فیصلے نہیں لیے جاتے ہیں۔ بلکہ اس کی اقتصادی امداد کے پروگراموں اور فوجی امداد کے پروگراموں کے فیصلے مختلف طریقوں سے لیے جاتے ہیں۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے امدادی نوعیت کا کام کرتے ہیں۔ جیسا کہ سپری کی رپورٹ میں کہا گیا ہے:

" اس بات کی اہمیت ابتدائی مرحلوں ہی میں محسوس کی گئی کہ اقتصادی امداد، کمیونزم کو روکنے کے لیے دی جانے والی فوجی امداد کے متبادل کے طور پر بھی اور اس کو زیادہ مؤثر بنانے کا رول ادا کر سکتی ہے۔" ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۱ء کے درمیان اقتصادی امداد اوسطاً ایک بلین ڈالر سالانہ

تک پہنچ گئی۔ اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ۱۹۵۹ء کے باہمی سلامتی کے قانون کو، جس کے تحت ہتھیاروں کی فروخت اور منتقلی کے اختیارات حاصل ہو جاتے تھے، بدل کر بیرونی امداد کا نیا قانون بنایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں کے وزیر دفاع رابرٹ میکنمارا کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ انقلاب کی وجہ غربت ہوتی ہے، اور وہ چاہتے تھے کہ امریکہ کو بھاری اقتصادی امداد دے کر تیسری دنیا کے ملکوں میں دوستی قائم کرنی چاہیے اور لوگوں میں اپنا اثر۔

اسلحہ کی تجارت اور منتقلی کے اکھاڑے میں داخل ہونے میں روس امریکہ سے دس سال پیچھے رہا۔ روس نے ہتھیار فراہم کرنے کا کام پچاس کی دہائی کے اختتام اور ساٹھ کی دہائی کے آغاز پر شروع کیا۔ پہلے ۱۹۵۵ء میں مصر کو ہتھیار فراہم کیے گئے۔ پھر ۱۹۵۶ء میں افغانستان کو۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں عراق کو، ۱۹۵۹ء میں شام کو، بعد میں ۱۹۵۹ء ہی میں انڈونیشیا کو، ۱۹۶۰ء میں برما کو اور ۱۹۶۰ء ہی میں ہندوستان کو، "کسی سوشلسٹ ملک اور تیسری دنیا کے ملک کے درمیان ہتھیاروں کا پہلا سودا ۱۹۵۵ء میں انجام پایا۔ یہ سودا چیکوسلواکیہ، جو روس کے کہنے پر عمل کر رہا تھا، اور مصر کے درمیان ہوا۔ ۱۹۵۵ء کے آس پاس جب روس نے ایک بار یہ فیصلہ کر لیا کہ ترقی پذیر ملکوں کی طرف سے اس کی پالیسی کو ایک نئی سمت دی جانی چاہیے۔ تو ان کے تئیں اسلحہ کی تجارت کی پالیسی کو بھی رفتہ رفتہ فروغ ملنے لگا۔ ۱۹۷۲ء میں روس کی طرف سے بیس ملکوں کو اسلحہ حاصل ہو رہے تھے۔

اسلحہ جات فراہم کرنے کی روسی پالیسی کے بنیادی طور پر سیاسی مقاصد ہیں۔ اقتصادی مقاصد کو ثانوی درجہ حاصل ہے۔" زیادہ تعداد میں روسی ہتھیار حاصل کرنے والے ملکوں کو یہ ہتھیار یا تو فوجی امداد کے طور پر دی گئی، ورنہ وہ ان کی قیمت ادا کرنے کے قابل ہی نہیں بن پائے۔" اسلحہ جات سے متعلق روسی پالیسی کا مقصد غیر جانبدار تحریک آزادی کی تحریکوں اور ان ملکوں کی مدد کرنا ہے جو سیٹو اور سینٹو جیسی مغربی اتحادی تنظیموں سے چھٹکارا پانا چاہتے ہوں۔ جہاں تک مصر، افغانستان اور ہندوستان کا تعلق ہے۔ روس نے پچھلے دو دہوں کے دوران میں مسلسل طور پر ان ملکوں کی اقتصادی ترقی کے لیے بڑے پیمانہ پر سرمایہ بھی لگایا اور ان کے ساتھ تجارت اور کمرشیل رابطے بھی بڑھا دیے (اب مصر اس زمرے میں شامل نہیں) ہندستان کے ساتھ اگرچہ اسلحہ کی فراہمی سے متعلق پہلے سمجھوتے پر ۱۹۶۰ء میں دستخط ہوئے مگر اس کی اہمیت روسیوں کی ابتدائی پس و پیش کے بعد، ۱۹۶۲ء کی ہندوستان اور چین کی جنگ کے بعد ہی بڑھ گئی۔

ہتھیاروں کی سپلائی اور منتقلی میں مغربی بلاک کی اجارہ داری ختم کرنے کے سلسلے میں روس نے جو تاخیر کی اس کی کئی وجوہ ہیں۔ سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد

روس کو اپنی معیشت نئے سرے سے تعمیر کرنے میں کچھ وقت لگا۔ اور وہ سرد جنگ کے شروع ہو جانے کی وجہ سے اپنی سلامتی کو مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ (یہاں یہ بات یاد دلانے کے قابل ہے کہ ۱۹۵۵ء میں ایٹمی طاقت میں روس کی برابری حاصل کرنے سے پہلے امریکہ کی طرف سے ۱۹۵۴ء ڈراپ شاٹ نام کا ایک منصوبہ بنایا گیا تھا جس کے تحت روس پر ایٹم بم گرایا جاتا تاکہ "یورپ اور ایشیا سے کمیونزم کو واپس لپیٹا جائے"، لیکن راز افشا ہونے اور روس کی جوابی ایٹمی حملہ کی دھمکی کی وجہ سے یہ منصوبہ عمل میں نہ آسکا) دوسری وجہ یہ تھی کہ روس ضروری استعداد اور فاصل اسلحہ جات کی کمی کی وجہ سے بھی پس و پیش میں تھا۔ لیکن جب تیسری دنیا کے ملک اپنی ایک واضح صورت لے کر سامنے آئے اور نو آزاد ملکوں میں مغربی ملکوں کی ساکھ کم ہونے کے ساتھ ساتھ روس کے ساتھ ان کے تعاون کے امکانات بڑھ گئے تو روسی اسلحہ جات کی سپلائی کے لیے حالات پیدا ہو گئے۔

"روس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ان فوجی اتحادوں کو کمزور کیا جائے جو مغربی طاقتیں اس کی سرحدوں کے ارد گرد قائم کر رہے تھے"۔ پچاس کی دہائی کے اختتام اور ساٹھ کی دہائی کے آغاز پر غیر جانبدار تحریک کے نمودار ہونے اور اس میں وسعت لگنے سے اور نو آبادیت سے چھٹکارا پانے والے ملکوں میں سامراج مخالف، انقلاب پسند اور آزادی کی تحریکیں وجود میں آنے سے ایسی تبدیلیاں آ رہی تھیں جو روس کے لیے بہت ساز گار تھیں۔ اس طرح سے روس کی اقتصادی امداد میں بھی وسعت لگ گئی۔ لیکن ساٹھ کی دہائی میں جو روس کے اقتصادی امداد اور فوجی امداد کا تناسب ۱ : ۱ تھا وہ ستر کی دہائی کے اوائل میں ۴ : ۱ ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود، جیسا کہ سپری کی رپورٹ میں کہا گیا ہے، روس اسلحہ کی ٹیکنالوجی میں ابھی بھی امریکہ سے پیچھے ہے۔ خاص طور پر مائیکرو الیکٹرانکس اور کمپیوٹرس کے شعبہ میں . . . . جس کو ہتھیاروں کی جدید ٹیکنالوجی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔"

بھاری نوعیت کے فوجی پروگراموں کا بوجھ روس کی معیشت پر زیادہ نمایاں ہے۔ روس کی شرح ترقی کی رفتار کم پڑ گئی ہے جس کی وجہ پیداواری صلاحیت میں سست رفتاری اور لیبر کی قلت وغیرہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "روس کی معیشت امریکہ کے مقابلے میں بوجھ تلے دبی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں روس کی سالانہ معاشی پیداوار امریکی قومی آمدنی سے نصف سے کم تھی اور اس کا دس سے بارہ فی صد حصہ فوجی پروگراموں پر صرف ہوا۔" فوجی پروگراموں کے اخراجات کے بارے میں کچھ اختلاف ہے۔ کمرشیل بنکوں کا خیال ہے کہ یہ آٹھ سے نو فی صد ہے، سپری کا کہنا ہے کہ یہ نو فی صد ہے اور سی آئی اے کا دعوا ہے کہ یہ بارہ سے چودہ فی صد ہے مگر اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ

" روس کی قومی معیشت کی بنیاد امریکی معاشی بنیاد سے نصف کے برابر ہے۔ مگر اس کی فوجی سرگرمیاں قومی آمدنی کے فی صد حساب سے امریکہ سے دوگنی ہونی چاہئیں تاکہ وہ اس سے برابری کر سکے۔ ورنہ ابھی ان سرگرمیوں کو امریکہ کے مقابلے میں زیادہ رہنا ہے کیونکہ فوجی تحقیق و ترقی (آر اینڈ ڈی) کی بڑی طاقتیں امریکہ، جرمنی، جاپان، برطانیہ اور فرانس روس کے خلاف اس تحقیق و ترقی میں ساجھے داری کر سکتے ہیں۔

موجودہ مرحلے پر امریکہ اور روس کے تعلّقات

دیتانت (مصالحت) کے خاتمے سے ہی موجودہ دور کی شروعات ہوتی ہے۔ یعنی دوسری سرد جنگ کا دور۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکی انتظامیہ نے تیسری دنیا کے حالات و واقعات اور ان پر روسی ردعمل کو غلط طریقہ سے سمجھا اور ان کے مقاصد کو غلط معنی پہنا دیے۔

ویت نام میں امریکہ کی شکست اور اپنی فوج کو واپس بلانے کے دو نتیجے نکلے۔ عالمی معاملوں میں ایک عالمی طاقت کی شرمندگی اور امریکہ کے اندر وہاں کے شہریوں کی طرف سے انتظامیہ کی ساکھ اور فہم و فراست پر اظہار شک۔ اس سے نکسن اور کسنجر سالٹ سمجھوتہ کے لیے بات چیت کرنے اور چین کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کے لیے آمادہ ہوئے۔ فوجی اعتبار سے اہم ہتھیاروں کے سلسلے میں روس کی سربراہی کے احساس کے ساتھ دیانت پر عمل کیا گیا اور ہتھیاروں کی دوڑ کی رفتار سست پڑ گئی۔ اور اس پالیسی کی حمایت کی گئی جس کو کسنجر "تعاون اور مقابلے" کی پالیسی کہتے تھے۔ سنہ ۱۹۷۳ء اور سنہ ۱۹۷۷ء کے دوران میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن سے روس اور امریکہ تعلقات متاثر ہوئے۔ ان میں قابل ذکر واقعات یہ ہیں: چین کا روس سے روگرداں ہونا اور امریکہ کے ساتھ اس کی مفاہمت، مصر میں سادات کا ناصر کی پالیسی سے منہ موڑ لینا اور روس سے دور ہو جانا، چلی میں آئندے کی سرکار کو ختم کرنے اور آئندے کو قتل کرنے میں سی آئی اے کی کامیابی، ایران کے شاہ کی طرف سے یہ کوشش کہ افغانستان کا داؤد روس کے ساتھ اپنے روایتی تعلقات ختم کرے، سعودی عرب کی طرف سے جنوبی یمن کے روبیآ علی کو اقتصادی اور فوجی امداد کی لالچ دے کر اس کو روس کے دائرۂ اثر سے نکالنے کی کوشش، اور صومالیہ کے سعید باری اور روس کے درمیان تعلقات کو کمزور کرنے کی سعودی عرب کی کوشش۔

تیل پیدا کرنے والے ملکوں نے ۱۹۷۴ء میں تیل کی قیمتوں میں چار گنا اضافہ کیا جس سے یورپ شمالی امریکہ اور جاپان میں انرجی کا بحران پیدا ہوا، افراط زر کے حالات ہوئے اور اقتصادی عدم توازن پیدا ہو گیا۔ اس سے یہ اندیشہ بھی ہو گیا کہ ... تیل فراہم نہ ہونے کی صورت میں مغربی ملکوں

کی معاشیات غیر محفوظ ہیں۔ اس سے پہلے ایک سال یعنی ۱۹۷۳ء میں عرب، اسرائیل کے درمیان یوم کپور کی جنگ کے دوران روس کی مداخلت کی دھمکی سے جو جنگ بندی عمل میں آئی اس سے اس خطے میں امریکہ کی سلامتی کے مفادات پر، جیساکہ وہ سمجھتا تھا اہم اثر پڑا۔ ۱۹۷۴ء میں افریقہ میں ایک طرف سے پرتگیزی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور دوسری طرف انگولا کے مجاہدین آزادی کو کیوبا کے شہر کا کی حمایت ہوئی تاکہ جنوبی افریقہ کی نسل پرست سرکار سے اس کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔ برزینسکی نے اس کو روس کی طرف سے عالمی افراتفری پیدا کرنے کی ایک اور مثال قرار دیا۔ کیوبا والوں کا کہنا تھا کہ انگولا والوں کے ساتھ قدیم نسلی رشتوں کے علاوہ کیوبا کی کالے لوگوں کی بیشتر آبادی انگولا نسل کی ہے ان سے انگولا کی ایم پی ایل اے سرکار نے مدد کی درخواست کی تھی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایک انقلابی طاقت اور غیر جانبدار تحریک کا ممبر ہونے کے ناطے آزادی کی تحریکوں کی حمایت ان کے عقائد اور اصولوں میں شامل ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں غیر جانبدار تحریک کی ۱۹۶۴ء کی قاہرہ کی چوٹی کانفرنس اور ۱۹۷۳ء میں الجیرس کی چوٹی کانفرنس کے سیاسی اعلان ناموں کا حوالہ دیا مگر امریکہ کی مداخلت سے انگولا کی صورت حال پیچیدہ ہوگئی۔ امریکہ نے خفیہ طور پر سی ائی اے کو استعمال کیا اور جنوبی افریقہ کھلم کھلا طور پر میدان میں آگیا۔ سی آئی اے، جنوبی افریقہ اور یو این آئی ٹی اے میں اتحاد عمل کا انتظام کسنجر نے کیا۔

ایک طرح سے ہارن آف افریقہ کے بحرانوں نے، جو مئی میں ۱۹۷۷ء میں شروع ہوئے، امریکہ اور روس کے موقف سخت کر دیے۔ دوسری سرد جنگ کے اسباب کی بنیاد کی نشاندہی اپنی بحرانوں کے ساتھ جوڑی جاسکتی ہے۔ ہارن آف افریقہ مشرق اور مغرب کے درمیان ایک نہایت اہم سمندری گزرگاہ کے چوراہے پر واقع ہے۔ ۱۹۷۳ء کی یوم کپور جنگ نے بحیرہ روم کے مشرقی حصے اور اور بحر ہند کے مغربی حصے کے درمیان اس علاقہ کی اہمیت کو واضح کر دیا۔ سومالیہ کے ساتھ ۱۹۷۴ء میں روس کے تعلقات ایک معاہدے کے تحت قائم ہوئے تھے۔ ہائلی سلاسی کے تحت ایتھوپیا کی حکومت ۲۵ سال سے زیادہ عرصہ کے لیے امریکہ اور مغربی ملکوں کی اتحادی رہی۔ لیکن ستمبر ۱۹۷۴ء میں جب مارکسیوں نے اس حکومت کا تختہ الٹ دیا، روس نے ایتھوپیا کے ساتھ بھی قریبی رابطے قائم کیے۔ مگر شمال میں ایری ٹریا کی علاحدگی پسند تحریک سے، جس کی سومالیہ مدد کر رہا تھا، ایتھوپیا اور سومالیہ کے درمیان ایک بہت بڑا بحران پیدا ہوگیا۔ روس نے پہلے تو ان دونوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی مگر جب سومالیہ نے مئی ۱۹۷۷ء میں اس مسئلے کو فوجی طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی اور اس کی فوجیں اوگاڈن میں داخل ہوگئیں تو روس اور کیوبا دونوں مینگستو کی حکومت کی مدد کے لیے آئے اور ایتھوپیا کے حق میں

بھاری پیمانے پر مداخلت کی۔ سومالیہ نے روس کے ساتھ اپنا معاہدہ منسوخ کیا، روس کے صلاح کاروں کو ملک سے باہر نکال دیا اور اس طرح سے امریکہ کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔ وہ سومالیہ میں داخل ہوگیا اور اس نے بیر بیرا کے بحری سینٹر پر بھی قبضہ کرلیا جو روسیوں نے بنایا تھا۔

صدر کارٹر کے قومی سلامتی سے متعلق صلاح کار برزینسکی (جو یہ دعوا کرتے ہیں کہ انھوں نے بار بار کارٹر کو یہ کہا کہ اگر وہ ولسن بننا چاہتے ہیں تو وہ پہلے ٹرومین بنیں) نے ایک تھیوری تیار کی جسے "بحرانوں کا قوس" نام دیا گیا۔ اس کے دائرے کے تحت ہارن آف افریقہ سے خلیج تک کا علاقہ آتا ہے جس میں مغربی ایشیا اور جنوب مغربی ایشیا شامل ہے۔ یعنی وہ علاقہ جسے امریکہ کے اہم مفادات کا زون کہا جاتا ہے۔ اس قوس کا ایک بڑا حصہ روس کی جنوبی سرحدوں کے ساتھ ساتھ، اس کے ہمسایہ ملکوں کے علاقوں میں گزرتا ہے اور ان علاقوں میں افغانستان شامل ہے اور یہ علاقے روس کی سلامتی کے لیے بہت اہم ہیں۔

امریکی انتظامیہ نے ایک اور تھیسز بھی تیار کی جس کے تین پہلو ہیں۔ وہ یہ کہ روس کی فوجی صلاحیتوں کو فوجی ارادوں سے تعبیر کیا جانا چاہیے "عمل اور ردِّ عمل کے اصول کے تحت ایک علاقہ کے تناؤ کا جواب دوسرے علاقہ میں تناؤ پیدا کرنے سے دیا جانا چاہیے اور دیتانت کی قیمت، حالتِ موجودہ ہونی چاہیے۔ یعنی وارسا معاہدہ میں شامل ملکوں کے باہر روس کی کسی کارروائی کو توسیع پسندی مانا جانا چاہیے۔ کسنجر نے لکھا "ہمارے خیال میں ہتھیاروں پر کنٹرول کرکے ایٹمی جنگ کے خطرے کم کرنے کی بات کو روس کے اس مسلسل دباؤ کو ختم کرنے کے ساتھ جوڑا جانا چاہیے جو وہ طاقت کے عالمی توازن کو بگاڑنے کے لیے ڈال رہا ہے۔ اس خیال کی بنیاد اس مفروضہ پر قائم ہے کہ پورا بین الاقوامی نظام دو بڑی طاقتوں کے درمیان کھیل کا ایک میدان ہے۔"

۲۴ اگست ۱۹۷۷ء کے صدارتی حکم ۱۸ سے آر ڈی ایف یعنی فوری طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائی جانے والی فوج کی تنظیم کے سلسلے میں کارروائی شروع ہوئی اس سے یہ واضح اشارہ ملا کہ امریکہ طاقت کے مظاہرے کے رویہ پر عمل کررہا ہے جس کو برزینسکی نے بحرانی علاقوں کا نام دیا تھا اور جس میں ریڈ سی خلیج اور بحر ہند کا علاقہ آجاتا ہے۔ اس پالیسی پر عمل کے لیے سہ طرفی کمیشن میں شامل ملکوں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا گیا، اور خاموشی کے ساتھ چین کی حمایت بھی حاصل کی گئی۔ اس کے بعد ناٹو اتحاد میں شامل ملکوں کی ایک چوٹی کانفرنس مئی ۱۹۷۸ء میں منعقد کی گئی۔ یعنی اس وقت جب اقوام متحدہ کے ترک اسلحہ جات سے متعلق ایک خصوصی اجلاس میں ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کم کرنے کے طریقوں پر بحث ہو رہی تھی۔ ناٹو ملکوں کی اس چوٹی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسلحہ جات کے بجٹ میں پانچ سال کے

دوران پندرہ فی صد کا اضافہ کیا جائے یعنی ہر سال تین فی صد کا اضافہ۔ کانفرنس میں ایم ایکس ۱۰۰ تیار کرنے اور بحر ہند میں ڈیگو گارشیا کے اڈے کو مضبوط بنانے کے پروگراموں کو عملی صورت دینے کے فیصلے بھی کیے گئے جون ۱۹۷۸ء میں صدر کارٹر نے اناپولس کی امریکی بحری اکیڈمی میں ایک اہم تقریر کی جس میں انھوں نے روس کے تئیں تعاون اور ٹکراؤ کی پالیسی کا اظہار کیا۔ اس تقریر سے صاف ظاہر تھا کہ اسے انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں کے تیار کیے ہوئے دو مسودوں کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ انتہا پسندوں کی نمائندگی سلامتی سے متعلق مشیر برزنسکی اور اعتدال پسندوں کی خارجہ وزیر سائرس وانس کر رہے تھے اس کے بعد سالٹ۔۲ کو روکنے کی کوششیں کی گئیں اور ہتھیاروں کی دوڑ میں تیزی آگئی۔ اسی پس منظر میں برزنسکی کے "سالٹ او گاڈن کی ریت میں مدفن ہے۔" جیسے فقروں کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اپنی کتاب "پوور اینڈ پرنسپل" میں انھوں نے کہا ہے کہ "مارچ ۱۹۷۸ء میں خارجہ وزیر (سیکریٹری آف سٹیٹ) سائیرس وانس نے ہارن آف افریقہ اور سالٹ کے معاملوں میں کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے پر اعتراض کیا" مگر صدر کارٹر اور برزنسکی کا خیال تھا کہ "روس کی کارروائیوں سے یہ تعلق پیدا ہونا لازمی ہے۔" اس سلسلے میں یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ بحر ہند امن کا علاقہ بنائے جانے اور تیسری دنیا کو روایتی ہتھیاروں کی سپلائی کے بارے میں جو بات چیت امریکہ اور روس کے درمیان چل رہی تھی اور جو کارٹر کے اقتدار میں آنے کے بعد شروع ہوئی تھی۔ امریکہ نے اسے ۱۹۷۸ء میں یک طرفہ طور پر ختم کر دیا۔ ظاہر ہے کہ انتہا پسند جیت رہے تھے اور برزنسکی اس سلسلے میں کامیاب ہوئے تھے کہ کارٹر ولسن کے بدلے ٹرومین کے نقش قدم پر چلیں۔ اس طرح سے دوسری سرد جنگ ۱۹۷۸ء کے آس پاس شروع ہو چکی تھی یعنی افغانستان کے ان واقعات سے ایک سال پہلے جن کی وجہ سے دسمبر ۱۹۷۹ء میں روس کو اپنی فوج وہاں بھیجنی پڑی۔

افغانستان کو مشرق اور مغرب کے ٹکراؤ میں ایک وجہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور یہ دوسری سرد جنگ کی علامت بن گیا ہے۔ سالٹ۔ ۲ کی تصدیق سے کانگریس نے گریز کیا اور ناٹو نے یورپ کی سرزمین پر پرشنگ۔ ۲ اور کروز میزائیل نصب کرنے کا فیصلہ کیا۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں ایران کی شاہ کی معزولی اور وہاں موجود معلومات حاصل کرنے اور نگرانی کے امریکی سسٹم کے خاتمے سے مغربی ملکوں کے اتحاد کو بہت بڑا دھکا لگا۔ چنانچہ کارٹر نے جنوری ۱۹۸۰ء میں اعلان کیا۔ "کسی بیرونی طاقت کی طرف سے خلیج فارس پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کو امریکہ کے بنیادی اہمیت کے مفادات پر حملہ تصور کیا جائے گا اور یہ حملہ کوئی بھی کارروائی کر کے ناکام بنا دیا جائے گا، جس میں فوجی کارروائی بھی شامل ہو گی۔" اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے تجویز کیا گیا کہ آر ڈی ایف کے لیے چار لاکھ چالیس ہزار فوجی مہیا کیے جائیں۔ آر ڈی ایف کا صدر مقام فلوریڈا میں تامپا کے ہوائی فوج کے میکڈل ٹھکانے پر تھا۔ اول جنوری ۱۹۸۳ء کو ایک نیا

امریکی سینٹرل کمانڈ قائم کیا گیا جس کے دائرۂ عمل میں انیس ملک آتے تھے۔ اس صورت حال کی تمام پیچیدگیوں اور ان مشکل راستوں کے باوجود، جن کا سامنا، افغانستان میں ۱۹۷۸ء میں کمیونسٹوں کی طرف سے حکومت پر قبضہ کرنے کے وقت سے، روس کو کرنا پڑا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ افغانستان میں روسی فوج کی موجودگی سے مغرب، جنوب مغرب اور جنوبی ایشیا کی سلامتی کے ماحول میں ایک نیا عنصر پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے امریکہ کو پاکستان کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے اور اس خطے میں اسلحہ بھیجنے کے لیے جواز پیدا ہو گیا جس سے ہندستان اور پاکستان کے درمیان فوجی طاقت کا توازن بگڑ گیا ہے۔

صدر ریگن کے انتظامیہ نے ٹکراؤ کی پالیسیوں کو اور زیادہ دم خم سے آگے بڑھایا۔ کمیونزم کو روکنے کے رویہ میں ایک نئی قوت آگئی ہے اور اس کو ان کی خارجہ پالیسی میں اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ ریگن کی حکمت عملی کے چار بڑے ستون ہیں امریکہ اور مغربی ملکوں کی معاشی اور فوجی طاقت کو بحال کرنا، اتحادوں میں نئی روح پھونکنا، ترقی پذیر ملکوں میں پرامن تبدیلی اور ترقی کو فروغ دینا، اور روس کے ساتھ ایسے تعلقات، جن کی بنیاد روس کی طرف سے زیادہ ضبط دکھانے پر اور دوطرفہ عمل پر ہوگی۔ ریگن نے روس کے بارے میں کہا کہ یہ ایک "بدکار مملکت" ہے، دغاباز اور ناقابل بھروسہ اور توسیع پسند ہے، جو دیانت کی مستحق نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کا سامنا فوجی برتری سے کیا جانا چاہیے۔ ریگن امریکہ کی عوامی زندگی میں فاتح قدامت پسندی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے سرد جنگ کو نئی سطحوں تک پہنچا دیا۔ پہلے زمین سے خلا تک اور اب اسٹاروار اور ایس ڈی آئی (سٹراٹیجک ڈیفنس اِنی شئے ٹیو) تک جسے وہ اسلحہ کا "غیر نیوکلیائی" اور "زیادہ انسان نواز" اور "زیادہ اخلاق پسند" سسٹم کہتے ہیں جس سے "لوگ نہیں بلکہ ہتھیار تباہ ہوں گے۔"

صدر ریگن نے صدارتی عہدہ دوسری بار سنبھالنے کے موقع پر اپنی افتتاحی تقریر میں کہا تھا: "روس وہ واحد ملک ہے جس نے اتنے اسلحہ جمع کیے ہیں جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ وہ جارحانہ ہتھیاروں سے اسلحہ خانے بھر رہا ہے۔" سٹیٹ سکریٹری جارج شلز کا کہنا ہے "امریکہ اور روس نے اپنے تعلقات مستحکم بنانے اور نیوکلیائی ہتھیاروں پر کنٹرول کے لیے سیاسی مذاکرات کی کوشش کی۔ مگر یہ بات چیت روس کی طرف سے ہتھیاروں کے ذخیرے قائم کرنے اور سیاسی و علاقائی سطح پر جارحانہ کارروائی کے بوجھ تلے دب کے رہ گئی۔" بدقسمتی سے یہ دونوں بیانات جانچ پڑتال پر پورے نہیں اترے۔ سپری یا باقی ایجنسیاں نہ تو صدر کی اور نہ اسٹیٹ سکریٹری کی باتوں کی تصدیق کرتی ہیں۔ بہت سے امریکی ماہرین بھی ایسے خیالات پر اعتراض کرتے ہیں۔ بلکہ اس پالیسی پر بھی۔ کیونکہ ان باتوں سے ہتھیاروں کی دوڑ تیز ہو گئی ہے

اور نیو کلیائی ہتھیاروں کے لیے سسٹم بننے لگے ہیں۔

بہر حال مارچ ۱۹۸۵ء میں ڈیڑھ سال کے تعطل کے بعد ایک نئی شروعات ہوئی صدر ریگن کہتے ہیں کہ جنیوا کی بات چیت کی کامیابی سے انھیں یہ امید ہو گئی ہے کہ ۱۹۸۵ء کا سال "بات چیت اور مذاکرات" کا سال ہوگا اور روس اور امریکہ میں بہتر تعلقات قائم ہونگے۔ جنیوا کے مذاکرات مفصل ہیں اور ان کے دائرے میں خلائی اور نیو کلیائی ہتھیاروں سے متعلق تمام پیچیدہ مسائل آئیں گے۔ دنیا کو پریشانی بھی ہے اور یہ امید بھی کہ دونوں عالمی طاقتیں یہ محسوس کریں گی کہ ہتھیاروں کی دوڑ روکنا اور بقائے باہم کے لیے کوئی نیا طریقہ ڈھونڈ نکالنے کا کام بہت ہی اہم ہے۔

حفاظتی نظام کی اخلاقی بنیاد

تحفظ کے بارے میں فوجی نقطہ نظر سے سوچنا اور فوج کے بارے میں نیو کلیائی نقطۂ نظر سے سوچنا اور نیو کلیائی صلاحیت کی بنیاد ایم اے ڈی یعنی باہم یقینی تباہی پر رکھنا۔ یہ ایک ایسا طرز فکر ہے جس کو اگر ہم پوری طرح سے پرکھ لیں تو ہمیں اس میں صرف عقل و دانش کی ہی خامیاں نظر نہیں آئیں گی بلکہ سیاسی اصول و اخلاق کی کمی بھی۔ جنگ کے امکانات کم کرنے کے لیے نیو کلیائی ہتھیار بنانے کی قیمت یہ ہے کہ انسان کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوتیں اور جہاں تک ان ہتھیاروں کے مؤثر ہونے کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ پوری انسانیت یرغمال بن کے رہ گئی ہے۔

اب یہ احساس بڑھنے لگا ہے کہ نیو کلیائی ہتھیار، مال وزر، وسائل، ذہانت اور وقت کی بربادی ہے۔ حکمت عملی تیار کرنے والے ماہر، ریٹائرڈ فوجی اور سفارت کار، عوامی شخصیتیں اور عالم اب اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ جنگ کو روکنے کے لیے نیو کلیائی ہتھیاروں کے مؤثر رول کو ضروریات سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ امریکی بحریہ کے ریر ایڈمرل یوجین کارل اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ جنگ کو ٹالنے میں صرف نیو کلیائی خطرے کا ہاتھ رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فوجی سیاسی اور اقتصادی نوعیت کی اور بہت سی باتیں ہیں جن سے اعلا طاقتوں کے درمیان تصادم رکے ہوئے ہیں۔ امریکی بحریہ ہی کے ایڈمرل نویل گیلر اور امریکہ کے لفٹیننٹ جنرل کولنس اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ "نیو کلیائی ہتھیاروں سے کوئی سود مند فوجی کام نہیں ہوتا۔" لارڈ لوئیس مونٹ بیٹن نے کہا "ایک فوجی کی حیثیت میں، جس نے نصف صدی تک عملی طور پر فوج میں کام کیا، میں یہ پورے خلوص کے ساتھ کہتا ہوں کہ نیو کلیائی ہتھیاروں کا کوئی فوجی مقصد نہیں ہے۔ ان سے جنگیں نہیں لڑی جا سکتیں۔" اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے دسویں خصوصی اجلاس، جو ترک اسلحہ جات پر بات

چیت کے لیے مخصوص تھا، حتمی دستاویز کے پہلے پیراگراف میں لکھا ہے "ہتھیاروں کے خاص طور پر نیوکلیائی ہتھیاروں کے ذخیروں سے، انسان کا مستقبل محفوظ ہونے کے بدلے خطرے میں پڑ گیا ہے۔" ایڈمرل گیلر جو بحرالکاہل میں امریکہ کے کمانڈر ان چیف تھے، صاف صاف کہا ہے۔" نیوکلیائی ہتھیاروں کا کوئی قابل فہم فائدہ نہیں۔" خواہ یہ نیوکلیائی ہتھیار کسی بھی قسم کے ہوں۔

'ہماری دنیا نئی ہے'۔ یہ بات اتنی بار کہی گئی ہے کہ اب یہ فرسودہ ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا اور نہ لکھتا ہے کہ ہماری دنیا اس لیے نئی ہے کہ یہ خوفناک حد تک ظالم اور بداعمال ہے۔ اور اگر کچھ بہت بڑے ملکوں کی پالیسیوں کی بنیاد کو پیش نظر رکھنا جائے تو پاگل بھی۔ یہ بڑے ملک وہ ہیں جو دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ ہیبت ناک بات یہ ہے کہ ہتھیاروں کو نیوکلیر بنانے کے ساتھ ساتھ کمانڈ، کنٹرول، کمیونکیشن، اور انٹیلی جنس (جاسوسی) میں کمپیوٹروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے غلطیوں کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ مشین کی غلطی، چلانے کی غلطی، مواصلات میں غلطی، اور پھر کسی خاص صورت حال میں انسان کی غلطی ۔ سمجھنے میں، فیصلہ لینے میں، شمار کرنے میں، یا پڑھنے میں ـــــ اس سے اتفاقاً اور غیرارادی طور پر تباہی ہو سکتی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر لیڈر ذی عقل نہ ہوں، سمجھدار نہ ہوں، بلکہ طاقت اور بوالہواسی کے نشے میں، یا خوف اور غصے میں، یا کسی صلاح کار کے کہنے پر (یہ سب باتیں ناممکن نہیں ہیں) جوش و طیش میں آ گئے، تو جنگوں کے امکانات کم کرنے کی بات ختم ہو جاتی ہے اور تباہی شروع ہو جاتی ہے۔

پوری دنیا کی انسانی نسل کو اور اس انسانی نسل کی تہذیب و تمدن کے اثاثے کو ایٹمی اور عالم گیر تباہی کے امکانی خطرے کے مسلسل اور جلتے اور گہرے سایوں تلے اپنے پر مجبور کرنے کے لیے عقل و اخلاق کی کتنی مقدار چاہیے۔ انسانی تاریخ کے ان ساڑھے پانچ ہزار برسوں میں، جن کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل ہیں، کوئی ایسی پیڑھی نہیں رہی ہے جس نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں اپنی فتح مندی اور کامرانی کو اپنی ذات کے، دوسری جاندار ذاتوں کے اور عالمی ماحول کے وجود کے لیے ہلاکت اور تباہی میں تبدیل کیا ہو۔ ہمیں اس وقت مقصد اور ذرائع کے درمیان متضاد کیفیت کے خباثت بھرے چکر کا سامنا ہے اور اس چکر کو فہم و فراست اور عقل سلیم کو اجتماعی طور پر استعمال کر کے ہی توڑا جا سکتا ہے اور تباہی کے عمل کا رخ موڑا جا سکتا ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے، اس عام دلیل کو غلط ٹھہراتے ہوئے کہ ہتھیاروں کے ذخائر امن کی ضمانت ہیں، اپنے طویل اور شاندار کریئر (خدمات) کی آخری اور جلیل القدر تقریر میں کہا تھا:

"دنیا میں ایسے با اثر لوگ ہیں جو ابھی بھی قدیم روم کے اس تصور پر اعتبار کرتے ہیں کہ 'اگر امن چاہتے ہو تو جنگ کی تیاری کرو'، یہ قطعی طور پر نیو کلیائی واہیات ہے۔"

رشید الدین خاں۔

نئی دہلی
جون ۱۹۸۵ء

پہلا حصّہ
پاکستان اور
علاقائی تحفظ کے مسئلے

۱- ایشیا میں امن اور جدید سامراجی گٹھ جوڑ

وی۔ ڈی چوپڑا

(۱)
پاکستان کا رول، امریکہ کی سمجھ

ایشیا، جنوب مغربی ایشیا اور جنوبی ایشیا میں امن کو فروغ دینا بہ ظاہر ایک آسان کام لگتا ہے۔ پاکستان نے حال ہی میں جو "یلغاز امن" شروع کی ہے اور جسے وہ ہندوستان کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے" کی کوشش کا نام دیتا ہے، دیکھنے میں قابل ستائش محسوس ہوتی ہے مگر وہ اپنی فوجی طاقت جس میں ایٹمی صلاحیت بھی شامل ہے جس بڑے پیمانے پر اور جس تیزی رفتار کے ساتھ بڑھا رہا ہے اس سے پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے حقیقی مقاصد اور ارادوں کے بارے میں شک وشبہہ پیدا ہونا اور یہ خیال آنا قدرتی بات ہے کہ یہ امن کا رویہ فریب کا پردہ بھی ہو سکتا ہے۔

واقعتاً ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زمین کی پرتوں کی طرح یہاں بھی کئی پرتیں، کئی درجے اور کئی قسمیں موجود ہیں۔ اوپر کی سطح پر بھربھری مٹی ہے، نرم اور خوشگوار لیکن اس کے نیچے زمین کی جو پرت ہے وہ سخت بھی ہے اور دشوار گزار بھی۔ اس لئے ہمیں تھوڑا کھدائی کا کام کرنا پڑے گا۔ پرچار کی نرم اور بھربھری مٹی ہٹا کر نظریہ کی اس ٹھوس اور سخت زمین تک پہنچنا ہوگا جو اس پرچار کو بنیاد فراہم کرتی ہے اور مقصدیت عطا کرتی ہے، اور ہمارا مقصد یہی ہے۔ ہم تجزیہ کی

عینک سے کام لیتے ہوئے اسلام آباد کی جنگ بازانہ سیاست کے ان اعلانات کو کھنگالنا چاہتے ہیں جو سفید جھوٹ کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس نظریاتی چٹان تک پہنچنا چاہتے ہیں جہاں اس بے مثال فوجی تیاری کے ان اسباب اور ان وجہوں کا مسکن ہے جو نہ اتنی نیک نفسی کی حامل ہیں اور نہ ہی شکوک وشبہات سے بالاتر۔ صورت حال یہ ہے کہ جہاں ہندوستان کے بعض سیاسی رہنما اور کچھ اخبارات و رسائل یہ تاثر دینے کی کوشش کررہے ہیں کہ اسلام آباد کیطرف سے دی جانے والی دلیلوں سے وہ مطمئن ہیں وہاں دور اندیش اور معروضی مبصر ارادی سادہ لوحی سے کام لینے سے انکار کرتا ہے۔ لیکن آیئے سب سے پہلے اس غلط فہمی کو دور کردیا جائے جو اس پرچار سے پیدا ہوئی ہے کہ افغان انقلاب کے بعد اور اس سے متعلق ہندوستان کے اختیار کردہ موقف کی وجہ سے ہند پاک تعلقات سب سے زیادہ خراب ہوئے ہیں۔

ہندوستان و پاکستان کے درمیان معاندت کا سلسلہ اتنے دنوں سے جاری ہے کہ اب وہ بین الاقوامی سیاست کا سکۂ رائج الوقت بن چکی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ معاندت کشمیر کے سوال پر باہمی ٹکراؤ کی وجہ سے پیدا ہوئی اور چونکہ نہ پاکستان اپنے دعوے سے باز آنے پر تیار ہے اور نہ ہندوستان اپنا موقف چھوڑنے پر (یعنی یہ کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ حصہ ہے اور کشمیر کے بعض علاقوں پر پاکستان اور چین نے جو ناجائز قبضہ کررکھا ہے، اسے ختم ہونا چاہیئے) اس لئے یہ ٹکراؤ دائمی حیثیت حاصل کرگیا ہے۔ جن لوگوں کو برصغیر کی تاریخ کی تھوڑی بہت واقفیت حاصل ہے وہ یہ کہیں گے کہ پاکستان ۱۹۴۷ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں پورے کشمیر پر قبضہ کرلینے کی غرض سے ہندوستان کے خلاف تین جنگیں چھیڑ چکا ہے اور مشکل ہی سے کوئی بین الاقوامی فورم ایسا بچا ہوگا جس میں پاکستان نے کشمیر کا معاملہ نہ اٹھایا ہو۔

اب اس راز سے بھی پردہ اٹھ چکا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے "کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لئے" شروع کی تھی۔ ایوب خاں کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "ہند پاک جنگ۔ ۱۹۶۵ء، میرا نقطۂ نظر"۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد پاکستان میں ایک عام بحث اس بات پر

چھوڑ گئی ہے کہ یہ جنگ کس طرح لڑی گئی۔ اس کتاب پر جو تبصرے کئے گئے ہیں ان میں سے ایک اس طرح ہے:

"جس بات کا سمجھنا اور زیادہ مشکل محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کشمیر کا مسئلہ حتمی طور پر طے کرنے کی غرض سے یہ نازک اور سنگین فوجی کارروائی میدان کے قطعی مختلف گوشے میں یعنی رن آف کچھ کے علاقے میں کیوں کی گئی جو پاکستان کے لئے فوجی اور سیاسی کسی بھی اعتبار سے قطعی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

لیکن ہندوستان و پاکستان کے درمیان کشمیر کے سوال کا "مستقل متنازع بنا رہنا" ان نئے تعلقات کا سبب نہیں ہو سکتا جو حالیہ برسوں میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان قائم ہوئے ہیں۔

دوسری طرف ہند امریکی تعلقات کی شروعات ہی کچھ اچھی نہیں رہی۔ اگست ۱۹۴۷ء میں بھی اس میں کوئی خوش آئند موڑ نہیں آیا۔ روز ویلٹ کی موت ہو چکی تھی، ان کی جگہ آئے ہیری ٹرومین جو نسل پرست اور سامراجی ذہنیت کے مالک تھے، جدید استعمار پسندی اور ڈلز اور میکارتھی قسم کی کمیونسٹ دشمنی اُن کی نس نس میں بھری ہوئی تھی۔ سچ پوچھئے تو ان میں اور ہندوستان کے جواہر لال نہرو میں کوئی مماثلت نہ تھی۔ دونوں جن نقاط نظر کی نمائندگی کرتے تھے وہ قطعی متضاد تھے۔ جواہر لال نہرو پوری طرح گاندھی جی سے متاثر تھے اور عدم تشدد اور امن کے داعی تھے۔ اس کے برخلاف ٹرومین کا منصوبہ تھا کہ سوویت یونین کو یوروپی ملکوں کے علاقے سے واپس ہٹنے پر مجبور کر دیا جائے۔ لیکن اس میں انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ کانگریس نے عام فوجی تربیت اور زمانۂ امن میں جبری بھرتی کا ان کا منصوبہ رد کر دیا۔ ادھر سمندر پار کی امریکی مسلح افواج میں بیچینی اور فوجیوں کے عام مظاہرے نے انہیں سپاہیوں کو بڑے پیمانے پر وطن واپس بلانے پر مجبور کر دیا۔

جواہر لال نہرو جو ایک آزاد ریاست کے وزیر اعظم بنے کمیونسٹ دشمنی میں مبتلا نہیں تھے۔ اس کے برخلاف ٹرومین اور ان کے مشیر ڈلز، ایچی سین، ایورل ہیریمان، جارج کینن اور دوسرے سب کے سب اندھی کمیونسٹ دشمنی

کے اس حد تک شکار تھے کہ ہر وقت انہیں کمیونزم کا بھوت نظر آتا۔ ۱۹۴۷ء میں ٹرومین نے اپنی نظریہ ساز تقریر کے ذریعے سرد جنگ کا آغاز کیا۔ یہ سوویت کمیونزم کے خلاف ایک نظریاتی جہاد تھا۔ ایک طرف نہرو تھے جو مغربی طاقتوں پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور اپنے استعماری حکمرانوں کے خلاف محکوم قوموں کی جدوجہد کی کھل کر حمائت کر رہے تھے تو دوسری طرف ٹرومین کے نظریہ میں "مسلح انقلابوں کو کچلنے کا صاف صاف پیمان کیا گیا تھا چاہے وہ کہیں بھی رونما ہو رہے ہوں۔" نہرو نے استعماری طاقتوں کے خلاف ہونے والی ہر جدوجہد کی حمائت کی تو ٹرومین نے یونان، ویت نام اور دوسری سبھی جگہوں پر جوابی بغاوتوں کا ساتھ دیا۔ پھر نہرو بلاکوں کی صورت میں چاہے وہ "آزاد ملکوں" کا سرمایہ دارانہ بلاک ہو یا کمیونسٹ بلاک، دنیا کی تقسیم کے سخت مخالف تھے۔

ٹرومین اور ان کے مشیروں نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی قیادت میں "آزاد دنیا" کی حمائت حاصل کرنے کے لئے جہاد چھیڑ رکھا تھا۔ امریکی انتظامیہ اور اخبارات کا کہنا تھا کہ جو ملک ان کے ساتھ نہیں وہ ان کے مخالف ہیں اور جن غیر کمیونسٹ ریاستوں نے "آزاد بلاک" میں شامل ہونے سے انکار کر دیا انہیں یہ سمجھا گیا کہ "وہ کھلے یا ڈھکے طور پر کمیونسٹ بلاک کے مقاصد کو استحکام پہنچا رہی ہیں"۔ اس طرح کا پرچار امریکی عہدیداروں نے بھی کیا اور نیویارک ٹائمز جیسے اہم اخبارات نے بھی۔ نظریات کی اس عظیم جدوجہد میں ڈلز نے "آزاد دنیا" سے وابستگی کے ہندوستان کے انکار کو "اخلاق سوز" قرار دیا۔ جواہر لال نہرو جب فوجی گٹھ جوڑوں کی مذمت کر رہے تھے تو ٹرومین نے ناٹو کا کنبہ جوڑا اور اس وقت جب جارج کینن کے الفاظ میں "ناٹو کو وجود میں لانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں تھی"۔

جن لوگوں پر امریکہ کی پالیسی بنانے کی ذمہ داری تھی ان کے نزدیک ہندوستان کو اپنی طرف رکھنا زبردست اہمیت کا حامل تھا۔ ۷ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو امریکی سفیر ہنری ایف۔ گریڈی نے اس کا صاف صاف اعلان کیا تھا۔ ہندوستان کے بارے میں امریکہ کی پالیسی پانچویں دہائی کے اواخر میں اگرچہ تشکیل کے مرحلے پر تھی، پھر بھی اس کے خدوخال ابھرنے سے لگے تھے۔ اس کا بنیادی مقصد

یہ تھا کہ بین الاقوامی معاملات میں ہندوستان کے موقف پر اثر انداز ہوا جائے، خاص طور سے ان حالات میں جب امریکہ ایک سوویت مخالف بلاک بنا رہا تھا اور ساتھ ہی افریقہ اور ایشیا کی تحریک آزادی کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہندوستان کی اہمیت صرف یہی نہیں تھی کہ وہ پاکستان سمیت پورے یورپ کے برابر ہے اور آبادی کے اعتبار سے ایک بہت بڑا ملک ہے بلکہ اس لئے بھی تھی کہ عالمی امور میں وہ جو موقف اختیار کرتا ہے اس سے ایشیا کے دوسرے ملکوں کے موقف پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔

جواہر لال نہرو نے یہ بات بالکل صاف کر دی تھی کہ عالمی امور میں ہندوستان سرگرمی کے ساتھ حصہ لے گا اور ایک ایسی آزاد پالیسی اپنائے گا جو اس کے قومی مفادات سے مطابقت رکھتی ہو۔ لیکن کسی بھی قوم کی خارجہ پالیسی ایک دن میں وجود میں نہیں آجاتی۔ اس کی عمومی سمتیں نہرو کے ذہن میں واضح تھیں اور اسے انہوں نے اینٹ سے اینٹ جوڑ کر ایک محل کی صورت دینے کی کوشش کی۔ جب وہ اس ارادے کے ساتھ عمل کے میدان میں اترے تو ان کا ٹکراؤ وہائٹ ہاؤس سے ہوا۔ نہرو نے بڑی جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا تھا کہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اپنی خارجہ پالیسی کے سلسلے میں امریکی کتنے احمق ہیں۔ یہ جو ان کی گاڑی چل رہی ہے تو اس کی وجہ نہ ان کی ذہانت ہے، نہ کوئی اور خصوصیت، بلکہ محض ان کی طاقت اور ان کا اقبال ہے۔

لیکن پانچویں دہائی کے اواخر تک یہ صورت رہی کہ سیاسی لحاظ سے ہندوستان کی اہمیت کے احساس کے باوجود کومنتانگ کے چین اور جاپان پر امریکہ زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ اس دور میں ہندوستان سے متعلق امریکی پالیسی یہ تھی کہ دلی کی خارجہ پالیسی کی تشکیل پر اثر انداز ہونے کے لئے زیادہ سے زیادہ معاشی اور سیاسی دباؤ ڈالا جائے۔ لیکن اس کوشش کا الٹا نتیجہ نکلا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے دو برسوں کے اندر اندر ہند امریکی تضادات شدت پکڑنے لگے تھے اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نہرو کی قیادت میں ہندوستان بین الاقوامی معاملات میں اپنے اقتدار اعلے کا استعمال کرنے لگا تھا۔ ۱۹۴۹ء کے اوائل میں ہی امریکہ نے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا تاکہ ہندوستان کو قومی آزادی کی

تحریکوں کی حمائت سے باز رکھا جا سکے. یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو نہرو نے سامراج وادی ہالینڈ کو ملنے والی یوروپی اور امریکی امداد پر کڑی نکتہ چینی کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہالینڈ انڈونیشیا سے نکل جائے اور ہالینڈ کو دی جانے والی ساری مدد روک دی جائے۔

۱۹۴۹ء ہی میں دنیا کو ہلا دینے والا ایک اور واقعہ رونما ہوا' یہ تھا چیانگ کائی شیک سرکار کی شکست جسے امریکہ کی حمائت حاصل تھی۔ "اب جب قوم پرست چین، ہالینڈ اور فرانس ایشیا میں وہ رول ادا کرنے سے صاف طور پر معذور نظر آرہے ہیں جس کی ہم نے ان سے توقع کی تھی تو کس کا سہارا لیا جائے اور کہاں سے حلیف ڈھونڈے جائیں؟" ایسا لگتا ہے کہ ایشیا میں امریکی پالیسی وضع کرنے کے لئے جس بنیادی مسئلے کا حل ضروری تھا' وہ یہی مسئلہ تھا۔ چنانچہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کے زیادہ سے زیادہ ماہر بن یہ بحثیں کرنے لگے کہ ہندوستان اپنی معاشی اور فوجی صلاحیتوں اور امکانات کی وجہ سے ایشیا میں کامیاب امریکی پالیسی کی کنجی بن گیا ہے۔

ایشیا کے امریکی اور برطانوی ماہروں کے درمیان ایک اعلےٰ سطح پر ہونے والے غور و خوض کے بعد جس میں برطانوی وزیر خارجہ بیون اور امریکی وزیر خارجہ ایچی سن بھی شریک تھے یہ طے کیا گیا کہ ہندوستان کو ایشیا سے متعلق امریکی پالیسی کی نشوونما میں بنیادی اہمیت دی جائے کیونکہ ایشیا میں جو نقصان ہوا ہے اسے پورا کرنے کا وسیع امکان اس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ چین میں کمیونسٹوں کی فتح کے بعد یہ کوشش کی جانی چاہیئے کہ پاکستان کو نہیں بلکہ ہندوستان کو امریکہ کی عالمی پالیسی کا ایک اہم عنصر قرار دیا جائے۔

اس فیصلے کے بعد ہی جواہر لال نہرو کو مدعو کیا گیا کہ وہ ۱۱ر اکتوبر تا ۷ر نومبر ۱۹۴۹ء میں امریکہ کا دورہ کریں۔

اس طرح ۱۹۴۹ء کے اواخر میں امریکہ کے پالیسی بنانے والوں کے ذہن میں ایشیا میں ہندوستان کے رول سے متعلق ایک نیا تصور ابھرا جس کے مقاصد کچھ اس طرح تھے:

۱۔ برطانیہ سے لے کر انڈونیشیا تک یورپ اور ایشیا کے ساحلی ممالک

مل جل کر اندر کے ان ممالک کے خلاف کام کریں جو سوویت یونین کے ارد گرد اکٹھا ہو گئے ہیں۔

ب۔ سوویت یونین اور چین کے گرد بحری گھیرا بنانے کے لئے امریکہ کو نہرو کی مدد چاہیئے۔

ج۔ چین میں کمیونزم کے استحکام اور جنوب مشرقی ایشیا میں اس کے بڑھتے ہوئے خطرے کے ساتھ ہندوستان ہی یورپ میں جمہوریت کا مضبوط ترین قلعہ بنتا جا رہا ہے۔

بعض ماہروں نے تو یہاں تک پیش گوئی کی کہ امریکہ ہوائی اڈوں کے لئے رعائت حاصل کرنے کے سوال پر نہرو سے بات چیت کرے گا۔ اس طرح کی خبریں خود برطانیہ کے بعض اخباروں میں شایع ہوئیں مثلاً لندن کا اخبار ڈیلی گرافک۔

ہندوستان کو اس بات پر مجبور کرنے کے لئے کہ وہ ایشیا میں اس طرح کا رول ادا کرے واشنگٹن اور لندن دونوں ہی "کشمیر کا پتہ" استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن نہرو نے پوری ثابت قدمی کے ساتھ ہندوستان کے اقتدار اعلےٰ اور اس کی آزادی کا تحفظ کیا۔ انہوں نے کھلم کھلا کہا کہ ان کی حکومت نے ثالثی کی وہ تجویز یکسر رد کر دی ہے جس کے لئے ٹرومین اور اٹیلی دونوں ہی ان پر دباؤ ڈال رہے تھے اور مستقل مزاجی کے ساتھ اعلان کیا کہ کشمیر سے اس وقت تک ہندوستانی فوجیں واپس نہیں بلائی جائیں گی جب تک اس ریاست کے عوام یہ نہ چاہیں اور حکومت ہند کو اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ اب کشمیر کی سلامتی کو کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوگا۔ انہوں نے ماؤنٹ بیٹن کا یہ مشورہ بھی رد کر دیا کہ مزید رعائتیں دی جائیں۔ اس طرح کشمیر کا مسئلہ ہمیشہ کی طرح الجھا رہا اور غالباً پہلے سے زیادہ تناؤ کا مرکز بن گیا۔ اس کے لئے نہرو نے بڑی حد تک امریکہ کو ذمہ دار ٹھہرایا جس نے بقول ان کے انصاف کے تقاضے پورے نہیں کئے۔ اس سب کے باوجود انہوں نے نہ اپنے دورے کو مسترد کیا اور نہ ملتوی کیا۔

ایسا لگتا ہے کہ جواہر لال نہرو ہندوستان کی معاشی ترقی کے سلسلے میں امریکی مدد کے امکانات کا جائزہ لینا چاہتے تھے اور اس کے خواہش مند بھی تھے۔

لیکن ساتھ ہی اس معاملے میں ان کا ذہن بالکل صاف تھا کہ وہ اس مدد کی یہ قیمت ہرگز ادا نہیں کریں گے کہ ہندوستان کو امریکہ کی خارجہ پالیسی کا دم چھلہ بنا دیں۔ وہ ہندوستان کی طاقت سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور انہوں نے ۲ ر اکتوبر ۱۹۴۹ء کو وزرائے اعلیٰ کے نام لکھے گئے اپنے خط میں کہا:

"ہندوستان کے پاس دینے کو بہت کچھ ہے، سونے یا چاندی کی شکل میں نہیں اور نہ ہی ایسی اشیاء کی صورت میں جو برآمد کی جا سکیں بلکہ اپنی موجودہ حیثیت کی صورت میں۔ آج ساری دنیا میں یہ بات پوری طرح تسلیم کر لی گئی ہے کہ ہندوستان کا مستقبل روز افزوں طور پر ایشیا کا محور بنتا جا رہا ہے۔"

تقریباً اسی کے ساتھ پاکستان میں بھی دور رس واقعات رونما ہونے لگے۔ ۱۹۵۱ء میں جناح کے لائق ترین معتمد لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد اقتدار کا اصل مرکز نہ وزیر اعظم رہ گیا، نہ کابینہ اور نہ ہی پارلیمنٹ۔ اقتدار کی اصل باگ دوڑ سربراہ ریاست کے ہاتھوں میں آگئی اور یوں اکتوبر ۱۹۵۱ء سے ستمبر ۱۹۵۵ء تک غلام محمد اور ان کے بعد ستمبر ۱۹۵۵ء سے ستمبر ۱۹۵۸ء تک اسکندر مرزا اقتدار پر قابض رہے۔ پاکستان میں رونما ہونے والی اس تبدیلی کے ساتھ، برما اور تھائی لینڈ میں بھی ایسی ہی تبدیلیاں آئیں۔ ہر ملک میں فوجی ڈکٹیٹروں کی سرکاریں بنیں جن کے قیام کے سلسلے میں فوج نے فیصلہ کن رول ادا کیا اور ان میں سے ہر ایک موقع پر ان سامراجی حلقوں نے جو بڑھ چڑھ کر جمہوریت کی دہائی دیتے تھے، اخلاقی قدروں کی باتیں کرتے تھے اور جنہیں کلیت پسندی کا نام سن کر ہی گھن آتی تھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔

اس طرح چھٹی دہائی کے اوائل میں امریکہ ایشیا میں نئے حلیفوں کو تلاش کرنے لگا تاکہ چین اور سوویت یونین کی لہر روکی جا سکے۔ پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع، چین سے اس کا متصل ہونا اور ٹھیک روس کے نیچے واقع ہونا ایسے اڈوں کے قیام کے لئے مثالی حیثیت کا حامل سمجھا گیا جہاں سے امریکہ اپنی ریشہ دوانیاں کر سکے۔ امریکی بلاک کی مدد سے پاکستان کشمیر میں کچھ کر سکتا تھا۔ چنانچہ پاکستان میں امریکہ کی فوجی مدد کا خیر مقدم کیا گیا اور اس نے سرد جنگ کی قربان گاہ پر اپنی

غیر جانبداری اور ناوابستگی قربان کردی۔ امریکہ کے ساتھ دفاعی گٹھ جوڑ کے ایک جزو کے طور پر فوجی امداد کا جو پروگرام بنا اس سلسلے میں تقریباً ساری بات چیت ایوب خاں نے کی جو جنوری ۱۹۵۱ء سے پاکستانی افواج کے کمانڈر انچیف تھے۔ نہرو نے پاکستانی فیصلے کی مذمت کی اور محمد علی کو متنبہہ کیا کہ امریکی مدد عدم عسکریت بندی اور کشمیر کے حل میں رکاوٹ بن جائے گی۔ انہوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ امریکہ کے ساتھ پاکستان کا گٹھ جوڑ ریاستوں کے ناوابستہ گروہ کی جغرافیائی مواصلت کو ختم کردے گا اور ایشیا میں بقول ان کے "جنگ سے پاک علاقے" کی سالمیت مٹی میں مل جائے گی۔

امریکہ کے ہاتھوں پاکستان کی عسکریت بندی نے ہندوستان کی سلامتی کے لئے زبردست خطرہ پیدا کر دیا۔ اس کے دو مقاصد تھے۔ اول تو یہ کہ مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں سوویت یونین یا چین کی پیش قدمیوں کے خلاف متوقع طور پر استعمال کئے جانے کے لئے ایک مقامی ایشیائی بری فوج وجود میں لے آئی جائے اور دوسرے جیسا کہ رچرڈ نکسن نے (جو اس وقت امریکہ کے نائب صدر تھے) دسمبر ۱۹۵۳ء میں کراچی میں کہا تھا' نہرو کی غیر جانبداری کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک فائدہ مند قوت کو وجود میں لاکر اس علاقے میں ہندوستان کی طاقت اور اس کے اثرات پر لگام لگائی جائے۔ چارلس این۔ ہیمستھ کے الفاظ میں "موخر الذکر مقصد کسی حد تک پورا بھی ہوا کیونکہ امریکی ہتھیاروں نے برصغیر میں طاقت کے توازن میں ایک غیر فطری اور دھماکہ خیز تبدیلی پیدا کر دی۔"

۱۹۵۴ء میں فیصلہ کن قدم اٹھانے' پاکستان کو فوجی طور پر مضبوط کرنے اور فوجی گٹھ جوڑ میں اسے شامل کرنے سے پہلے امریکی محکمہ خارجہ نے قدرے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ مگر بات چیت کے حتمی دور کے لئے پاکستان کے جو فوجی لیڈر واشنگٹن میں موجود تھے انہوں نے میکارتھی ازم کی اس فضا سے جو وہاں چھائی ہوئی تھی فائدہ اٹھایا اور اخباروں کو یہ بات بتادی کہ اگرچہ پاکستان کمیونزم کے خلاف امریکہ کے ساتھ فوجی اشتراک میں حصہ لینے کیلئے تیار ہے مگر امریکی محکمہ خارجہ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ محکمے پر پہلے ہی یہ الزام لگایا جارہا تھا کہ وہ کمیونزم کے ساتھ نرمی برت رہا ہے۔ اس

خبر نے اسے بوکھلا دیا اور فوراً سمجھوتہ کر لیا گیا۔ پاکستان کے سلسلے میں ہچکچاہٹ کا یہ اکیلا واقعہ نہیں۔ ابتداء میں امریکہ اسے سیٹو میں بھی شامل نہیں کرنا چاہتا تھا مگر جب فوجی ساز و سامان کی فراہمی کا سلسلہ شروع ہو گیا تو رفتہ رفتہ محکمۂ دفاع اور امریکی کانگریس میں ایک مضبوط پاکستان نواز لابی بن گئی۔ اس حلقے نے ہر ایسے قدم کی جم کر مخالفت کی جس سے پاکستان کے مفادات پر چوٹ پڑ سکتی تھی۔

فوجی سمجھوتہ ۱۹۵۴ء میں ہوا جب امریکہ یو۔ ۲ جاسوسی ہوائی جہازوں سے کام لینے کی تیاری کر رہا تھا مگر اس کے اڈے ۱۹۵۶ء کے ارد گرد جا کر تیار ہوئے ہوں گے۔ بہر حال اس کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ امریکہ نے یو۔ ۲ ہوائی جہازوں کی باقاعدگی کے ساتھ پرواز کے لئے پاکستان کے کسی اڈے کا استعمال کب سے شروع کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ سوویت یونین کے پورے علاقے کی تصویر اتارنے کے لئے مسلسل پروازوں کی ضرورت پڑی ہوگی اور ان پروازوں کو اتنی اہمیت دی گئی تھی کہ تصویر کشی کی ہر مہم شروع کرنے سے پہلے ذاتی طور پر امریکی صدر سے اجازت لی جاتی تھی۔ پاکستانی رہنماؤں نے یقیناً محسوس کر لیا ہوگا کہ سوویت یونین کے خلاف فضائی جاسوسی کی غرض سے اپنے علاقے کے مسلسل استعمال کی اجازت دے کر وہ بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے امریکہ سے ٹھوس ضمانت حاصل کرنی چاہی کہ اگر جاسوسی کے اس کام میں ملوث ہونے کی بناء پر پاکستان پر کوئی آفت ٹوٹے تو وہ اس کی پوری مدد کرے گا۔ یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان ۵ رمارچ ۱۹۵۹ء کو ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت امریکہ نے یہ تسلیم کیا کہ پاکستان کی آزادی اور سالمیت خود اس کے بنیادی مفادات کا معاملہ ہے۔ ساتھ ہی اس نے یقین دلایا کہ "پاکستان پر حملے کی صورت میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت مسلح افواج کا استعمال سمیت ایسے مناسب اقدامات کرے گی جو باہمی طور پر طے کئے جائیں گے۔" غالب امکان اس کا ہے کہ یو۔ ۲ کی پروازیں اسی زمانے میں شروع کی گئی ہوں جس زمانے میں یہ معاہدہ ہوا ہے (ویسے بعد میں ڈرامائی حالات میں انہیں بند کرنا پڑا) مئی ۱۹۶۰ء میں جب سوویت علاقے پر پرواز کرنے والا ایک یو۔ ۲ ہوائی جہاز مار گرایا گیا تو صدر آئزن ہاور نے ان پروازوں کو ملتوی

کر دیا۔ مگر امریکہ پاکستان میں اپنے اڈے کو الیکٹرونک آلات کی مدد سے خفیہ معلومات حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتا رہا۔

سیٹو کا نشانہ بنیادی طور پر عوامی جمہوریہ چین تھا۔ لیکن سیٹو میں شامل ہونے کے فوراً بعد پاکستان نے ۱۹۵۵ء میں چین کے وزیر اعظم چو این لائی کو یقین دلایا کہ وہ چین کے خلاف نہیں ہے اور اسے یہ بات ہرگز نہیں سوچنی چاہیئے کہ وہ اس کے خلاف جارحیت کی اجازت دے گا۔ یہ رویہ کچھ ڈھلمل یقینی کا تھا۔ پاکستان چین کا مخالف نہ تھا مگر سیٹو کے رکن کے طور پر اس نے اپنے فرائض سے پہلو تہی بھی نہیں کی بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ وقت آیا تو اس نے سیٹو سے وفاداری کا مظاہرہ بھی کیا۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں لاؤس کے بحران کے دوران سیٹو کی ایک میٹنگ میں پاکستان نے اس بات پر متفق ہو کر امریکہ کو خوش کر دیا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ اپنی مسلح افواج میدان میں اتار دے گا۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر، مگر حقیقت یہ ہے کہ سیٹو کا اصل نشانہ چین نہیں تھا سوویت یونین تھا۔

۱۹۶۲ء کے ہند چین ٹکراؤ نے پاکستان کی پالیسی ڈرامائی طور پر اس لحاظ سے بدل دی کہ چین پاکستان تعلقات واضح طور پر ترقی پانے لگے۔ خیر اس مسئلے پر ہم آگے چل کر بات کریں گے۔ تاہم یہ بتانا ضروری ہے کہ یہی وہ دور ہے جب پاکستان نے ہندوستان کے کچھ ایسے علاقوں سے متعلق جو فوجی لحاظ سے اہمیت کے حامل تھے اور جنہیں ہندوستان، چین اور پاکستان کے درمیان متنازعہ فیہ سمجھا جاتا تھا چین کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔

اس کے بعد ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ ہوئی۔ ۱۹۶۵ء میں رن آف کچھ میں جو جھڑپیں ہوئیں انہوں نے اس بات کے ٹھوس ثبوت فراہم کر دیئے کہ پاکستان کو جو امریکی ہتھیار دیئے گئے ہیں، انہیں ہندوستان کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ بات ان یقین دہانیوں کے قطعی برعکس تھی جو ۱۹۵۴ء میں آئزنہاور نے ہندوستان کو دی تھیں۔ صورت حال کچھ اس طرح تھی کہ ایک بار ہتھیار دینے کے بعد ان کے استعمال پر امریکہ کا کوئی کنٹرول باقی نہیں رہتا۔ ۱۹۶۹ء میں بیرونی تعلقات کی سنیٹ کی کمیٹی میں بیان دیتے ہوئے جان کے۔ گلبرتھ نے جو ہندوستان میں امریکہ کے سفیر رہ چکے تھے، یہ الزام لگایا کہ امریکی

ہتھیاروں کی فراہمی نے پاکستان میں برتری کا احساس پیدا کر دیا جس کے بغیر وہ طاقت کے بل پر کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ انتہائی ترقی یافتہ اسلحوں کی افراط نے پاکستان میں ضرورت سے زیادہ اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کو ڈلیز کی پالیسی کا ایک تلخ نتیجہ قرار دیا۔ امریکی محکمۂ خارجہ اپنی پالیسی کے اس تجزیئے کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس نے یہ دلیل دی کہ یہ جنگ صدیوں پرانی نفرت کا نتیجہ تھی اور اسے امریکی اسلحوں کی فراہمی سے جوڑنا غلط ہوگا۔ وزارت خارجہ کا نقطۂ نظر کمیٹی میں وزیر خارجہ رابرٹ میکنمارا نے خود پیش کیا۔ لیکن آزاد امریکی مبصروں اور مشاہدین نے گلبرتھ کی رائے کا وزن محسوس کیا۔ اس طرح کے اشارے کئے گئے کہ ۱۹۶۲ء کے ہند چین ٹکراؤ کے بعد ہندوستانی افواج کی جدید کاری کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس کے ہاتھوں یقینی طور پر برصغیر میں طاقت کا توازن پاکستان کے ہاتھ سے نکل جاتا اور اسی لئے وہ یہ چاہتا تھا کہ اس سے پہلے ہی وہ اسلحوں کے معاملے میں اپنی "برتری" کا استعمال کر لے۔

۱۹۶۵ء کے ہند پاک ٹکراؤ کے بعد واشنگٹن نے سرکاری طور پر دونوں ملکوں کو ہتھیاروں کی فراہمی روک دی۔ لیکن پاکستان کے سلسلے میں یہ پالیسی اچانک لیکن بڑی خوشی کے ساتھ بدل دی گئی اور ۱۹۶۷ء سے امریکہ پاکستان کو امداد کے طور پر اسلحے فراہم کرنے لگا۔

نئی گائڈ لائن کے تحت ۱۹۷۰ء کے اکتوبر میں امریکہ نے پاکستان کے ہاتھ ہتھیار بیچنے کا فیصلہ کیا۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق جو فروختنی ہتھیار تھے ان میں دہرے جٹ بی۔۵۷ کینبرا بمبار، ایف۔۱۰۴ جٹ لڑاکا ہوائی جہاز اور مسلح افواج کو لانے لے جانے والے جہاز شامل تھے۔ سپلائی کئے جانے والے مال کی مجموعی قیمت اندازے کے مطابق ایک کروڑ ۴۰ لاکھ سے ۴ کروڑ ڈالر تک تھی۔ محکمۂ خارجہ کے وسائل نے یہ کہا کہ یہ تو "لگائی گئی پابندی میں محض ایک بار کی خصوصی چھوٹ ہے" "کوئی ایسی بات نہیں کہ "باقاعدہ سالانہ فوجی سپلائی کا گیٹ کھول دیا گیا ہو۔" ہمیشہ کی طرح یہ دعویٰ کیا گیا کہ ہتھیاروں کی فراہمی سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان طاقت کا موجودہ توازن ختم

نہیں ہوگا۔ ابھی سپلائی کا یہ سلسلہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے سوال پر ایک بار پھر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ایک بار پھر امریکہ نے اور زیادہ کھل کر پاکستان کی حمائت کی۔

۳ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان نے ہندوستان کی فضائی طاقت تہس نہس کر دینے کی غرض سے اسرائیلی طرز کا حملہ کیا۔ پانچ دن بعد اس نے امریکہ سے انتہائی بوکھلاہٹ کے ساتھ اپیل کی کہ وہ ہتھیاروں اور گولہ بارود سے اس کی مدد کرے۔ ہندوستان کو واشنگٹن میں اپنے سفارت خانے کے ذریعے یہ خبر ملی کہ نکسن سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ باہمی سلامتی کے جس ایکٹ پر ۱۹۵۴ء میں دستخط ہوئے تھے اس کی آڑ لے کر پاکستان کی مدد کے لئے میدان میں کود پڑیں۔ دلی کے ایک عام جلسے میں اندرا گاندھی نے ایک جوشیلی تقریر کی اور صاف صاف لفظوں میں امریکہ کو وارننگ دی۔ "میں نے سنا ہے کہ بعض ممالک ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ ان کے بعض سمجھوتے اور معاہدے ہیں۔ مجھے یہ بات پہلے نہیں معلوم تھی کیونکہ جہاں تک میں جانتی ہوں پہلے کا جو بھی معاہدہ تھا وہ کمیونزم کے خلاف ایک پیکیٹ کی کڑی بتایا گیا تھا۔ یہ پیکیٹ جمہوریت سے لڑنے کے لئے نہیں تھا' نہ یہ انصاف کی آواز کے خلاف تھا۔ اس کا مطلب غریبوں کو کچلنا بھی نہیں تھا۔ لیکن اگر اس کا مقصد یہ سب کچھ تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے دنیا کے سامنے جھوٹ بولا تھا۔" ان کے پاس خاصے حقائق موجود تھے جس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ برصغیر ہندوستان کو 'ویت نام بنانے' کی پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ امریکی حکومت کے اس اعتراف کے باوجود بھی کہ امریکہ کے ایف۔ ۸۶ ہوائی جہاز' امریکی ٹینک اور دوسرے ہلاکت آفریں ہتھیار بنگلہ دیش کی تحریک کچلنے کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں' ہتھیاروں کی فراہمی کا سلسلہ جاری رہا۔ پناہ گزینوں سے متعلق سنیٹ کی سب کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے جنرل اکاؤنٹنگ آفس نے جو امریکی کانگریس کی نگراں کمیٹی ہے' یہ اعتراف کیا کہ امریکی طیارے ترجیحی بنیاد پر جولائی ۱۹۷۱ء میں ۵ لاکھ ڈالر کی قیمت کے ہوائی جہاز کے پرزے پاکستان پہنچاتے رہے ہیں۔

اسی زمانے میں اسی کمیٹی کے سامنے ایڈورڈ کینڈی نے پاکستان کے ہاتھوں ہتھیاروں کی فروخت سے متعلق دو دستاویزیں پیش کیں۔ ایک دستاویز پر کرنل ایل۔ جی۔ ایم ہل نے دستخط کئے تھے جس کے مطابق بی۔ ۵۷ بمباروں، سی۔ ۱۵۰ ٹرانسپورٹ جہازوں، ایف۔ ۱۰۴ اسٹار فائٹر جہازوں، سیبرے جٹوں، ایچ۔ ۳۴ ہیلی کوپٹروں، ٹی۔ ۳۳ اور ٹی۔ ۵۷ تربیت کار جہازوں کے فالتو پرزے فراہم کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ دوسری دستاویز پر امریکی بحریہ کے کیپٹن سی۔ بی۔ ایڈمس نے دستخط کئے تھے جو کارتوسوں اور بحری سرنگوں کے بارے میں تھی۔

ٹائمز میں چھپی ایک خبر کے مطابق ۲۲ جون ۱۹۷۱ء کو پاکستان کا بحری جہاز ایس ایس پدما نیویارک سے کراچی کی طرف روانہ ہونے کے لئے پر تول رہا تھا جس پر ۸ ہوائی جہاز، پیراشوٹ، ٹنوں فالتو پرزے اور دوسرے اجزاء لدے ہوئے تھے جو ہوائی جہازوں اور فوجی گاڑیوں کے لئے تھے اور جن کی مالیت ۲۲ لاکھ ڈالر کے برابر تھی۔ اس کے بعد سندربن، رنگ متی، شاہ آباد، ملتان اور الحسن نامی بحری جہازوں نے بھی یہ کام انجام دیا۔

اس طرح واشنگٹن نے بنگلہ دیش کے بحران کو ہوا دینے اور ایسی صورت حال پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔

واقعہ تو یہ ہے کہ امریکہ نے ہندوستان کے خلاف کسی اعلان کے بغیر جنگ پہلے ہی چھیڑ رکھی تھی۔ جنرل یحییٰ خاں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے پانچ دن پہلے ہندوستان کو 'حملہ آور' قرار دے کر نکسن نے ہتھیاروں سے بھرے ہوائی جہاز پاکستان بھیج دیئے تھے۔ وہائٹ ہاؤس نے ہندوستان کو اشتعال دلانے کے لئے ۲۹ نومبر ۱۹۷۱ء کو بڑی جلد بازی کے ساتھ ہتھیار روانہ کئے۔ امریکی فضائیہ کا ایک ٹرانسپورٹ ہوائی جہاز کسی گمنام جگہ سے بڑی خاموشی کے ساتھ کراچی بھیجا گیا۔ کراچی کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی ہندوستانی فضائیہ نے اسے دیکھ لیا۔ جب ہتھیاروں کی اس پوشیدہ فراہمی کی خبر ہندوستانی افواج کے صدر دفاتر میں پہنچی تو جنرل مانک شا نے نئی دلی میں امریکہ کے فوجی اتاشی کرنل ولیم کنگ کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور سخت احتجاج کیا۔

ادھر خود نکسن بھی سخت غیض و غضب کی حالت میں تھے۔ پہلے تو انہوں

نے ہندوستان کو وارننگ دی، پھر ساتویں بحری بیڑے کو جس کی قیادت نیوکلیائی
طاقت سے چلنے والا طیارہ بردار جہاز انٹرپرائز کر رہا تھا خلیج بنگال میں داخل ہونے
کا حکم دے دیا۔ اس طرح کی خبریں بھی ہیں کہ واشنگٹن کے خصوصی ایکشن گروپ
نے جو قومی سلامتی کونسل کی ایک کمیٹی ہے ۸ دسمبر کو اس پر بھی غور کیا تھا کہ کچھ
طیارے اردن سے پاکستان منتقل کر دیئے جائیں۔

سیٹو بہت کچھ اپنی اہمیت کھو چکا تھا اس کے باوجود جب ۷ نومبر ۱۹۷۲ء
کو پاکستان نے سیٹو سے الگ ہونے کی اطلاع دی تو امریکہ نے مارچ ۱۹۷۳ء میں
یہ اعلان کر دیا کہ اس نے پاکستان کو ہتھیاروں کی فراہمی دوبارہ شروع کر دینے
کا فیصلہ کر لیا ہے۔

ساتھ ہی ہندوستان کو یہ میٹھی گولی بھی دی گئی کہ اگر وہ چاہے تو ۹ کروڑ ۱۰ لاکھ
ڈالر کی مالیت کے مواصلاتی آلات خرید سکتا ہے اور ۸ کروڑ ۷۶ لاکھ ڈالر کی معاشی
مدد لے سکتا ہے۔ پاکستان کو ہتھیار کی فراہمی کا یہ فیصلہ کہیں زیادہ وسیع پالیسی
کی ایک کڑی کے طور پر کیا گیا تھا جس کے تحت پاکستان کا قریب ترین
پڑوسی ملک ایران نیز خلیجی علاقے کے دوسرے ممالک امریکہ سے ہتھیاروں کی
زبردست مقدار حاصل کر رہے تھے۔ یہ دعویٰ ان حالات میں بیحد اہمیت اختیار
کر گیا کہ امریکہ پاکستان کو ہتھیار "دے نہیں رہا ہے" بلکہ اس کے ہاتھ مقابلے
"بیچ رہا ہے۔" اس کے معنی یہ تھے کہ امریکہ اسلحہ بیچنے کے حق سے دستبردار اور ان کے
لئے تیار نہیں ہے۔ خبروں کے مطابق پاکستان نے ہر سال ۲ کروڑ ڈالر اس صلاحیت کا
ڈالر تک کے اسلحے خریدے جن میں بیشتر فالتو پرزے اور موا امریکہ کی دلچسپی بھی کئی گنا
تھے۔ یہ اعداد و شمار امریکی وسیلوں سے ملے تھے جو ہمیشہ ۶ء میں ختم ہونے والے مالی سال
کہ جو ہتھیار مہیا کئے گئے ہیں وہ دفاعی نوعیت کے کی مالیت کے ہتھیار فروخت کئے
جب امریکی محکمۂ دفاع نے "بیرونی ملکوں ایشیا کے ہاتھ بیچے گئے۔ تنہا ایران نے
کی پوری فہرست عوام کے سامنے پیش کی ہے" کیا۔ ساتھ ہی واشنگٹن نے خریدار
پاکستان کو ایچ ایچ - ۳۴ بی سے اتیات کی تعمیر کے سلسلے میں بھی معاہدے کئے۔
مدد فراہم کرنے کا معاہدہ کیا تھا کہ وہ ان ہتھیاروں اور آلات کی مرمت وغیرہ کے
جس کی مالیت ۴۷۵۰۹ ڈالر۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے جنہوں نے امریکہ کو اس طرح کا فیصلہ کرنے پر مجبور کیا اور اس حد تک کہ ہندوستان کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کے عمل کو بھی اس کے لئے قربان کر دیا گیا؟ ایک دلچسپ جواب ولیم سکسبی فراہم کرتے ہیں جنہیں اس زمانے میں ہندوستان میں امریکہ کا سفیر مقرر کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ بنگ کاک میں تھے اور جلدی ہی اپنے نئے عہدے کی ذمہ داریاں سنبھالنے جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔ "اس بار امریکی عوام کا رویہ یہ ہے کہ ہندوستان اپنی فکر آپ کرے خود ہمارے مسائل بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔" نامزد سفیر کا اندازہ یہ تھا کہ امریکہ نے پاکستان کے ہاتھ ہتھیار بیچنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس کے پس پشت اس امید کا ہاتھ ہو سکتا ہے کہ اس طرح اپنے معاشی اور توانائی سے متعلق مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ چند ہفتوں بعد سکسبی نے واشنگٹن پوسٹ کو بتایا کہ توانائی اور معیشت امریکہ کے دو سب سے اہم مسئلے ہیں اور ان دونوں کے قابل اطمینان حل کی تلاش کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اسلحے کی فراہمی پر لگی روک اٹھانے کے سلسلے میں اپنے تاثرات دیتے ہوئے کچھ ایسا لگا کہ وہ کسی حد تک ہندوستان کو اس کے لئے ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ انہوں نے تبصرے کے دوران کہا تھا کہ "اچھا زمانہ ہو یا خراب زمانہ ہندوستان نے اپنا رویہ کبھی نہیں بدلا۔ اس لئے اگر واشنگٹن یہ کہہ رہا ہے کہ بھاڑ میں جاؤ! کرنا ہے تو کرو اور نہیں کرنا تو نہ کرو" تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ سکسبی کو اس ملک میں آئے چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ ہندوستانی اخبارات نے ہند امریکی تعلقات کے مسئلے پر ایک منفی رویہ اختیار کرنے کے سلسلے میں ان پر خاصی لے دے کی۔ بہر حال ہند امریکی تعلقات کی نوعیت کے بارے میں سکسبی کے خیالات سے اختلاف کیا جائے یا نہ کیا جائے یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ امریکہ نے ہندوستان کی طرف سے اعتراض کے باوجود پاکستان کو اسلحہ فروخت کرنے کا جو فیصلہ کیا وہ اس بات کا اشارہ تھا کہ امریکہ کی نظر میں پاکستان کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور اب امریکہ کے لئے اس کی قدر و قیمت صرف جنوبی ایشیا تک محدود نہیں رہی ہے۔

امریکہ نے اپنے منصوبوں کے سلسلے میں پاکستان کو اتنی اہمیت دینے کا فیصلہ کیوں کیا، اس کا جواب خود پاکستان کے اندر تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ

کے بعد کچھ ہی دنوں کے اندر اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اندرون ملک کی سامراج دشمن قوموں کو کچلنے کی پوری طاقت رکھتا ہے۔ بھٹو کو پھانسی دی گئی۔ ان کی پارٹی کو کچل دیا گیا۔ اسلام آباد نے معیشت بالخصوص برآمدات کے معاملے میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ علاقے کے لحاظ سے سمٹ جانے کے باوجود وہ ایک اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی خاص طور پر مغربی ایشیا کے تعلق سے خاصی کامیاب رہی۔ اس خطے کے متعدد رجعت پرست ملکوں کے ساتھ اس کے پرتپاک تعلقات قائم ہو گئے جنہیں مشترکہ مذہب کے رشتے نے اور زیادہ مضبوط بنا دیا۔ سعودی عرب کے ساتھ خصوصاً پاکستان کے رشتے بہت گہرے ہو گئے۔ اسی طرح شہنشاہ ایران کے ساتھ بھی خصوصی تعلق قائم ہوا۔ تیل کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے جو دشواریاں پیدا ہوئی تھیں ان پر قابو پانے کے سلسلے میں پاکستان کو خاصی معاشی مدد مل گئی۔ خلیج کے علاقے کے ممالک کو اپنے پٹرو ڈالر کی روز افزوں رقم سے جو سرمایہ مل رہا تھا اسے انہوں نے امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں کی مدد سے اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کرنے کے لئے جم کر خرچ کیا۔

ان میں سے کئی ملک ایسے تھے جنہیں تربیت کی سہولیات فراہم کرنے کی پاکستان طاقت رکھتا تھا، کچھ ایسے ملک بھی تھے جن میں اس نے خود اپنے لوگوں کو ہوا بازی کی خدمت انجام دینے کے لئے بھیج دیا۔ خطے کے بہت سے ملکوں کے مقابلے میں پاکستان معاشی اور ٹکنولوجیکل صلاحیت کے لحاظ سے برتر ہے اور ان کے ساتھ گہرے رشتے قائم کرنے کے لئے بڑی فراخ دلی کے ساتھ اس صلاحیت کا استعمال کر رہا ہے۔ تیل کے بحران کے ساتھ مغربی ایشیا میں امریکہ کی دلچسپی بھی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں جون ۱۹۷۴ء میں ختم ہونے والے مالی سال کے دوران امریکہ نے لگ بھگ ۸ء۲ ارب ڈالر کی مالیت کے ہتھیار فروخت کئے جن میں ۷ ارب ڈالر کے ہتھیار مغربی ایشیا کے ہاتھ بیچے گئے۔ تنہا ایران نے ۴ ارب ڈالر کے ہتھیار خریدنے کا معاہدہ کیا۔ ساتھ ہی واشنگٹن نے خریدار ملکوں سے عملے کی تربیت اور سہولیات کی تعمیر کے سلسلے میں بھی معاہدے کئے۔ پاکستان اس پوزیشن میں تھا کہ وہ ان ہتھیاروں اور آلات کی مرمت وغیرہ کے سلسلے میں ایک مرکز بن سکے۔

افغان انقلاب کے فوراً بعد اس خطے میں پاکستان کے رول کے بارے میں امریکہ کے تصور میں ایک اور تبدیلی آئی۔ اب امریکہ کی جغرافیائی سیاسی حکمت عملی میں اسے دوسرے تمام ملکوں سے کہیں زیادہ رکنیت حاصل ہوگئی۔ حد یہ ہے کہ شاہ کے زمانے کا ایران بھی اس معاملے میں اس سے پیچھے چلا گیا۔

اس پس منظر میں فرانسس فیوکیویاما نے رینڈ کارپوریشن کے لئے ستمبر ۱۹۸۰ء میں ایک رپورٹ تیار کی جس کا عنوان تھا 'پاکستان کی سلامتی'۔ پاکستان کو خلیج سے متعلق امریکہ کی مجموعی حکمت عملی میں ایک بنیادی رول سونپا گیا۔ امریکہ اور پاکستان کے درمیان سلامتی سے متعلق گہرے تعلقات کی وکالت کرتے ہوئے فیوکیویاما نے ان فوائد کی فہرست تیار کی جو اس طرح امریکہ کو حاصل ہوں گے۔ یہ بتاتے ہوئے کہ اس طرح پاکستان کے سوویت یونین کے ساتھ چلے جانے کی صورت میں جو منفی اثرات پڑ سکتے ہیں ان سے بچا جا سکتا ہے اور امریکہ پر اعتماد بحال کیا جا سکتا ہے نیز اس کا وقار بڑھایا جا سکتا ہے، فیوکیویاما کی رپورٹ میں تین مزید فوائد کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلا فائدہ اس طرح ہے۔ "امریکہ اس وقت تیزی کے ساتھ حرکت میں آنے والی فوج تیار کر رہا ہے تاکہ تیل کے علاقے تک مغرب کی رسائی محفوظ رکھی جا سکے ___ مشرق سے یعنی ڈیگو گارشیا یا جزائر فلپائن سے اس برق آسا فوج کو خلیج فارس کے علاقے میں لانے کے سلسلے میں پاکستان انتہائی اہم وسیلہ بن سکتا ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ مصر، صومالیہ، کینیا، ڈیگو گارشیا اور اومان میں فوجی اڈوں کا ایک پورا سلسلہ کھڑا کر دینے کے باوجود بحیرۂ عرب کے شمالی حصے میں برق آسا فوج کو ایسی سہولیات حاصل نہ تھیں کہ وہ آبنائے ہرمز پر اپنا غلبہ قائم کر سکے۔ چاہ بہار (ایران) بحری اڈے سے محرومی کی تلافی کراچی اور گوادر کی بندرگاہوں سے کی جا سکتی تھی۔ اسی طرح کی وکالت ایڈمیرل تھومس مورر نے بھی کی تھی جو کسی زمانے میں جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے چیئرمین تھے۔ "اسٹریٹیجک ریویو" نامی رسالے میں اپنے ایک مضمون میں انہوں نے لکھا تھا کہ پاکستان میں بحری اڈے بنائے جائیں اور پیشاور کے ہوائی اڈے کو بھی استعمال کیا جائے۔

گہرے پاک امریکی تعلقات کے معاملے میں جو دوسرا اہم فائدہ فیوکیویاما کو

نظر آیا وہ یہ تھا کہ اس سے امریکہ کو افغان باغیوں تک براہ راست مدد پہنچانے میں آسانی ہو گی اور اس طرح سوویت وسائل اور توجہ کو افغانستان میں اور یورپ جیسے علاقوں سے دور الجھائے رکھا جاسکے گا جو امریکہ کے لئے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ فیوکیویاما نے آخر میں یہ مشورہ دیا تھا کہ پاکستان کی جو فوج اور اس کے مختلف دستے خلیجی ریاستوں میں مقیم ہیں انہیں "خلیج فارس میں جنگ کی صورت میں امریکہ کی طرف سے لڑنے کے لئے" استعمال کیا جاسکتا ہے۔

فیوکیویاما کا مشورہ یہ تھا کہ پاکستان کو "اس کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے" بشرطیکہ امریکہ یہ ذمہ داری قبول کرے کہ "اس فیصلے کے جو نتائج ہوں گے ان سے پاکستان کو محفوظ رکھنے کے لئے وہ ہر قدم اٹھائے گا۔" ایسا لگتا ہے کہ ریگن سرکار نے ان سفارشات کو منظور کر لیا ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ افغانستان کی صورت حال جتنی مستحکم ہوتی جا رہی ہے، واشنگٹن، بیجنگ اسلام آباد گٹھ جوڑ کی طرف سے وہاں کے حالات میں عدم استحکام پیدا کرنے کی کوششیں اتنی ہی دو چند ہوتی جا رہی ہیں۔ کابل کا کہنا ہے کہ پچھلے سال اگست کے پہلے ہفتے میں افغان باغیوں کے چند سردار بیجنگ گئے تھے تاکہ "اور بہتر تال میل" پیدا کیا جاسکے۔ اس کے فوراً ہی بعد دو پاکستانی جنرل وہاں گئے۔ یہ تھے علی اکبر خاں اور اکبر حسین سید۔ اور کچھ ہی دنوں بعد پاکستان کے وزیر خارجہ یعقوب علی خاں نے وہاں کا دورہ کیا۔

یہ دورے اس وقت کئے گئے جب ببرک کرمال کی حکومت نے ملک میں اپنی پوزیشن مضبوط کر لی تھی۔ افغانستان کی صورت حال کے غیر جانبدار مبصروں کا کہنا ہے کہ کرمال حکومت نے سبھی بڑے شہروں پر مضبوط کنٹرول قائم کر لیا ہے۔ بڑھتے ہوئے استحکام کے اور بھی آثار سامنے آئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگرچہ سوویت یونین کے ان دستوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوئی جو افغانستان میں موجود ہیں، صرف ۱۰، ۱۵ فیصد حصے نے فوجی کارروائیوں میں حصہ لیا اور ان میں بھی صرف ۵ سو سپاہی ایسے ہیں جو روزانہ کی کارروائیوں میں استعمال کئے جا رہے ہیں۔

مزید یہ کہ افغان فوج جو ۱۹۸۰ء کے اواخر تک حقیقتاً بکھر کر رہ گئی تھی بتدریج ایک ہم آہنگ صف کی صورت میں دوبارہ منظم ہو گئی ہے۔ یہ کام سپاہیوں کی تنخواہ

بڑھا کر اور ساتھ ہی ایسے تربیت یافتہ افسروں کو شامل کر کے انجام دیا گیا جو جدید ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ آج میدانی فوجی کارروائیوں کا بیشتر کام افغان فوج انجام دے رہی ہے۔ سوویت دستے تقریباً ہمیشہ ہی افغان بری فوج کو فضائی مدد فراہم کرنے کا کام انجام دیتے ہیں اور وہ بھی غیر معمولی حالات میں۔

کئی لحاظ سے حالیہ مہینوں میں ببرک کرمال حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ رہا ہے کہ فوجی لحاظ سے زبردست اہمیت رکھنے والی پنج شیر وادی میں خاصے دنوں سے امن و امان قائم ہے جو اس سے پہلے احمد شاہ مسعود کی باغی ٹولے کی طوفانی سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ مزید یہ کہ کابل کے شمال مشرق میں واقع واخان کی وہ تنگ سی پٹی جو چین سے اسے جوڑتی تھی، پوری طرح بند کر دی گئی ہے۔

ان واقعات نے نیز جس طرح نئی افغان قیادت 'فادر لینڈ محاذ' اور افغان سماج کے دوسرے روائتی اداروں کو سرگرم کر کے اپنی مقبولیت بڑھا رہی ہے اس نے کابل کو قدرتی طور پر ایک نیا اعتماد عطا کیا ہے۔

افغانستان میں رونما ہونے والے اس نئے رجحان نے واشنگٹن، اسلام آباد ٹولی میں بوکھلاہٹ پیدا کر دی ہے اور چینی قیادت بھی اس صورت حال سے خاص پریشان ہے۔

چین کی سرحد پر واقع مشکل سے ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جس کے ساتھ اس کے علاقائی جھگڑے نہ ہوں۔ البتہ پاکستان کی بات دوسری ہے، کیونکہ چین اور پاکستان دونوں ہی نے ہندوستان کی زمین پر ناجائز طور پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ بیجنگ افغانستان کے کوہستانی صوبے بدخشاں کو جو اس کی سرحد پر واقع ہے، ہڑپ کر لینے کا منصوبہ بنا تا رہا ہے۔

اسی لئے صورت حال یہ ہے کہ چینی فوج اور خفیہ ایجنسیوں نے چین افغان سرحد کے ایک ایک چپے کو چھوٹے موٹے فوجی اڈے میں تبدیل کر دیا ہے، حالانکہ اس کا دائرہ ۷۰ کلومیٹر سے زیادہ وسیع نہیں ہے۔

چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ چاروں طرف سے خشکی سے گھرا یہ ملک جنوبی ایشیا میں تخریب کاری کا خاص نشانہ بن گیا ہے۔ پینٹاگن کی سمجھ یہ ہے کہ اگر سوویت یونین کو ایک طرف افغانستان میں اور دوسری طرف کمپوچیا اور

ویت نام میں الجھائے رکھا جائے تو اس کے وسائل زیادہ سے زیادہ ضائع ہوتے رہیں گے اور طاقت ختم ہوتی رہے گی۔ اس کے علاوہ خلیجی ریاستوں اور بحر ہند میں اپنی طاقت بڑھانے کے لئے بھی پینٹاگون افغانستان کو ایک بہانے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔

پاکستان چاہتا ہے کہ ہمارے برصغیر میں چنگاریاں سلگتی رہیں اور آگ بھڑکتی رہے۔ وہ افغانستان کی آڑ میں امریکہ سے ہتھیار حاصل کرنا اور اپنے آپ کو ایشیا میں "محاذ پر واقع ریاست" بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ پاکستان کی طرف سے پرزور احتجاج کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ نہ وہ افغان باغیوں کی مدد کر رہا ہے اور نہ ہی مسئلے کے سیاسی حل میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ مگر یہ احتجاج ایمانداری پر مبنی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ضیا کی سرکار ایک طرف تو اس کی آڑ میں اپنی طاقت بڑھانے کے منصوبے پورے کر رہی ہے اور دوسری طرف دونوں ہاتھوں سے وہ پٹرو ڈالر سمیٹ رہی ہے جو بعض عرب ملکوں کی طرف سے اسلام کے نام پر اور افغان پناہ گزینوں کی "خوش حالی" کے لئے مسلسل اور بڑی بڑی رقموں کی صورت میں فراہم کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ اس زبردست رقم کا خاصا بڑا حصہ افغان بغاوت کو ہوا دینے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس طرح "افغانستان کی کارروائی" کو پاکستان کے حکمرانوں نے ایک ایسے پردے کی صورت دے دی ہے جس کی آڑ میں وہ چین اور امریکہ سے فوجی ساز و سامان بٹور رہے ہیں اور رجعت پرست عرب سرکاروں سے پٹرو ڈالر۔ ان دونوں ہی کا مقصد یہ ہے کہ اپنے گندے عزائم حاصل کئے جا سکیں۔

مستند حلقوں کے ذریعے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ افغانستان کے باغیوں کو پاکستان کے ذریعے ہتھیار فراہم کئے جا رہے ہیں۔ مصر کے مرحوم صدر انور سادات نے اے بی سی ٹیلی ویژن کو بتایا تھا کہ جب سے افغانستان حکومت نے افغانستان کی آزادی اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے تحفظ کے لئے سوویت فوجی دستوں کو اپنے یہاں مدعو کیا ہے، تب سے ہی امریکہ افغان باغیوں کے لئے ہتھیار مصر سے خرید تا رہا ہے۔ اے بی سی ٹیلی ویژن کئی بار یہ خبر نشر کر چکا ہے کہ امریکہ، مصر، سعودی عرب، پاکستان اور چین پوشیدہ طور پر افغان باغیوں کو اسلحے فراہم کرتے رہے ہیں اور تربیت دیتے رہے ہیں۔

افغانستان کی صورت حال اور اس ملک میں عدم استحکام پیدا کرنے کے سلسلے میں پاکستان کا رول اس جد وجہد کے شدید تر ہونے کی علامت ہے جو اپنی آزادی پر اصرار کرنے والے ملکوں نیز سامراجی طاقتوں اور ان کے حلیفوں کے درمیان جاری ہے۔ یہ بلاشبہہ وہ جد وجہد ہے جس میں ایک طرف سماجی معاشی پالیسیوں کے ترقی پسند رجحان اور سیکولرزم ہے اور دوسری طرف اندرون ملک اور بیرون ملک کی کٹر پسندی، بنیاد پرستی اور ظلمت پسندی۔

اس لحاظ سے افغان انقلاب کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار خاصی بڑی حد تک اس بات پر ہوگا کہ ناوابستہ ممالک خاص طور پر جنوبی ایشیا میں اپنی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کا تحفظ کرنے کی کتنی سکت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس خطے کے کسی بھی ملک کی طرح افغانستان کو بھی یہ مقتدر اعلیٰ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے طرز حکومت چنے اور سماجی معاشی ترقی کے راستے کا تعین کرے۔

اس افغانستان دشمن رویہ کی اصل وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے فوجی حکمراں اور وہی کیوں، اس خطے کی سبھی رجعت پرست سرکاروں کو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ ایک جمہوری اور بائیں بازو کا رجحان رکھنے والے افغانستان کا وجود خطے کے عوام کے لئے ایک نیا نمونہ بن جائے گا' خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جن پر مذہبی کٹر پنتھی، سامنتی آقا اور ظلمت پسند حکومت کر رہے ہیں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ایک ترقی پسند اور جمہوری افغانستان پورے ملک پر صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ پر ہی نہیں، خود سامنتی پنجاب پر بھی گہرے اثرات ڈالے گا۔

افغانستان میں "اسلام خطرے میں ہے" کا جو نعرہ بلند کیا جا رہا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض ایسی مسلم ریاستوں کو جن میں جاگیردارانہ نظام قائم ہے یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ سوشلزم کی لہر ان کے موجودہ سماجی نظام کو بہا نہ لے جائے۔ ساتھ ہی اس میں ان کے سوویت دشمن مغربی حلیفوں کے دباؤ کا بھی ہاتھ ہے۔ اس طرح افغانستان کے خلاف لڑنے کے لئے جو قومیں پاکستان کی ہمت بڑھا رہی ہیں اس میں امریکی سامراج، چینی شاؤنیت پرست اور عرب کے رجعت پرست لیڈران شامل ہیں۔

پاکستان نے پہلے تو یہ نعرہ بلند کیا اور اب اسلامی کانفرنس کی قرارداد کی آڑ لے کر کرمال حکومت کے ساتھ براہ راست گفتگو کرنے سے انکار کر رہا ہے۔۔۔۔۔ لیکن

مجموعی صورت حال کے پس پشت نہ صرف ان واقعات کا ہاتھ ہے اور نہ ہی اس تھیوری کا کہ پاکستان تو بڑی طاقتوں کے "درمیان پھنس گیا ہے"۔

افغانستان نے ایک بار پھر پاکستان اور ایران سے درخواست کی ہے کہ تعلقات کو معمول پر لانے کی غرض سے بات چیت کی جائے۔ ۱۴ر مئی ۱۹۸۰ء سے اب تک کی مدت کے درمیان کابل کی طرف سے اس طرح کی یہ ۷ ویں پیش کش ہے۔ تازہ ترین پیش کش ایسے حالات میں کی گئی ہے جن میں افغانستان کے واقعات سے متعلق بہت سارے حقائق سامنے آچکے ہیں۔ دنیا کے سنجیدہ ذہن رکھنے والے لوگوں بالخصوص امریکہ اور پاکستان کے لوگوں پر یہ بات ظاہر ہوتی جارہی ہے کہ افغانستان کے خلاف یہ غیر معلنہ جنگ ان اشتعال انگیزیوں اور سازشوں کا براہ راست نتیجہ ہے جو پینٹاگن، بیجنگ۔اسلام آباد گٹھ جوڑ کی تیار کردہ ہیں۔

یہاں یہ سوال پوچھنا بے محل نہ ہوگا کہ آخر اسلام آباد اس کے لئے تیار کیوں نہیں ہے کہ افغان مسئلہ بات چیت کے ذریعے حل کرلیا جائے اور وہ بھی ان حالات میں جب افغان پناہ گزیں پاکستان کے لئے ایک بڑا سماجی معاشی مسئلہ بن چکے ہیں؟

مگر اس سوال کا جواب ملنا آسان نہیں کیونکہ اس کی جڑیں کہیں زیادہ گہری ہیں، اس سے کہیں زیادہ جتنی اوپر سے نظر آتی ہیں۔

انقلاب دشمن افغانوں کا ایک انتہائی جنونی دستہ جو پاکستان سے سرگرم عمل ہے، حزب اسلام پارٹی ہے۔ اس ٹولے کا سرغنہ ایک ۴۰ سالہ دہشت پسند گلاب الدین حکمت یار ہے۔ وہ کئی خصوصی یونٹوں کا انچارج ہے جن کا مسلسل رابطہ سی آئی اے، فوجی سراغرسانی اور پاکستانی وزارت خارجہ سے بنا ہوا ہے اور جو افغان پناہ گزینوں کا ذہن بدلنے کا کام انجام دیتی ہیں۔ دہشت پسند ٹولے مقامی آبادی کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً ہر کارروائی کے بعد دہشت پسندوں کی طرف سے یہ اشتہار تقسیم کئے جاتے ہیں کہ اگر کسی نے کوئی خبر امن وامان کے لئے ذمہ دار اداروں تک پہنچائی تو انہیں سخت نتائج جھیلنے پڑیں گے۔

یہ جو حقائق پیش کئے گئے اس کا مقصد یہ بتانا تھا کہ طریقۂ کار، انداز اور تکنک جیسی سبھی چیزیں ویسی ہی ہیں جو ہندوستان کے بعض خطوں میں ہم دیکھتے رہے ہیں۔ یہ منظم بین الاقوامی دہشت گردی کا حصہ ہے جس کا منصوبہ کہیں اور بنایا جاتا ہے

اور پھر اس منصوبے کو عملی روپ دیا جاتا ہے۔

کیا یہ محض اتفاق ہے کہ ہندوستان میں پنجاب، جموں اور کشمیر میں اور افغانستان میں عدم استحکام لانے کی کوششیں پاکستان سے کی جا رہی ہیں؟ ان دونوں ہی صورتوں میں یہ مسلم بنیاد پرستی ہے جس نے محرک قوت کا رول سنبھال لیا ہے اور کافروں، کے خلاف کارروائیاں کی جا رہی ہیں ـــــ ہندوستان میں ہندو کافروں کے خلاف اور افغانستان میں کمیونسٹ کافروں، کے خلاف۔

جواب کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ بات تو وثوق سے کہی ہی جا سکتی ہے کہ افغانستان کے خلاف غیر معلنہ جنگ اور اس کے حقیقی اور امکانی مابعد اثرات ایشیا میں امن کے لئے زبردست خطرہ پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے فوجی تاناشاہوں کے ذہن میں یہ بات بالکل صاف ہونی چاہیئے کہ پاکستان اپنی کلیدی حیثیت کی وجہ سے ایشیائی امن کی برقراری کے سلسلے میں اور تمام مسائل کو پرامن طور پر حل کرنے کے سلسلے میں مددگار ہو سکتا ہے اور اسے یہ رول ادا کرنا چاہیئے۔

حال ہی میں پاکستان کی پیپلز پارٹی کی رہنما نصرت بھٹو نے ایک فرانسیسی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ "پاکستان کی فوجی حکومت افغانستان کے سوال پر جو شور غل مچا رہی ہے وہ محض فریب اور دھوکے کی ٹٹی ہی نہیں ہے۔" انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "اگر پاکستان پیپلز پارٹی اقتدار میں آتی ہے تو وہ ببرک کرمال کی قیادت والی اس سرکار کو سرکاری طور پر تسلیم کرے گی جو افغانستان جمہوری ری پبلک میں قائم ہے اور بات چیت کے ذریعے تمام مسائل حل کرے گی۔" نصرت بھٹو نے اتنا ہی نہیں کہا بلکہ اس حقیقت کی بھی نشاندہی کی کہ "وہ تخریب کار ہتھیار بند عناصر جو افغانستان جمہوری ری پبلک کے خلاف دخل اندازی کے لئے پاکستان کی سرزمین کو اڈے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں مداخلت کار ہیں اور پاکستان میں ان کی موجودگی خود پاکستان کیلئے انتہائی خطرناک ہے۔"

اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ اتنا واضح ہے کہ مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ عرض کر دوں کہ اصل معاملہ یوں ہے کہ اسلام آباد کی سرکار جو پاکستانی عوام کے جمہوری حقوق کچلنے کے لئے رات دن اسلام کا استعمال کر رہی ہے بلکہ یوں کہوں کہ استحصال کر رہی ہے، اس نے نہ صرف یہ کہ افغانستان کے خلاف دوسروں کی جنگ

جاری رکھی ہے بلکہ اس کو شدت دیتی جا رہی ہے۔ حقیقت اور سنگین حقیقت یہ ہے کہ خود کو "محاذی ریاست" اور "خلیج کا پائیں باغ" جیسے القاب سے نواز کر وہ اس آڑ میں جو کھیل اس خطے میں کھیل رہی ہے وہ کسی اور کا کھیل ہے۔

اس کھیل کو ناکام بنا کر اور اپنی آزادی نیز اقتدار اعلیٰ کا تحفظ کرتے ہوئے افغانستان کے عوام یقیناً اپنا وطن دوستانہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ مگر بات یہیں تک نہیں ہے۔ وہ ایشیا میں امن کے نصب العین کی بھی زبردست خدمت انجام دے رہے ہیں، اس امن کی جسے پاکستان کے فوجی حکمرانوں اور ان کے آقاؤں کی طرف سے روز افزوں خطرہ لاحق ہے۔ تو اس طرح ایران اور افغانستان میں رونما ہونے والے مشہور واقعات کے بعد پاکستان نے امریکہ کے فوجی منصوبوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع، ساڑھے چار لاکھ سپاہیوں پر مشتمل اس کی فوج اور پھر فوجی ڈکٹیٹر شپ واشنگٹن سرکار کو کچھ اتنی مفید مطلب محسوس ہوئی کہ اس نے دوسری تمام چیزوں سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا ہے کہ پاکستانی رہنما تمام جمہوری اصولوں کی کھلم کھلا ان دیکھی کر رہے ہیں اور بنیادی انسانی حقوق بھی پامال کر رہے ہیں۔ اور یہی نہیں امریکہ تو فوجی حکومت کی ان کوششوں کو بھی معاف کر دینے پر تیار ہے جو نیوکلیائی اسلحوں کے حصول کے لئے کی جا رہی ہیں۔

وہائٹ ہاؤس، پینٹاگن اور سی آئی اے نے طے کر لیا ہے کہ وہ پاکستان کو تیزی سے حرکت میں آنے والی فوج کی جمپنگ گراؤنڈ کے طور پر اور افغانستان میں غیر معلنہ جنگ لڑنے کے ایک اڈے کے طور پر استعمال کریں گے۔ ساتھ ہی ہندوستان دشمن تخریبی عناصر کو تربیت بھی دی جا رہی ہے۔ واشنگٹن نے پاکستان کو اس علاقے میں پولیس کے سپاہی کا رول بھی سونپ رکھا ہے۔ جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھیوں نے شعوری طور پر یہ رول قبول کیا ہے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ قدم پاکستان کے ۹ کروڑ ۲۰ لاکھ عوام کے بنیادی مفادات کے قطعی خلاف ہے۔ بدلے میں امریکہ فوجی سرکار کو ہر طرح کی مدد دے رہا ہے تاکہ وہ اپنی پوزیشن اور زیادہ مستحکم کر سکے۔

امریکہ نے پاکستان کو ایک محاذی ریاست مان لیا ہے اور ضیاء الحق کو

۳ ارب ۲۰ کروڑ ڈالر کی مالیت کی معاشی اور فوجی مدد دی ہے۔ اس سلسلے میں کانگریس میں جو معمولی سی مزاحمت ہوئی اسے آسانی کے ساتھ دبا دیا گیا اور سائمنگٹن۔گلین ترمیم کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا جس کے تحت ان ریاستوں کو مدد دینے پر پابندی لگائی گئی ہے جو پوشیدہ طور پر نیوکلیائی ہتھیار بنا رہی ہیں۔ جدید ترین ایف۔ ۱۶ فائٹر بمبار، ہاک آئی سراغرساں طیارے اور ہارپون اور اسپرو میزائیلیں نیز دوسری طرح کے جدید اسلحے پاکستان پہنچنے لگے ہیں۔

ادھر پاکستان نے فوری طور پر اپنے ہوائی اڈوں اور مواصلاتی مرکزوں کی جدید کاری کا کام شروع کر دیا ہے، اڈے بنائے جا رہے ہیں اور نئے فوجی دستے تیار کئے جا رہے ہیں۔ پاکستان کو اپنے فوجی جال میں پھنسائے رکھنے کی غرض سے ریگن سرکار نے واشنگٹن۔ ٹوکیو۔ سیول۔ پیکنگ۔ اسلام آباد فوجی گٹھ جوڑ کو عملی روپ دینے کی کوششیں تیز کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ اپنی سرپرستی میں پاکستان۔ سعودی عرب۔ ترکی پر مشتمل ایک سہ فریقی گٹھ جوڑ بھی وجود میں لانے کے لئے کوشاں ہے جو خلیج فارس کے علاقے کے آس پاس کے ممالک ہیں۔

افغانستان جمہوری ری پبلک کے خلاف اپنی غیر معلنہ جنگ کے سلسلے میں پاکستان نے ایک سو سے زائد اڈے اور کیمپ قائم کر رکھے ہیں جن میں نام نہاد "افغان پناہ گزینوں" پر مشتمل قزاقوں اور تخریب کاروں کی نئی نئی ٹولیوں کو تربیت دی جا رہی ہے۔ انہیں امریکی، چینی اور پاکستانی انسٹرکٹر تربیت دے رہے ہیں۔ یہ بات بھی دن بہ دن واضح ہوتی جا رہی ہے کہ ان قزاقانہ حملوں میں پاکستان کی مسلح افواج بھی حصہ لیتی ہیں۔ اپنے آپ کو افغان ثابت کرنے کے لئے پاکستانی سپاہی اپنے اسلحے اور وردیاں بدل دیتے ہیں۔ ہندوستان کے لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کیونکہ کچھ پاکستانی سکھوں کا بھیس بدل کر خود ہندوستان میں سرگرم ہیں۔

افغان دشمن جذبات بھڑکانے کے لئے امریکہ کے اعلےٰ حکام اور کانگریس کے وفود نے بھی برابر ان کیمپوں کا دورہ کرتے ہوئے خاصی اشتعال انگیز تقریریں کیں اور یہ یقین دلایا کہ پاکستان کو دی جانے والی فوجی مددمیں اور زیادہ اضافہ کر دیا جائے گا۔

پاکستانی فوج کو لگاتار ہتھیار مل رہے ہیں اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اکیلے چین نے ۲ ارب ڈالر سے زائد مالیت کے ہتھیار پاکستان کو فراہم کئے ہیں۔ یہ ہتھیار

صرف افغانستان میں استعمال نہیں ہو رہے ہیں۔ خود جنرل ضیاء الحق نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے بڑی مقدار میں پاکستانی ہتھیار ہندوستان چلے گئے ہوں اور پنجاب میں دہشت گرد انہیں استعمال کر رہے ہوں۔

عالمی اخبارات میں اس طرح کی خبریں برابر چھپتی رہی ہیں کہ بعض سمجھوتوں میں کچھ ایسی پوشیدہ دفعات موجود ہیں جن کے تحت پاکستان میں امریکہ اپنے فوجی اڈے بنائے گا اور کراچی میں مرکزی کمان کے صدر دفاتر قائم کئے جائیں گے۔

یہ سارے حقائق اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ پاکستان پوری طرح امریکہ کے فوجی جال میں پھنس چکا ہے اور جنوبی ایشیا میں اس کا خاص اڈہ بن گیا ہے۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ایک ناوابستہ ملک پوری طرح امریکہ سے وابستہ ہو گیا ہے جو بیحد خطرناک بات ہے۔

امریکہ نے شروع میں یہ طے کیا تھا کہ تیزی سے حرکت میں آنے والی فوج ایک لاکھ ۱۰ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہو گی مگر اس وقت اس میں قریب قریب ۳ لاکھ سپاہی شامل کئے جا چکے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں امریکہ نے اس فوج کی رہنمائی کے لئے ایک مرکزی کمان قائم کی جس کے دائرۂ اختیار میں ایشیا اور افریقہ کے متعدد ممالک شامل ہیں۔ اس کمان کے پاس درجنوں اسٹریٹیجک بمبار اور جنگی جہاز، سیکڑوں ٹیکٹیکل طیارے، ہیلی کوپٹر، میزائیلیں، ٹینک اور توپخانے ہیں۔

امریکہ نے ایک خاص "مداخلت کار" فوج بنا رکھی ہے جس کا مقصد امریکی ساحل سے ہزاروں میل دور واقع دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا ہے۔ اس فوج کی عملی آزمائش اس وقت کی گئی جب برق آسا فوج کی ۸۲ ویں چھاتہ بردار ڈویزن کے دستوں نے گرینا ڈا پر حملہ کیا۔

ناٹو میں شامل تین دوسرے ممالک، برطانیہ، فرانس اور اٹلی بھی برق آسا فوج کے نمونے پر اپنی فوجیں تیار کر رہے ہیں جو تیزی کے ساتھ حرکت میں لائی جا سکتی ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ امریکہ کو تین خاص مقاصد کے لئے اسلام آباد کی ضرورت ہے۔ خلیج فارس کے علاقے میں استعمال کی غرض سے اپنی برق آسا فوج کے اڈے کے لئے، پھر افغانستان جمہوری ری پبلک کے خلاف غیر معلنہ

جنگ میں کام آنے والے خاص اڈے کے طور پر اور آخر میں اس کی ہندوستان مخالف پالیسی کے ایک آلۂ کار کے طور پر۔

جہاں تک خلیج فارس کے علاقے کا سوال ہے تو کارٹر سرکار کے زمانے میں بھی پینٹاگن کی فوجی حکمت عملی بنانے والوں نے جو نظریہ تیار کیا تھا اس میں بھی اس علاقے میں فلپائن یا دیگو گارشیا سے برق آسا فوج کو پہنچانے کے سلسلے میں بحری سفر کے ایک اہم مرکز کے طور پر پاکستان کے استعمال کئے جانے کی بات شامل تھی۔ اسوقت امریکہ نے جو کچھ سوچا تھا اس کے بڑے حصے کو حالیہ برسوں میں عملی روپ دیا جا چکا ہے۔ پینٹاگن پاکستان میں ایسی فوجی سہولیات تعمیر کر رہا ہے جنہیں خلیج کی ساحلی ریاستوں پر حملے کے لئے استعمال کیا جا سکے گا۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں وہ بہت سارے ہوائی اڈے جو نہ صرف یہ کہ ایف۔ ۱۶ فائٹر بمبار طیاروں کے لئے موزوں ہیں بلکہ جہاں سے اس طرح کے طیارے بھی پرواز کر سکیں گے جیسے اس وقت نہ پاکستان کے پاس ہیں اور نہ آئندہ اس کے پاس ہونے کی کوئی امید ہے۔ البتہ امریکی فضائیہ میں ایسے لاتعداد طیارے موجود ہیں۔

سخت پہرے کے درمیان اور امریکی ماہروں کی نگرانی میں پاکستان بحیرۂ عرب کے ساحل پر ایسے مقامات پر جہاں بہت معمولی آبادی ہے فوجی اڈے بنا رہا ہے، ہتھیاروں اور گولہ بارود کے ذخیرے تعمیر کر رہا ہے اور الیکٹرونکس جاسوسی کے مرکز وجود میں لا رہا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق امریکہ نے ہنگامی حالات میں پاکستان کی بعض بندرگاہوں کے استعمال کی اجازت بھی حاصل کر لی ہے۔

امریکہ کی فوجیں ان تمام اڈوں، ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں کو خلیج فارس کی صورت حال میں گڑبڑی کے دوران تو استعمال کریں گی ہی، ساتھ ہی اس صورت میں بھی استعمال کر سکتی ہیں جب برا عظم ایشیا کے کسی بھی ملک میں 'ناسازگار' صورتحال پیدا ہو۔ مرکزی کمان اس خطے میں امریکہ کی مسلح افواج کی بڑھتی ہوئی طاقت کی رہنمائی کرنے اور ان سے کام لینے کی غرض سے قائم کی گئی ہے اور اس کے حلقے میں افریقہ اور ایشیا کے ۱۹ ممالک شامل ہیں جن کی ذمہ داری اسے سونپی گئی ہے۔

واشنگٹن کی فوجی حکمت عملی بنانے والے اپنے توسیع پسندانہ مقاصد کے لئے پاکستانی فوج کے استعمال کا بھی منصوبہ رکھتے ہیں۔ اس کی توثیق اس بات سے

ہوتی ہے کہ پچھلے سال کسی وقت واشنگٹن کے اشارے پر پاکستان کی ۲۵ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک سیزادہی کی فوج کو پوری طرح تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر خلیج فارس کے علاقے میں اسے منتقل کیا جاسکے۔ یہ دستہ جسے پاکستان نے برق آسا فوج کے نمونے پر تیار کیا ہے اس خطے کے لئے امریکہ کی پولیس فورس کے حلیف کے طور پر استعمال ہونے والا تھا۔

اسی طرح اخبارات میں اس طرح کی جو خبریں چھپی ہیں انہیں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ امریکہ پاکستان میں پرشنگ ۔ ۲ میزائیلیں نصب کرنے جارہا ہے۔ اس سوال پر ہندوستان کی پارلیمنٹ میں پہلے بھی بات ہوچکی ہے۔

اس سلسلے میں یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ وینبرگر یہ اعتراف کرچکے ہیں کہ امریکی حکومت نئی نیوکلیائی میزائیلوں کی تنصیب کو مغربی یورپ تک ہی محدود نہیں رکھے گی۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ یوروپ میں ۵۷۲ نیوکلیائی میزائیلوں کی تنصیب کے بعد امریکہ کے محکمۂ دفاع نے ایسی ۹۱۱ مزید میزائیلوں کی تیاری کا حکم دیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ مغربی یورپ میں ہی نیوکلیائی میزائیلوں کی تنصیب سے امریکہ مطمئن نہیں ہے وہ اس طرح کے اڈے جو نئی نیوکلیائی میزائیلوں سے لیس ہوں دوسرے براعظموں پر بالخصوص ایشیا میں بھی قائم کرنا چاہتا ہے۔

نیوکلیائی جنگ کی پوری تیاریوں کے باوجود پینٹاگن کے نظریہ ساز اسے ہرگز پسند نہیں کریں گے کہ امریکہ کی سرزمین نیوکلیائی ٹکراؤ کا میدان بن جائے۔ اسی لئے وہ دنیا کے دوسرے خطوں کو چن کر وہاں اپنی پرشنگ اور کروز میزائیلیں لگا رہے ہیں۔ یہ خطے امریکہ کے ساحل سے زیادہ سے زیادہ دور رکھے گئے ہیں۔ اس طرح دوسری قوموں کو چاہے وہ یورپ میں ہوں، ایشیا میں یا کہیں اور امریکہ اپنا نیوکلیائی یرغمال بنا رہا ہے۔

میزائیلوں کی تنصیب کا امریکی فوجی منصوبہ بنانے والوں میں وینبرگر بھی شامل ہے۔ ۱۹۸۳ء کے موسم خزاں میں وہ اسلام آباد گئے تھے۔ وہاں پاکستانی رہنماؤں سے بات چیت کے دوران انہوں نے اس ملک کی "فوجی پوزیشن" کی غیر معمولی اہمیت پر زور دیا۔

اس کے معنی خاص طور پر یہ ہیں کہ امریکہ نے پاکستان کو ایک محاذی ریاست بنا دیا ہے۔ وہ بحری اڈے، ہوائی اڈے اور جاسوسی کے مرکز بنا رہا ہے اور روزافزوں

طور پر انتہائی ترقی یافتہ اسلحے فراہم کر رہا ہے۔ پاکستان میں امریکہ کی شرکت کے ساتھ ہونے والی فوجی تعمیرات اتنے وسیع پیمانے پر عمل میں آ رہی ہیں کہ پورا پاکستان ہی ایک طرح سے فوجی اڈے میں بدل جائے گا۔ مرکزی فوجی کمان کی طرف سے جنوبی ایشیائی خطے کا جو نیا فوجی نقشہ تیار کیا گیا ہے، اس میں پورے پاکستان کو ایک ایسا علاقہ بتایا گیا ہے جو امریکہ کی تیزی سے حرکت میں آنے والی فوج رکھنے کے لئے انتہائی موزوں ہے۔

اس لئے اخبارات کی اس طرح کی خبروں پر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ امریکہ پاکستان میں اپنی نیوکلیائی میزائیلوں کی تنصیب کا ارادہ رکھتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ امریکہ نے اس طرح کے اسلحے "ایشیا میں اپنے اگلے محاذوں" پر یعنی جاپان، جنوبی کوریا اور ترکی میں پہنچانا شروع کر دیا ہے۔ حال ہی میں اڈمیرل ولیم کرو نے یہ تسلیم کیا ہے کہ امریکہ جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کو نیوکلیائی میزائیلوں کی فراہمی کے سوال پر غور کر رہا ہے۔ اس لئے یہ قطعی ممکن ہے کہ پاکستان کے بارے میں بھی اس طرح کی بات سوچی جا رہی ہو۔

یہ نیا رول ہے جو پاکستان ادا کرنے لگا ہے۔

(۲)

ایشیا میں امن اور

بیجنگ۔ واشنگٹن۔ اسلام آباد گٹھ جوڑ

چینی جنتری کے بارہ سالہ دور میں ۱۹۸۴ء کا سال چوہے کا سال تھا۔ چالاکی اور بے ایمانی اور پیٹھ میں چھرا بھونکنے کا سال۔ چینی لڑکیاں اس سال کے دوران شادی نہیں کرتیں کیونکہ ہوسکتا ہے انہیں ایسے شوہر ملیں جو ناقابل اعتبار اور احمق ہوں۔ چوہے کے سال سے اسی طرح کے توہمات وابستہ ہیں۔ اب یہ بات تو کوئی ایسا شخص ہی بتا سکتا ہے جو چینیوں سے اچھی طرح واقف ہو کہ وہ اب بھی اس قسم کے توہمات کا شکار ہیں یا نہیں۔

چین میں ۱۹۷۲ء اور ۱۹۸۴ء دونوں ہی چوہے کے سال تھے اور یہ دونوں ہی سال اس ملک کی آج کی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوئے ہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا کو بیجنگ کے منصوبوں میں ہمیشہ ہی ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ یہ علاقہ چین کی توسیع پسندی کا خاص میدان بن گیا ہے۔ چینی لیڈروں کا خیال ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے ترقی پذیر ممالک جن مسائل سے دوچار ہیں انہیں دیکھتے ہوئے اور انڈو چائنا کی قوموں کے خلاف فرانسیسی استعمار پرستوں اور امریکی مداخلت کاروں کی چھیڑی ہوئی تباہ کن جنگ کے مابعد اثرات کی وجہ سے کرۂ ارض کے اس حصے میں بیجنگ کے لئے اپنی سرداری قائم کرنا نسبتاً آسان ہوگا

بیجنگ ایک اور عنصر پر بھی خصوصی توجہ دے رہا ہے جو خالصتاً مقامی نوعیت رکھتا ہے۔ یہ ہے جنوب مشرقی ایشیا میں بڑی اور خوشحال چینی برادری کی موجودگی۔ اندازہ یہ ہے کہ ان کی تعداد ایک کروڑ ۶۰ لاکھ سے ڈھائی کروڑ تک ہے اور سرمایہ ۱۶-۲۳ ارب ڈالر۔ یہ برادری خطے کے بعض ملکوں کی معیشتوں میں جو رول ادا کر رہی ہے وہ حقیقی معنوں میں بے پناہ ہے۔ بیجنگ ایک عرصے سے چینی نسل کے لوگوں کے قوم پرستانہ جنون سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا رہا ہے تاکہ انہیں اپنی توسیع پسندانہ پالیسیوں کے مفاد میں استعمال کر سکے۔

چھٹی دہائی کے اواخر اور ساتویں دہائی کے اوائل میں ماؤ وادی ایجنٹ جنوب مشرقی ایشیا کے متعدد ملکوں کی جمہوری تحریکوں میں گھس گئے تھے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریکیں کمزور پڑ گئیں اور دھیرے دھیرے متعدد پارٹیاں محض ماؤ نواز گروہ بن کر رہ گئیں۔ اس وقت بیجنگ کے ریڈیو اسٹیشن جنوب مشرقی ایشیا کے لئے خصوصی پروگرام نشر کر رہے تھے اور انہیں بھڑکا رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ چین کے سرکاری اخبارات نے بھی اپنے حمائتی ٹولوں کو انڈونیشیا میں "عوامی جنگ" چھیڑنے کا حکم دیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں ماؤ نواز عناصر نے ملیشیا میں مسلح جدوجہد کا راستہ اپنانا شروع کیا کیونکہ بیجنگ سے انہیں یہ حکم ملا تھا کہ "دیہی حصوں میں آزاد علاقے قائم کریں"۔

لیکن آٹھویں دہائی کے اواخر تک بیجنگ نے محسوس کر لیا کہ ماؤ وادی طرز کا "انقلاب برآمد کرنے" کی اس کی کوششیں ناکام ہو گئی ہیں۔ بیجنگ نواز مسلح گروہوں میں لوگوں کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی تھی اور نظریاتی انتشار پوری طرح گھر کر گیا تھا۔

انڈوچائنا میں امریکی جارحیت کی شکست کے بعد صورت حال بدلنے لگی۔ ویت نام، لاؤس اور کمپوچیا کا برادرانہ اتحاد ایک سیاسی حقیقت بن گیا۔ اس کی وجہ سے نیز لاؤس اور کمپوچیا کی طرف سے سوشلزم کی تعمیر کا راستہ اختیار کئے جانے اور باہمی معاشی امداد کی کونسل میں ویت نام کے شامل ہونے کی وجہ سے جنوب کی طرف توسیع کے چینی منصوبوں میں بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اس خطے کی معاشی جتھ بندی یعنی جنوب مشرقی ایشیائی قوموں کی انجمن کے سیاسی استحکام کی وجہ سے بھی جس میں انڈونیشیا، ملیشیا، تھائی لینڈ، سنگاپور اور فلپائن شامل ہیں، خاصی بڑی حد تک

بیجنگ کے منصوبے ناکام ہو گئے۔

سیاسی صورت حال کے نئے حقائق نے بیجنگ کو مجبور کر دیا کہ وہ اس خطے کی قوموں کے خلاف اپنی پرانی معاندانہ روش کو عملی روپ دینے کے نئے راستے تلاش کرے۔ اس سے پہلے چین کا خاص طریقہ یہ تھا کہ وہ مسلح ماؤوادی جتھہ بندیوں کا سہارا لیتا تھا لیکن اب نئی پالیسیوں کے تحت اس کی ساری توجہ ایشیائی قوموں کو آپس میں لڑانے پر مرکوز ہو گئی۔ بیجنگ کی پالیسی کا یہ نیا پہلو ہندوستان سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

اس نئی روش کا خاص طور پر بھرپور اظہار ۱۹۷۹ء کے بعد ہونے لگا جب ویت نام کے خلاف چینی جارحیت ناکام ہو گئی۔ مغربی اخبارات کی خبر کے مطابق چین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سیاسی بیورو کی ایک دستاویز مارچ ۱۹۷۹ء میں فوجی لیڈروں کے درمیان گشت کرائی گئی جو اس وقت چینی فوج کی جدید کاری میں مشغول تھے۔ اس میں اعتراف کیا گیا تھا کہ چین ویت نام میں جدید طرز کی جنگ لڑنے سے قاصر رہا ہے۔ اس وقت چین جو کھیل کھیل رہا ہے وہ ہے "کمپوچیا کے مسئلے" کو استعمال کر کے انڈو چائنا کے سوشلسٹ ملکوں اور ایسیان ملکوں کو آپس میں ٹکرا دینے کا کھیل۔ لیکن انہوں نے ہندوستان کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔

چینیوں کا پیدا کردہ "کمپوچیا کا مسئلہ" خاص طور پر پول پاٹ کی ان باقیماندہ فوجی ٹولیوں کے سہارے زندہ ہے جو ایسیان کے ایک رکن ملک تھائی لینڈ کے علاقے میں مقیم ہیں۔ چینی اسلحوں سے لیس اور تھائی فوج کی پشت پناہی کے سہارے پول پاٹ کے یہ ٹولے کمپوچیا کے خلاف ایک غیر معلنہ جنگ میں مصروف ہیں۔ پول پاٹ واد کے خلاف اپنی دلیرانہ جدوجہد کی برکتوں کے تحفظ کے لئے کمپوچیا نے ویت نام سے درخواست کی کہ وہ اپنی فوجیں ان کے ملک میں بھیج دے جواب رفتہ رفتہ واپس لوٹ رہی ہیں۔ ان حالات میں بیجنگ اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہے۔ وہ بعض ایسیان ملکوں میں "ویت نامی حملے" کا ہوا کھڑا کر رہا ہے اور یہی وہ ہوا ہے جس نے کچھ ملکوں کو حقیقت پسندانہ رویہ اپنانے سے باز رکھا ہے۔

پچھلے ۶ برسوں سے یہ صورت حال اپنی جگہ قائم ہے۔ دوسرے مقاصد کے علاوہ چین کی کھلم کھلا بلیک میل اور ڈرانے دھمکانے کی پالیسی اور اسکی "مسکراہٹ کی

حکمت عملی" کا مقصد یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایسیان ملکوں کا "دوست اور محافظ" بنا کر پیش کرے۔ ان پالیسیوں کا رخ قطعی واضح ہے۔ ایک بار دینگ اکسیاو پنگ نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر تھائی لینڈ اور ویت نام یا کمپوچیا کے درمیان ٹکراؤ ہوا تو چین تھائی لینڈ کا ساتھ دے گا۔ دوسرے معنوں میں اس طرح تھائی لینڈ پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ نام نہاد "کمپوچیائی مسئلے" کے حل کے لئے فوجی راستہ اپنائے۔

"ویت نام کی سرداری پرستی کا مقابلہ کرنے" کے نعرے کی آڑ میں بیجنگ ایسیان ملکوں میں سرگرم ماؤ وادی حلقوں کی پوزیشن بہتر کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ مثلاً ۱۹۸۱ء کی گرمیوں میں تھائی لینڈ اور برما کے ماؤ وادیوں کے ایجنٹوں نے صریحی طور پر بیجنگ کے اشارے پر ان دونوں ملکوں کی حکومتوں کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ویت نام اور کمپوچیا کے خلاف "مشترکہ محاذ" قائم کیا جائے۔ یہ تجویزیں رد کردی گئیں کیونکہ ان کے مانے جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ "پولیس مین" کے طور پر بیجنگ کے رول کو قانونی حیثیت اور استحکام مل جائے۔

جنوب مشرقی ایشیا کے تخریب کار عناصر کو ملنے والی بیجنگ کی حمائت کا مقصد ایسیان قوموں کو یہ باور کرانا ہے کہ چین ان کا دوست اور ویت نام ان کا خاص دشمن ہے۔ لیکن ایسیان کے متعدد رہنماؤں نے یہ اعلان کیا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کو بنیادی طور پر بیجنگ نواز جتھوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہے۔ فلپائن اور ملیشیا کے رہنماؤں نے اس طرح کے بیانات دیئے تھے۔ ایسیان ملکوں کے اپنے دورے کے زمانے میں چینی رہنما ژاؤ زیانگ ان رہنماؤں کو قائل کرنے میں ناکام رہے۔ اس دورے نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ بیجنگ انہیں استعمال کرنے کے لئے ان پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ لیکن بعض ایسیان ملکوں کا موقف بدل رہا ہے۔ اب وہ زیادہ حقیقت پسندی سے کام لینے لگے ہیں۔

ایسیان ملکوں کے سلسلے میں چین کی پالیسی کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ امریکہ کے اشتراک کے ساتھ عمل میں لائی جا رہی ہے۔ امریکہ کے سامراجی حلقے ابھی انڈوچائنا میں اپنی شکست اور بحرالکاہل اور بحرہند کے درمیان کے فوجی لحاظ سے بیحد اہم علاقوں میں متعدد فوجی اڈوں کے نقصان کو ہضم نہیں کر پائے ہیں۔ اس لئے امریکہ خاموش بیٹھنے والا نہیں ہے۔ جیسا کہ مشرقی ایشیا اور بحرالکاہل سے متعلق امور کے

امریکی نائب وزیر رچرڈ ہول بروک نے ۱۹۸۰ء میں کہا تھا اس کا ارادہ ہے کہ وہ ایک بار پھر ایسیان اور بحرالکاہل کی طاقت بن جائے۔ صدر ریگن کے متعدد مشیر بھی اس پالیسی کا اعادہ کر چکے ہیں۔

اس طرح یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ویت نام میں امریکہ کی ہار کے بعد جنوب مشرقی ایشیا میں بیجنگ اور واشنگٹن کے جغرافیائی سیاسی مفادات ایک دوسرے سے مل گئے۔ ویت نام میں تباہ کن شکست کی وجہ سے چین کے ساتھ ٹکراؤ کی امریکی پالیسی بدل گئی اور اس نے دوستی کی پالیسی کا روپ لے لیا۔ چینی لیڈروں نے بھی اپنی طرف سے اسی رویہ کا ثبوت فراہم کیا۔ اور پھر یہی چیزیں چین پاک تعلقات کی منطق میں تبدیل ہو گئیں۔

چین اور پاکستان کے درمیان تاکا جھانکی کا سلسلہ بہت پہلے چھٹی دہائی کے وسط میں ہی شروع ہو چکا تھا یعنی لگ بھگ اسی وقت جب امریکہ اور پاکستان کے باہمی معاہدے پر دستخط ہوئے تھے۔ "ہندی چینی بھائی بھائی" کے ہزیانی نعروں کے درمیان کچھ اور بھی ہو رہا تھا جو غالباً ہندوستان کی پالیسی بنانے والوں کی نظر سے اوجھل رہا۔ ۱۹۵۶ء میں ہی پاکستان کے وزیر اعظم سہروردی چین گئے اور چو این لائی نے جوابی دورہ کیا۔ ۱۹۶۲ء میں ہندوستان پر چین کے حملے کے بعد چین پاکستان تعلقات نے ٹھوس شکل اختیار کی۔ تقریباً اس کے ایک سال بعد پاکستانی وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے یہ دعویٰ کیا کہ اگر ہندوستان نے حملہ کیا تو "ایشیا کی سب سے بڑی طاقت" پاکستان کی مدد کرے گی۔ ٹھیک اسی زمانے میں چین اور پاکستان کے بیچ سرحدوں سے متعلق ایک سمجھوتہ ہوا جو ان علاقوں سے متعلق تھا جن کے بارے میں ہندوستان، پاکستان اور چین کے درمیان جھگڑا موجود تھا۔ اس لئے یہ دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ چین نے سرکاری طور پر پاکستان کو ایک "سامراج دشمن" ملک قرار دیا ہے۔

اندرا گاندھی کے وزیر اعظم بننے کے لگ بھگ ایک مہینے کے اندر چینی رہنماؤں نے ہندوستانی علاقے میں جارحانہ گھس پیٹھ کے ذریعے چھیڑ خوانی شروع کر دی۔ اسی زمانے میں انھوں نے ہندوستان کو بھیجے گئے ایک نوٹ میں دھمکی آمیز رویہ اپنایا۔ اس نوٹ میں بڑی ہوشیاری کے ساتھ متعدد نکات کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی گئی تھی کہ چین نے ہندوستان کی جانب واقع ان علاقوں میں جسے وہ اپنا علاقہ سمجھتا ہے گھس پیٹھ کا حق محفوظ کر رکھا تھا اور چونکہ ہندوستان "امن کے لئے چین کی کوششوں کو صحیح طور پر سمجھنے میں" ناکام رہا ہے اس لئے چین نے فوجی اقدام نہ کرنے کا جو "یکطرفہ" عہد کیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ پھر ان تمام باتوں کا لب لباب یہ نکلا کہ ہندوستان کو مغرب سیکٹر میں "حقیقی کنٹرول کی لائن" کو بین الاقوامی سرحد مان لینا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اندرا گاندھی کے وزیر اعظم بنتے ہی چینیوں نے کھلم کھلا اپنے عہد توڑ دیئے اور یہ اعلان کر دیا کہ وہ ہندوستان کے علاقے میں داخل ہونے کے اپنے حق پر زور دیتے رہیں گے جس پر انہوں نے اکتوبر ۱۹۶۲ء میں طاقت کے ذریعے قبضہ کر لیا تھا لیکن بعد میں جہاں سے واپس چلے گئے تھے۔

اس نئی جارحیت پسندی کی ایک وجہ غالباً ان کی یہ خواہش تھی کہ ہند پاک تعلقات کو نقصان پہنچائیں جو تاشقند اعلان کے بعد کسی حد تک بہتر ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس طرح کے موقف سے یقینی طور پر پاکستان کے اندر تاشقند اعلان کی مخالفت کو بڑھاوا ملے گا۔ بیجنگ کے اخبار پیپلز ڈیلی نے اس اعلان کو "امریکی سوویت مشترکہ سازش کا نتیجہ" قرار دیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ "ہند پاک ٹکراؤ کے دوران ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین دونوں ہی نے ہندوستان کو حملہ آور ہے بھڑکایا اور اس کی ہمت بڑھائی اور پاکستان پر کھلم کھلا دباؤ ڈالا جو اپنے اقتدار اعلیٰ کے تحفظ کے لئے دفاعی اقدامات کر رہا تھا۔" پاکستانی حکمرانوں نے اس وقت بھی اس طرح کا دعویٰ نہیں کیا تھا اور اب تو بعض جنرلوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ پاکستان نے شروع کی تھی تاکہ کشمیر کا سوال حل کر لیا جائے۔

چھٹی دہائی کے وسط میں اگرچہ پاکستانی رہنما یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ وہ واشنگٹن سے دور ہو رہے ہیں اور بیجنگ سے قریب، لیکن یہ سچ نہیں تھا۔ دوغلے پن کی طبی روائت کے مطابق یہ بھی ان کی ایک چال تھی۔ چین کے ساتھ پاکستان کے تپاک کے معنی یہ نہیں تھے کہ وہ مغرب سے الگ ہو گیا ہے جیسا کہ بعد کے واقعات نے پوری طرح ثابت کر دیا۔ اس چال کے پیچھے یہ تصور کارفرما تھا کہ مغربی ایشیا کے مسلم ملکوں کو دھوکہ دیا جائے جہاں امریکی مخالف لہر آئی ہوئی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس سیب کے باوجود پاکستان نے سنٹو اور سیٹو کی رکنیت برقرار رکھی بلکہ اس کی بحری فوج کے دستوں نے

جزائر فلپائن کے ساحلوں پر اور اس سے پہلے بحیرۂ عرب میں امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے کے ساتھ فوجی مشقوں میں حصہ بھی لیا۔ اس گٹھ جوڑ کا رخ بنیادی طور پر ہندوستان کے خلاف تھا تاکہ اس پر کشمیر کا کوئی حل مسلط کیا جاسکے۔ بہر حال یہ گٹھ جوڑ کسی بھی طرح نہ امریکہ کے لئے خطرہ تھا نہ پاک امریکی تعلقات کے لئے۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اس گٹھ جوڑ کے بعد بھی پاکستان کو امریکہ سے ملنے والی فوجی اور معاشی مدد کا سلسلہ جاری رہا اور پچھلی رفتار کے ساتھ ہی جاری رہا۔ در اصل اس معاملے میں بیجنگ اور واشنگٹن کے مفادات ایک ہو گئے تھے کیونکہ دونوں ہی ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کے لئے پاکستان کا مہرہ استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ۱۹۶۲ء کی چینی جارحیت اور ۱۹۶۵ء کی امریکی جارحیت دونوں ہی کا مقصد ایک جیسا تھا یعنی یہ کہ طاقت کے ذریعے ہندوستان کا علاقہ چھین لیا جائے۔ اس سے واشنگٹن کا مفاد بھی وابستہ تھا کیونکہ وہ بھی ہندوستان کو "سبق دینا چاہتا تھا"۔ اس طرح توسیع پسندی کے مشترکہ مقصد کی بناء پر بیجنگ اور واشنگٹن نے پاکستان کے فوجی حکمراں ٹولے کی حمائت کی اور آج بھی حمائت کر رہے ہیں۔ اور یوں پاکستان بیجنگ اور واشنگٹن کو آپس میں جوڑنے والی ایک کڑی بن گیا۔

نئی دلی میں قائم دفاعی مطالعے اور تجزیئے کے ادارے نے دو متوازی ماورائے قراقرم سڑکوں کے فوجی مضمرات کا تجزیہ کر کے ہندوستانی عوام کی زبردست خدمت انجام دی ہے جنہیں چینیوں نے پاکستان کی مدد سے بنایا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس طرح چین فوجی طور پر بحر ہند کے ساحل تک پہنچ جائے۔ اس میں امریکہ کی مدد و حمائت بھی مضمر ہے۔

پہلی سڑک جو نام نہاد آزاد کشمیر میں گلگت کو چین کے سنکیانگ صوبے میں اسکاردو سے جوڑتی ہے اور ہر موسم میں آمد و رفت کے قابل ہے بن کر تیار ہو چکی ہے۔ یہ سڑک ایک کروڑ روپئے کی لاگت سے بنائی گئی ہے اور کشمیر میں تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کا احاطہ کرتی ہے۔ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی یہ سڑک ۵ ہزار میٹر لمبے منتاکا درے سے ہوتی ہوئی ہمالیہ کے قراقرم پہاڑی سلسلے سے باہر نکل جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے جس سفر میں دو ہفتے لگتے تھے وہ صرف ۹ گھنٹوں کا ہو گیا ہے۔

جیسا کہ چین کو بھیجے گئے ایک ہندوستانی مراسلہ میں کہا گیا ہے' اس سڑک کی

تعمیر واضح کر دیتی ہے کہ "ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ کو نقصان پہنچانے کے لئے چین نے پاکستان کے ساتھ ساز باز کر رکھی ہے اور ہندوستان و پاکستان کے تعلقات کو بگاڑنے کی چینی پالیسی کا ثبوت ہے۔"

آیئے اب ایک اور نقطۂ نظر سے اس مسئلے کا جائزہ لیں۔

جنرل ضیاء الحق کی فوجی سرکار مغربی ملکوں سے ترقی یافتہ نیوکلیائی ٹکنولوجی حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس نے وہاں کی متعدد فرموں کے ساتھ سودے بھی طے کر لئے ہیں۔ مثلاً برطانیہ میں پاکستانی حکومت نے ۳۰ سے زائد انورٹر خریدے ہیں جو مرکز گریز گیس کے خاص اجزاء ہیں۔

مغربی ملکوں کی کمپنیوں کے سربراہوں اور سرکاری تنظیموں کو جو نیوکلیائی ٹکنولوجی کی لین دین کی اجازت دیتی ہیں بلا شبہہ پوری طرح معلوم تھا کہ پاکستان نے نیوکلیائی تجربات پر پابندی کے معاہدے اور نیوکلیائی اسلحوں کے عدم پھیلاؤ کے سمجھوتے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے ایسے سودوں کی اجازت دی جو امن اور قوموں کی سلامتی کے لئے خطرناک ہیں۔ بعض لوگوں نے زبردست منافع حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا' دوسروں نے ایشیا میں ایک مغرب نواز حکومت کو فراہم کرنے کے لئے۔ پاکستان ترقی کی سطح کے لحاظ سے دنیا کی ۴۳ سب سے زیادہ غریب قوموں میں ۲۴ ویں نمبر پر ہے۔ لیکن عسکریت بندی کے اعتبار سے وہ ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کی بہت ساری ریاستوں سے کہیں زیادہ آگے ہے۔

یہ بنیادی طور پر امریکہ ہے جو پاکستان کو اسلحہ بٹورنے میں مدد دے رہا ہے۔ ریگن سرکار نے پاکستان کی حکومت کو ۳٫۲ ارب ڈالر کی مالیت کی فوجی مدد دی ہے۔ اسلام آباد بھاری ٹینک' خودکار بڑی توپیں' ہارپون جہازی میزائیل جو بری نشانوں پر مار کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہیں اور ایف۔ ۱۶ فائٹر بمبار حاصل کر رہا ہے۔

پاکستان مجموعی طور پر ۴۰ ایف۔ ۱۶ طیارے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ سان فرانسسکو کے اخبار "ٹریبون" نے صاف صاف لکھا ہے کہ پاکستان امریکہ کے ایف۔ ۱۶ جیٹ طیاروں کو ایٹم بم کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے۔ ایک اور وسیلہ

بھی سامنے آیا ہے جس سے پاکستان نیوکلیائی اسلحوں کے استعمال کے وسائل حاصل کرسکتا ہے۔ ایک بڑے پیمانے کا سمجھوتہ مغربی جرمنی کی میزائیل بنانے والی فرم اوٹراگ کے ساتھ ہوا ہے جس کے تحت پاکستانی فوج کو درمیانہ دوری پر مار کرنے والی میزائیلیں بڑی تعداد میں مل جائیں گی۔ منصوبہ یہ ہے کہ پاکستان میں ایک کارخانہ لگایا جائے گا جہاں مغربی جرمنی کے فراہم کردہ اجزاء جوڑ کر میزائیلیں بنائی جائیں گی۔

امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی اور فرانس نے بہ ظاہر یہ تاثر دیتے ہوئے کہ وہ اسلام آباد کی نیوکلیائی امنگوں کے مخالف ہیں، ان کی تکمیل کے لئے مادی اور تکنکی بنیاد تیار کرنے میں پوری مدد دی ہے۔

واشنگٹن نے حقیقتاً ان مجنونانہ تیاریوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں جو ایٹمی اسلحے کا تجربہ کرنے کے سلسلے میں اس کے جنوب ایشیائی حلیف ملک میں جاری ہیں۔

امریکہ کی شہ پر پاکستان نے خود کو جمہوری افغانستان کے خلاف تخریبی اقدامات کے سلسلے میں ایک اہم اڈہ بنا دیا ہے۔ پاکستان میں پینٹاگان کے اڈوں کے قیام کی تجویز زیر غور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کے پانچ شہروں میں الیکٹرونک جاسوسی کی سہولیات سرگرم ہیں جن کا عملہ امریکی تکنک دانوں پر مشتمل ہے۔ انہیں سوویت یونین، ہندوستان، افغانستان اور خلیج فارس کے ملکوں کے "چھان بین" کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ واشنگٹن کے سیاستداں اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر رہے ہیں کہ نیوکلیائی اسلحوں کی تیاری کی مہم کا ایک خطرناک ترین دور پاکستان میں شروع ہو چکا ہے۔

پاکستان کا نیوکلیائی پروگرام جنوبی ایشیا ہی میں نہیں بلکہ دوسرے علاقوں میں بھی امن پسند قوموں میں تشویش پیدا کر رہا ہے۔ اور اسکی واضح وجوہات بھی ہیں۔

۱۹۸۴ء میں امریکہ میں ایک پاکستانی این۔ اے۔ وحید کو گرفتار کیا گیا۔ اس نے امریکی کسٹم کے افسران کو بتایا کہ وہ جو سامان اپنے ساتھ لے جا رہا ہے وہ "سرکاری آلات" ہیں۔ یہ آدمی دراصل ایک نیوکلیائی آلے کے اجزاء لے جا رہا تھا جس میں اعلےٰ رفتار کی سوئچیں بھی شامل تھیں جن کا استعمال اسٹارٹرس میں کیا جاتا ہے۔ امریکہ کے اسسٹنٹ اٹرنی سام لنگھوریا کا کہنا تھا کہ اس شبہہ کی بنیادیں موجود ہیں

کہ وئیدنے یہ کام پاکستان سرکار کے حکم پر کیا ہے اور یہ اجزاء ایٹم بم کے لئے جا ئے جا رہے ہیں۔

نیویارک کے کینیڈی ہوائی اڈے پر زرکونیم کا ایک ڈھیر پکڑا گیا جو ایٹمی ری ایکٹرون کی تعمیر میں کام آتا ہے۔ خصوصی اجازت کے بغیر بیرونی ملکوں کو اس دھات کی فراہمی پر امریکہ میں پابندی عائد ہے۔ اس کا مالک ایک سابق پاکستانی کرنل تھا جس نے دعویٰ کیا کہ وہ صدر ضیاء الحق کا دوست ہے۔

ان واقعات کے سامنے آنے سے پہلے کناڈا کی پولیس نے امریکہ کا الیکٹرونک آلہ ضبط کیا جو یورینیم کو طاقتور بنانے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور پاکستان بھیجا جا رہا تھا۔ اسی طرح برطانیہ اور ارجنٹائنا میں پاکستانی سفارت خانوں سے وابستہ افراد نے "خاص قسم کے فولادی ڈھانچے" خریدنے کی کوشش کی جو صرف ری ایکٹروں کے خاص حصوں میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔

امریکہ اور دوسرے ملکوں کے سائنسدانوں اور ماہروں کو یقین ہے کہ ۹۰ویں دہائی کے نصف اواخر میں خصوصی طور پر طاقتور بنائے گئے یورینیم کی جو مقدار پیدا ہوگی وہ اتنی ہوگی کہ ہر سال چھ بم بنائے جا سکیں اس طرح ۱۹۹۰ء تک فوجی سرکار کے پاس تقریباً ۲۰ نیوکلیائی ہتھیار جمع ہو جائیں گے۔

امریکی سنیٹ کے ممبر الان کرانسٹون کا کہنا ہے کہ پاکستانی سائنسدانوں نے نیوکلیائی تجربے کے لئے پیڈ بھی تیار کر لیا ہے لیکن تجرباتی دھماکہ ۱۹۸۶ء میں ہی کیا جائے گا جب دوطرفہ سودے بازی کے تحت انہیں امریکہ سے باقی ۱۲۸ ایف-۱۶ طیارے اور دوسرے اسلحے مل چکے ہوں گے جنکی مالیت ۳،۲ ارب ڈالر ہے۔

اسلام آباد کو ملنے والی امریکی فوجی مدد پر ساری دنیا میں سخت تنقید کی جا رہی ہے۔ اس سخت احتجاج کی اصل وجہ پاکستان کا ایٹم بم ہے۔ لیکن امریکہ کی حکومت نے ایشیا میں اپنی توسیع پسندانہ اغراض کے لئے خود اپنی آئینی پابندی کو نظر انداز کر دیا۔ قانون کے مطابق ان ملکوں کو جو عنقریب نیوکلیائی اسلحے بنانے جا رہے ہیں معاشی مدد بھی نہیں دی جا سکتی۔

اسلام آباد امریکہ کی ساز باز کے ساتھ جس نیوکلیائی پروگرام کو عملی روپ دے رہا ہے اس کا خاص نشانہ ایشیائی قومیں ہی ہو سکتی ہیں۔ اگر پاکستان کی فوجی حکومت کو

چند درجن نیوکلیائی اسلحے اور ۱۶ ایف۔ ۱۶ طیارے مل گئے جو عام تباہی کے ان بھیانک اسلحوں کو نشانہ تک پہنچاتے ہیں تو سمجھئے کہ اس برا عظم کے سر پر ہلاکت خیز خطرہ منڈلانے لگے گا۔ خود پاکستانی عوام کے لئے بھی یہ پالیسی کچھ کم خطرناک نہیں۔ قومی بجٹ کا بڑا حصہ اسلحہ سازی کی دوڑ کی نذر ہو رہا ہے جبکہ ملک کی فی کس آمدنی آج بھی دنیا میں سب سے کم آمدنی والے ملکوں کی سطح سے آگے نہیں بڑھی۔ عام پاکستانی شہری کو ان "دفتری آلات" اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی خاصی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے جن کے حصول کا سلسلہ ان کے رہنماؤں نے جاری رکھا ہے۔

پاکستان کے نیوکلیائی بم کے سلسلے میں چین کا رول کیا ہے؟ اس سلسلے میں ڈاکٹر آر۔ آر۔ سبرامنیم نے کچھ حقائق جمع کئے ہیں جن سے پاکستان کی نیوکلیائی عسکریت بندی کے معاملے میں چین کے رول پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

حال ہی میں واشنگٹن پوسٹ میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں کہا گیا ہے کہ سراغرساں اداروں کے پاس اس بات کے خاصے شواہد موجود ہیں کہ چین نیوکلیائی بم بنانے میں پاکستان کی مدد کر رہا ہے۔ کچھ مہینے پہلے نیویارک ٹائمز میں بھی ایسی ہی خبر چھپ چکی ہے۔ ان خبروں کی بنیاد کیا ہے، یہ بات واضح نہیں لیکن ان دونوں ہی خبروں میں جو مشترکہ چیز یہ ہے کہ چین حفاظتوں کی فکر کئے بغیر نیوکلیائی سامان برآمد کر رہا ہے۔ اب تک صرف ارجنٹائنا نے اس کی توثیق کی ہے کہ اسے اپنا ۲۰ فیصد زیادہ طاقتور بنایا گیا یورینیم بیرونی زرمبادلہ کی ادائیگی کے بعد چین سے حاصل ہوا ہے۔

چین نیوکلیائی فراہمیوں کے اس گروپ کا ممبر نہیں ہے جس کا مرکز لندن ہے۔ نہ وہ نیوکلیائی عدم پھیلاؤ سے متعلق معاہدے کا ممبر ہے اور نہ ہی بین الاقوامی ایٹمی انرجی کمیشن کا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نیوکلیائی اسلحے رکھنے والی واحد ایسی ریاست بن گیا ہے جو ایسے کسی روائتی ضابطے کا پابند نہیں ہے جس کا اطلاق اس وقت نیوکلیائی برآمدات پر ہوتا ہے۔

مارچ ۱۹۷۵ء میں جب ۷۰ قوموں کا جو عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کر چکی ہیں، جنیوا میں اجلاس ہوا تھا تو چین نے اس معاہدے کو ردی کاغذ کا ٹکڑا قرار دیا تھا۔ یہ معاہدے میں شریک فریقوں کی پہلی جائزہ جاتی کانفرنس تھی۔ ہندوستان اور ارجنٹائنا کی طرح پاکستان نے بھی اس معاہدے پر دستخط نہیں کئے ہیں۔

چین نے نیوکلیائی اسلحوں کی تیاری کے لئے زیادہ طاقتور بنانے اور ری پروسیس کرنے کی ٹکنولوجی سے متعلق خاصی تکنکی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ یہ بیجنگ کے ایٹمی انرجی ادارے کے سربراہ ڈاکٹر کیان سان جیانگ تھے جنہوں نے گیسوں کے افتراق کے کارخانوں کی جو یورینیم کو زیادہ طاقتور بناتے ہیں، داغ بیل گنسو صوبے کے لانچ ایو مقام پر ڈالی۔ چینگدری میں نیوکلیائی تحقیق کا مرکز واقع ہے جو سیچوان صوبے کے ۱۷ پلوٹنیم بنانے والے ری ایکٹروں کے کام میں تال میل پیدا کرتا ہے۔ یہ ری ایکٹر اسلحوں میں کام آنے والی سطح کا پلوٹنیم تیار کر رہے ہیں۔

اس طرح کے ری ایکٹروں کو چلانے کے لئے بھاری واٹر کی مناسب سپلائی ضروری ہے۔ چین میں تقریباً ۵ ٹن بھاری واٹر ہر سال پیدا ہوتا ہے جو الیکٹرولیسز پروسیس کی مدد سے پیدا کیا جاتا ہے۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۷۶ء کے بعد پاکستان کو اپنے کناڈا میں بنے کا فرپ ری ایکٹر کے لئے بھاری واٹر ملنا بند ہو گیا کیونکہ اس نے اوٹاوا کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ پورے تحفظات فراہم کئے جائیں۔ اس لئے غالب قیاس یہ ہے کہ بھاری واٹر کے سلسلے میں پاکستان میں جو قلت محسوس کی گئی ہوگی اسے چین نے پورا کیا۔ یہ بھی خبر ہے کہ چین کے سائنسداں پچھلے کچھ دنوں سے گیس مرکز گریز ٹکنولوجی پر کام کرتے رہے ہیں۔ پاکستان اس طرح کی ٹکنولوجی کی "یورنکو" ڈیزائنوں کا مال ہے، ہو سکتا ہے اس نے چین کو یہ ٹکنولوجی فراہم کی ہو۔

امریکی محکمۂ خارجہ سے وابستہ ایک وکیل ڈاکٹر جیمس میلون جو نیوکلیائی عدم پھیلا کے مسائل سے خاص تعلق رکھتے ہیں جنرل ورنن والٹرس کے فوراً بعد ستمبر ۱۹۸۲ء میں بیجنگ گئے تھے جو صدر ریگن کے خصوصی سفیر تھے۔ اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ چین کو مناسب تحفظات کی غیر موجودگی میں نیوکلیائی ٹکنولوجی اسلام آباد کو فراہم کرنے سے باز رکھا جائے۔ امریکہ نے تو اس سوال پر یہ دھمکی بھی دی تھی کہ وہ چین کے ساتھ اپنا نیوکلیائی اشتراک ختم کر دے گا۔

حال ہی میں امریکی وزیر خارجہ جارج شلز نے بھی خبروں کے مطابق چینی رہنماؤں سے بات چیت کے دوران یہ معاملہ اٹھایا تھا۔

بیجنگ میں مقیم کچھ امریکی ذمہ داروں نے حال ہی میں کہا کہ چین کی وزارت خارجہ

کو ابتدا میں یہ نہیں معلوم تھا کہ نیوکلیائی صنعت کی نئی نئی قائم ہونے والی وزارت (جس کا نام پہلے دوسری مشین ساز صنعت تھا) اس طرح کی برآمدات میں دل چسپی رکھتی ہے۔

اپریل ۱۹۸۰ء میں چینی حکمرانوں نے بھاری واٹر اور طاقتور بنائے گئے یورینیم کے اپنے فالتو حصے کی برآمد کے لئے جاپان کی کمپنیوں سے مدد چاہی تھی۔ ابھی حال میں چینیوں نے پھر جاپان کو طاقت ور بنائے گئے یورینیم کی فراہمی کی پیش کش کی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس طرح کی برآمدات کے سلسلے میں جاپان کو بیچ میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اب اگر 'واشنگٹن پوسٹ' کی اطلاع کے مطابق یہ مان لیا جائے کہ پلاٹونیم امپلوزن عمل میں لانے والے میکانزم کے سلسلے میں چین نے پاکستان کی مدد کی ہے تو یقیناً یہ فوجی مصلحتوں سے کی گئی ہوگی تجارتی مفاد کے تحت نہیں۔

پاکستان کا بھاری واٹر کا دیسی کارخانہ ملتان میں ہے۔ جیسا کہ پاکستان کے ایٹمک انرجی کمیشن کے سربراہ ڈاکٹر منیر احمد خاں کا کہنا ہے یہ کارخانہ اتنی صلاحیت رکھتا ہے کہ ملک کو درکار ۱۴ ٹن بھاری واٹر سالانہ فراہم کر سکے۔

لیکن یہ کارخانے ابھی تک تیار نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ چین جو ۵۰ ٹن بھاری واٹر تیار کرتا ہے اس پوزیشن میں ہے کہ سچوان صوبے میں واقع اپنے ۱۷ ری ایکٹروں کی ضرورت پوری کرنے کے بعد ۱۴ ٹن یا اس سے زائد بھاری واٹر پاکستان کو دے سکے۔ چین نے ۱۹۷۱ء سے ہی نیوکلیائی ہتھیاروں کا تجربہ شروع کیا ہے اور آج اس کے پاس بھاری واٹر کی اتنی مقدار موجود ہے کہ اسے باہر بھیج سکتا ہے۔

امریکہ کے خفیہ اداروں کا کہنا ہے کہ یہ خبر انہیں برطانوی وسیلوں سے ملی ہے کہ چین نہایت اہم نیوکلیائی اجزاء کی فراہمی کے سلسلے میں پاکستان کی مدد کر رہا ہے۔ لیکن کسی نے بھی یہ نہیں بتایا کہ چین نے پاکستان کو کیا چیزیں فراہم کی ہیں۔

دسمبر ۱۹۸۲ء میں جب ضیاء الحق واشنگٹن گئے تھے تو 'واشنگٹن پوسٹ' کے ایک نامہ نگار نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا کہوٹا میں ۱۰ ہزار مرکز گریز آلات ہیں جو ایک منٹ میں ایک لاکھ چکر لگاتے ہیں، تو انہوں نے جواب میں اس کے متعلق قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔

ایک اور سطح پر ڈاکٹر منیر احمد خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے

یورپ کے صحافیوں کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ہنپٹک میں لگاری پروسیسنگ کا پائلٹ کارخانہ ایک سال میں ۶ کلوگرام پلوٹینم تک ری پروسس کر سکتا ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یونین کے ری پروسیسنگ کارخانے میں چینیوں نے جو تجربہ حاصل کیا ہے اس نے پاکستانی سائنسدانوں کو اس قابل بنایا ہے کہ فرانس کی طرف سے فراہمی روک دیئے جانے کی وجہ سے ۵ فیصد کا جو بنیادی گھاٹا آیا ہے وہ پورا کر لیا جائے؟ اس کا کوئی ٹھوس جواب ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔

دفاعی میدان میں چین پاک تعاون نے جو دفاع سے متعلق صنعتوں کے قیام اور فوجی عملے کی تربیت دونوں ہی شعبوں کا احاطہ کرتا ہے لگ بھگ وہی سطح حاصل کر لی ہے جو امریکہ اور اس کے حلیفوں کے باہمی تعلقات کی سطح ہے۔ اسی لئے بیجنگ جنوبی ایشیا سے متعلق اپنی پالیسی کا تعین کرتے ہوئے پاکستان کو سبھی پر فوقیت دیتا ہے۔ اس گہرے فوجی تعاون کی تین وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو چین کا یہ خیال ہے کہ چین پر پاکستان کے انحصار سے ہندوستان پر دباؤ پڑ سکے گا۔ دوسرے یہ کہ چین اس بات کے سارے امکانات ختم کر دینا چاہتا ہے کہ سوویت یونین کے بارے میں پاکستان کوئی حقیقت پسندانہ موقف اختیار کر سکے اور تیسرے یہ کہ چین قدامت پسند مسلم ملکوں میں اپنا اثر بڑھانے کے لئے پاکستان کی موجودہ پوزیشن سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اور بلاشبہ پاکستان نے عرب دنیا میں بیجنگ کی نئی گھس پیٹھ کو فروغ دینے کے سلسلے میں قدامت پسند مسلم دنیا کے ساتھ چین کے تعلقات کے قیام میں اسے مدد دی بھی ہے۔

افغانستان کے حالیہ واقعات کے بعد بیجنگ۔ اسلام آباد تعلقات کو نئے سرے سے بڑھاوا ملا۔ پاکستان کو چین سے جو فوجی ساز و سامان ملا ہے۔ اس میں دو اسکواڈرن ٹی۔ ۵۴ اور ٹی۔ ۵۹ ٹینک جاسوسی کی غرض سے پرواز کرنے والے بی ٹی۔ ۶۷، بکتر بند بردار بی ٹی آر' ۸۵ اور ۱۰۰ ملی میٹر کی توپیں اور ۱۰۰ ملی میٹر کے طیارہ شکن توپیں شامل ہیں۔ خبر یہ ہے کہ چین نے ۸۳-۱۹۸۲ء میں پاکستان کو بڑی تعداد میں ایف۔ ۶ اور ایف۔ ۷ فائٹر اور ٹی یو۔ ۱۶ اور ٹی یو۔ ۱۴ بمبار جہاز فراہم کئے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں پاکستان بحریہ نے آبدوزوں کا پیچھا کرنے والی اور پہرہ دینے والی کشتیوں کے علاوہ رومیو کلاس کی دو آبدوزیں بھی حاصل کی تھیں۔

ٹھیک اسی وقت امریکہ نے چین کو بڑے پیمانے پر ہتھیاروں کی فراہمی شروع کر دی۔

'ایرو اسپیس ڈیلی' کی اطلاع کے مطابق امریکہ کے خارجہ، دفاعی اور تجارتی محکموں نے جس فہرست کو منظوری دی اس میں ویسٹنگ ہاؤس ٹی پی ایس۔۴۳ اور ٹی پی ایس۔ ۶۳ ٹیکٹیکل اور جائزہ جاتی فضائی دفاعی راڈار، ریتھیون ا۔ ہاک طیارہ شکن میزائیلیں اور ہگس ٹی او ڈبلیو اینٹی ٹینک میزائیلیں شامل تھیں جو چین بھیجی جانی تھیں۔ اس فہرست کو "غیر معمولی طور پر خفیہ" کہا گیا اور اس پر یہ درج کیا گیا کہ "چین کو اس کے فوجی الیکٹرونکس آلات کی تجدید کاری کے لئے دی جانے والی مدد کے سلسلے میں پہلا قدم ہے"۔ فوجی الیکٹرونکس ایک ایسا میدان ہے جس میں ماڈرن محاسوں، فضائی حملے سے دفاع کرنے والے راڈاروں اور فائٹر کنٹرول نظاموں سے کام لینے کی صلاحیت چین میں قریب قریب نہیں کے برابر ہے۔"

راڈاروں کے ٹی پی ایس۔۴۳ سلسلے کا (جس کے جدید ترین نمونے ای ایف اور جی ماڈل ہیں) امریکہ اور ۲۰ دوسرے ملکوں کی مسلح افواج بڑے پیمانے پر استعمال کر رہی ہیں۔ ان بیرونی ممالک میں جن کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اس کا استعمال کر رہے ہیں مراقش اور سعودی عرب شامل ہیں۔ اس کے شہری ماڈل سوئٹزر لینڈ اور ایک گمنام جنوبی امریکی ریاست کو فراہم کئے گئے ہیں۔ غالب قیاس یہ ہے کہ وہ جنوبی امریکی ریاست ارجنٹائنا ہے۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ اس کی ایک ترقی یافتہ شکل کو سوئٹزر لینڈ کے دفاعی نظام کی تجدید کاری کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ فضا میں لے جائے جانے کے قابل ہلکے قسم کا ایک راڈار ہے جو اس طرح بنایا گیا ہے کہ مختلف طرح کے فوجی حالات میں انسان بردار طیارے بھی اسے استعمال کر سکیں اور سام بیٹریاں بھی۔ یہ فائٹر یا فائٹر بمبار ہوائی جہازیں لگی۔ ۲۰۴ ملی میٹر توپوں کو ٹھوس سہ زاویاتی تحفظ فراہم کر سکتا ہے اور ۶ چینلوں میں اشاریاتی موازنوں کے ذریعے ایک وسیع علاقے کی بلندی کی پیمائش کر سکتا ہے۔ اس میں آلات کو وسیع طور پر بہتر بنانا اور کارکردگی کی صلاحیت بڑھانا بھی شامل ہے۔

ٹی پی ایس۔ ۶۳ ٹیکٹیکل سرویلینس راڈار ترسیلی اور حرکی اقدامات کے لئے بنایا گیا ہے، مگر اسے نصب بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہوائی تحفظ کے ٹیکٹیکل اقدامات

پر پرکم بلندی پر نظر رکھتا ہے۔ یہ راڈار اپنے حلیف آلے ٹی پی ایس۔ ۶۵ کے ساتھ اس لئے بنایا گیا تھا کہ امریکی بحریہ کے دستوں کی ضرورت پوری کر سکے اور یہ دونوں ہی راڈار مائیکرو الیکٹرونکس اور سالڈ اسٹیٹ ٹکنک دونوں ہی کا وسیع پیمانے پر استعمال کرتے ہیں۔ ایک ترقی یافتہ ایم ٹی کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے ایک مربع میٹر کے نشانے کا پتہ لگانے کا ۹۰ فیصد امکان ہے۔ عددی ایم ٹی ایک چار تپس کینسلر کا استعمال کرتا ہے۔ کے درمیان جو فرق ہے اسے گھٹایا بڑھایا جا سکتا ہے اور موصول ہونے والی لہروں کی مدد سے چلتے ہوئے طیارے کا پتہ لگا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ایسی رفتار کا سدباب کہا جا سکتا ہے جو ایم ٹی۔ ا راڈار پر نظر نہیں آتی۔

ریتھیون۔ اہاک میزائیل دشمن کے ہوائی حملے کے خلاف فضائی تحفظ فراہم کرتی ہے۔ یہ میزائیل راستہ روکنے کے لئے آواز سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ پرواز کرتی ہے اور ہر طرف سے حملہ آور طیارے پر الیکٹرونک جوابی اقدامات کی موجودگی میں بھی موثر ثابت ہوتی ہے۔ اس کی لمبائی ۵٫۰۳ میٹر اور وزن ۶۲۷٫۳ کلوگرام ہے۔

ٹی او ڈبلو ٹینک شکن میزائیل کا نشانہ ٹھہرے ہوئے اور متحرک دونوں طرح کے نشانوں پر بے انتہا اچوک ہے۔ ساتھ ہی وہ کنکریٹ کی بھاری رکاوٹوں، اور مضبوط بنکروں نیز ٹینکوں کو ایک میل کی دوری سے نشانہ بنا سکتی ہے۔ ٹی او ڈبلو میزائیل کا وزن ۷۶ کلوگرام ہے، ۱۱۶ سینٹی میٹر لمبی ہوتی ہے اور اس کا قطر ۱۵ سینٹی میٹر ہے۔ دغائی سے پہلے کا وزن ۱۹ کلوگرام ہوتا ہے۔ اس میں دو سالڈ حرکی انجن، ایک دغائی کا انجن اور ایک پرواز کا انجن ہوتا ہے۔ دغائی کا انجن میزائیل کو باہر نکالتا ہے" مگر دغائی کے پیڈ سے باہر نکلنے سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ پرواز کا انجن صرف اس وقت کام کرنا شروع کرتا ہے جب میزائیل کئی میٹر آگے جا چکا ہوتا ہے۔ اس لئے دغائی کرنیوالے کو خارج ہونے والی گیس اور دوسرے اجزاء سے بچانے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔ پرواز کا انجن میزائیل کے بیچ میں ہوتا ہے اور دونوں طرف گیس کے اخراج کے لئے سوراخ بنے ہوتے ہیں تاکہ رہنمائی کرنے اور نظر رکھنے والے آلات جو اس کے پیچھے لگے ہوتے ہیں بغیر کسی رکاوٹ کے کام کر سکیں۔

اس طرح چین امریکہ اشتراک بے پناہ نوعیت حاصل کر گیا ہے۔ حالانکہ

ان دونوں کے باہمی رشتے اسلام آباد اور بیجنگ کے تعلقات اور اسلام آباد اور واشنگٹن کے باہمی رشتوں سے قطعی مختلف ہیں۔ لیکن یہ بات بیحد صاف ہو چکی ہے کہ ریگن سرکار دونوں ملکوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ قریبی سیاسی، جنگی اور فوجی رشتے قائم کرنے کی بے انتہا خواہاں ہے۔ بیجنگ بھی کچھ کم پر جوش اور پر تپاک نہیں ہے، مگر وہ رشتہ مساوی بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے۔

لیکن ایشیا میں چین کی توسیع پسندانہ پالیسیوں کا سب سے زیادہ تشویشناک پہلو یہ ہے کہ وہ یورپ میں امریکی میزائیلوں کی تنصیب کے عمل کی حمائت کرنے کو بھی تیار ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے، ۱۹۸۳ء کے اواخر میں چینی رہنما دینگ سیاؤ پنگ نے کہا تھا کہ یورپ میں امریکی میزائیلوں کی تنصیب موجودہ بین الاقوامی حالات کے تحت "ناگزیر" ہے۔ یہ بات یورپی برادریوں کے کمیشن کے سربراہ گاسٹون تھورن سے اس وقت کہی گئی تھی جب وہ دینگ سے ۶ر نومبر ۱۹۸۳ء کو ملے تھے۔

سرکاری خبر رساں ایجنسی سنہوا نے میزائیل کے بارے میں دینگ کے خیالات کا تو ذکر نہیں کیا البتہ صرف اتنا لکھا کہ "ہم نے ہمیشہ یہ امید رکھی ہے کہ یورپ متحد اور مضبوط بنے گا۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی امید ہے کہ یورپی ممالک ایک آزاد پالیسی پر عمل کریں گے"۔

اس بیان پر غور کرتے ہوئے یہ بات مد نظر رکھنی چاہیئے کہ امریکی سرکار پرشنگ۔۲ نیوکلیائی میزائیل کی تنصیب پاکستان میں کرنا چاہتی ہے۔ ۱۹۸۲ء کے موسم خزاں میں جب امریکی وزیر دفاع وینبرگر اسلام آباد آئے تھے تو انہوں نے پاکستان کی فوجی پوزیشن کی اس "خصوصی اہمیت" پر زور دیا تھا جو اسے ریگن سرکار کی نظر میں حاصل ہے۔ اب اگر ان باتوں کو جوڑ دیا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اُدھر چین پرشنگ۔۲ میزائیلوں کی تنصیب کا مخالف نہیں ہے اور ادھر اُدھر امریکی پالیسی ساز ان میزائیلوں کی پاکستان میں تنصیب سے متعلق یکے بعد دیگرے اقدامات عمل میں لا رہے ہیں۔ اور اسی لئے چینیوں نے اپنی حد سے آگے بڑھ کر پاکستان کو نیوکلیائی بم بنانے میں مدد دی ہے اور امریکہ بھی اس معاملے میں پاکستان کی پوری طرح ہمت افزائی کر رہا ہے۔

ظاہر ہے ہندوستان ان خطرناک ریشہ دوانیوں کو نظرانداز نہیں کر سکتا

کیونکہ اس کی سلامتی سے ان کا براہ راست تعلق ہے۔ اسی لئے کے۔ سبرامنیم یہ کہنے میں قطعی حق بجانب ہیں کہ واقعتاً اسرائیل اور پاکستان ایک ہی سطح کے حامل ہیں۔

پاکستان والے اسرائیل اور صیہونت پر رات دن لعنت بھیجتے رہے ہیں، مگر حقیقت میں پاکستان اسرائیل کو اپنے لئے ایک نمونہ سمجھتا ہے کیونکہ دونوں ہی ریاستوں کا جنم دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ہوا ہے اور پاکستانی بھی اسرائیل والوں کی طرح خود کو جنگجو اور موعودہ قوم سمجھتے ہیں۔ اسرائیل نے بڑی کامیابی کے ساتھ نیوکلیائی اسلحے بنانے کی پالیسی اپنائی ہے۔ بہت پہلے ۱۹۷۳ء میں اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ کسی عرب ملک کو اس کی اجازت نہیں دے گا کہ وہ مغربی ایشیا میں نیوکلیائی اسلحے لانے میں پہل کرے۔ لیکن اسرائیلی جاسوسی محکمے کی اطلاع کے مطابق یہاں دو سو سے زائد نیوکلیائی اسلحوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ ایک غیر مصدقہ رپورٹ کے مطابق اسرائیل نے ۷ویں دہائی کے اوائل میں موثر بین الاقوامی نگرانی کے نافذ ہونے سے پہلے ایک تجربہ بھی کیا تھا۔ امریکہ اپنی فراخ دلی کی پالیسی کی وجہ سے اسرائیل کے خلاف نیوکلیائی عدم پھیلاؤ کا قانون استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ آج پاکستانی بھی خود کو اسی مقام پر لانا چاہتے ہیں کیونکہ انہیں یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نیوکلیائی عدم پھیلاؤ کے قانون کا استعمال ان کے خلاف کر سکتا ہے۔

ریگن سرکار نے ۱۹۸۱ء میں پاکستان کے حق میں سائمنگٹن ترمیم کے لاگو نہ کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ اس بات کا اشارہ تھا کہ پاکستانی علاقے سے ہو کر افغان باغیوں کو اسلحہ فراہم کرنے کی امریکی ضرورت نے اسے عدم پھیلاؤ کے مقاصد نظر انداز کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس وقت جب امریکی سرکار کے عہدیداران کانگریس کو پاکستان کی نیوکلیائی صلاحیت کی سطح کے بارے میں یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے، پاکستان یورینیم کو مضبوط بنانے کی اس سطح کے حصول کے لئے کوشاں تھا جہاں اسلحے بنائے جا سکتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایشیا میں بیجنگ کے توسیع پسندانہ مقاصد اور اس بر اعظم پر غلبہ حاصل کرنے کی واشنگٹن کی کوشش نے دونوں کو اس پوزیشن میں پہنچا دیا ہے کہ پاکستان ان کے لئے بے انتہا ضروری بن گیا ہے۔ ہمارے ذہن میں یہ بات بالکل صاف ہو جانی چاہیئے۔

اس عمل کے دوران پاکستان چین امریکی حکمت عملی میں ایک اہم مقام حاصل کرگیا۔ وہ جو کوشش کر رہا ہے کہ خفیہ طور پر ترکی اور سعودی عرب کو مشرق وسطیٰ کے ایک نئے حقیقی گٹھ جوڑ میں پھانس لے، اس کی وجہ یہی ہے۔ پاکستانی ڈپلومیسی ایران کو بھی اس گٹھ جوڑ میں شامل کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ نام نہاد اسلامی یکسانیت اور مشترک اقدار کی اصل نوعیت اس سے واضح ہو جاتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اسلام آباد یہ سب کچھ اپنے آپ نہیں کر رہا ہے بلکہ واشنگٹن اور بیجنگ کے اشارے پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

سیٹو اور سنٹو میں پاکستان کی شرکت سے اسے اہم سیاسی غلط اندازوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے مبہم بازانہ اقدامات کا مقدر ناکامی ہی ہو سکتی تھی۔ آج بھی پاکستان کے بہت سارے خاندان اپنے ان عزیزوں پر ماتم کناں ہیں جو ہندوستان کے ساتھ ہونے والی تین جنگوں میں اور مشرقی پاکستان کی سعئ رائیگاں کے نتیجے میں مارے گئے جو اب بنگلہ دیش ہے۔

عوام کے تبصروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی روش نہ صرف یہ کہ جنوبی ایشیا کی سلامتی کے مفادات کے خلاف ہے بلکہ سب سے پہلے خود پاکستان کے قومی مفادات کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔ حال میں بحالیٔ جمہوریت کی تحریک کے زیر اہتمام متعدد شہروں میں جو مظاہرے ہوئے ان سے ثابت ہو گیا ہے کہ پاکستانی اپنے ملک کی خارجہ پالیسی کو اپنے قومی مفادات سے ہم آہنگ نہیں سمجھتے۔

ایسی صورت میں جب کسی بھی جانب سے کوئی خطرہ نہیں، امن اور استحکام کا پاکستان کا راستہ اسلحہ سازی کی دوڑ اور بیرونی طاقتوں کی تیار کردہ گندی سازشوں کا نہیں بلکہ بات چیت اور پر امن بقائے باہم کا راستہ ہے۔

واشنگٹن کو دلچسپی اس بات سے ہے کہ پاکستان میں ایک فوجی سرکار مستحکم ہو جائے اور لچکدار لوگ وہاں کی مسلح افواج کے رہنما ہوں کیونکہ اسلام آباد کو سامراج کی عالمی حکمت عملی میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ "یہ دراصل واشنگٹن ہے جو ضیاء کی فوجی سرکار کی پشت پناہی کر رہا ہے اور پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کا راستہ روک رہا ہے" بزرگ مجاہد آزادی خان عبد الغفار خان نے مارچ ۱۹۸۴ء میں کہا تھا۔ "جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ملک میں کوئی ایسی حکومت برسر اقتدار آ سکتی ہے جو اس خطے میں

فوجی جنون بھڑکانے کی ریگن سرکار کی لائن پر عمل کرنے سے انکار کردے" وہ دراصل احمقوں کی جنت میں رہ رہے ہیں۔

دوسری طرف جنرل ضیاء اپنی پالیسی کے خلاف عوام کی بڑھتی ہوئی مخالفت کو دیکھتے ہوئے حفاظت کے لئے لگاتار بیرونی ممالک پر نظریں لگائے ہوتے ہیں۔ اور انہیں یہ تحفظ مل بھی رہا ہے۔ سی آئی اے کو پہلے ہی یہ حکم مل چکا ہے کہ وہ پاکستان میں اپنی ریشہ دوانیاں بڑھادے تاکہ ملک کی صورت حال پر نظر رکھی جاسکے اور امریکہ نواز سرکار کی پوزیشن بروقت مضبوط کی جاسکے۔ پینٹاگان وہاں ذیلی ڈھانچہ تیار کرنے کی ہر ممکن کوشش کررہا ہے جس کی بدولت امریکہ کے لئے یہ ممکن بن جائے گا کہ وہ کسی بھی وقت تیزی سے حرکت میں آنے والی اپنی فوج اور بحریہ کے پڑاؤ کے لئے اس ملک کے علاقے کو استعمال کرسکے۔

اسلام آباد میں صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے لئے واشنگٹن جو انسانی حقوق کی بڑی دہائیاں دیتا ہے پاکستان میں جمہوریت کی یکسر پامالی، کھلے عام دہشت گردی، تشدد اور بنیادی انسانی حقوق کی یکسر پامالی کو بھی نظرانداز کررہا ہے۔ ساتھ ہی واشنگٹن ہر ایسی کارروائی کررہا ہے جس کے ذریعے ان قوتوں کی فتح کو روکا جاسکے جو ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لئے کوشش کررہی ہیں۔

امریکی کانگریس کے ممبروں کا ایک وفد اسلام آباد آیا تھا، اس کے قائد کلیرنس لونگ نے کہا ہے کہ "ہم یہ مان کر چل رہے ہیں کہ پاکستان ریاستہائے متحدہ امریکہ کے لئے اسٹریٹیجک لحاظ سے ایک اہم ملک ہے خاص طور پر مغرب و مشرق کے تعلقات کے تناظر میں۔ اس لئے ہمیں وہاں برسراقتدار حکومت کی ہر طرح مدد کرنی چاہیئے۔"

لیکن پاکستان کے عوام بڑی بہادری کے ساتھ اس ملک میں جمہوریت کی بحالی اور آزادانہ خارجہ اور داخلہ پالیسی کے لئے جدوجہد کررہے ہیں۔ یہ جدوجہد بڑھتی اور پھیلتی جارہی ہے جس کا ثبوت ہیں پاکستانی فوج کے اندر پیش آنے والے حالیہ واقعات۔

(۳)

ہندوستان میں تخریب کاری

پاکستان اور اسرائیل کے درمیان ایک اور خصوصیت مشترک ہے۔ دونوں بیک وقت وجود میں لائے گئے، اسرائیل عرب ریاستوں کو نقصان پہنچانے کے لئے اور پاکستان برصغیر کی سیاست کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کے ایک خاص وسیلے کے طور پر۔

کشمیر سے واشنگٹن کی دلچسپی اس سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، جب کشمیر کی وادی پر پاکستان کے بھڑکائے ہوئے حملہ آوروں نے حملہ کیا اور یہ علاقہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک متنازعہ مسئلہ بن گیا۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے میں امریکی صحافی رابرٹ ٹرمیل نے کشمیر کے بارے میں نئی دلی سے بہت سی رپورٹیں بھیجی تھیں۔ ایک رپورٹ اس طرح تھی:

"دو امریکی سیاحوں نکول اسمتھ جو مصنف اور لکچرر ہیں اور لورن ٹٹل ... نے حالیہ ہنگامہ خیز دور میں کشمیر میں بڑے پیمانے پر سفر کرتے ہوئے ایسے آثار محسوس کئے ہیں کہ مقامی رجواڑے اور سردار صورت حال میں بگاڑ سے فائدہ اٹھاکر مہاراجہ سے اپنا تعلق توڑنے کا اعلان کر سکتے ہیں ..."

یہ سیاح تھے کون؟ میجر ٹٹل دوسری عالمی جنگ کی پوری مدت کے دوران بحرالکاہل کے علاقے میں پانچویں جنگی کیمرہ یونٹ کا کمانڈر رہ چکا تھا اور نکول اسمتھ

ایک تربیت یافتہ جاسوس تھا اور فرانس، سیام، ہندوستان اور لنکا میں اسٹریٹیجک سروسز کے دفتر کے لئے کام کر چکا تھا۔

لگ بھگ ٹھیک اسی وقت امریکی اخبارات کی خبروں کے مطابق ایک دوسرے امریکی شہری ہیٹ نے نام نہاد آزاد کشمیر فوج میں کچھ مہینوں تک برگیڈیر جنرل کی حیثیت سے کام کیا اور بڑے فخر کے ساتھ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ بہت سے ہندوؤں کو اس نے اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارا۔ فروری ۱۹۵۰ء میں سر بی۔ این۔ راؤ نے سلامتی کونسل میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"مجھے بتایا گیا ہے کہ ہندوستان اگر چاہے تو وہ سخت رویہ اختیار کر سکتا ہے اور امریکہ سے ان نقصانات کے ہرجانے کا مطالبہ کر سکتا ہے جو ہیٹ کی سرگرمیوں کے نتیجے میں اسے پہنچے میں اور اس میں صرف جانی نقصان شامل نہیں۔ یہ مطالبہ اس تمام فوجی کارروائی کے اخراجات کی ادائیگی کے لئے بھی کیا جا سکتا ہے جو آزاد افواج کی اسکی تنظیم کی کارروائیوں کی وجہ سے ضروری بن گئی تھی۔"

یہاں اس کا موقع نہیں کہ کشمیر کو ایک "آزاد ریاست" بنانے کے تصور کو فروغ دینے کے لئے امریکہ اور برطانیہ نے اقوام متحدہ کے اندر اور باہر جو رول ادا کیا اس پر بحث کی جائے۔ البتہ کچھ نئے حقائق جو سامنے آئے ہیں وہ کافی معنی خیز ہیں۔ ۱۹۵۱ء کی بعض خفیہ امریکی اور برطانوی دستاویزوں سے جنہیں اب قابل اشاعت قرار دے کر شایع کر دیا گیا ہے چھٹی دہائی میں کشمیر سے متعلق امریکہ کے موقف کی نشوونما پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ اس وقف میں جو تبدیلی اس دوران آئی وہ غیر جانبداری سے پاکستان کی طرف جھکاؤ کی تبدیلی تھی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ان دستاویزوں میں دو ٹکراؤ کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک وہ ٹکراؤ جو اسرائیل اور عرب ملکوں کے درمیان جاری تھا اور دوسرا "کشمیر کے سوال" پر ہندوستان اور پاکستان کا ٹکراؤ۔ ایک طرح سے اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ چھٹی دہائی کے اوائل میں بھی امریکہ کی پالیسی بنانے والے عرب دنیا میں اسرائیل کے رول کو اور اس برصغیر میں پاکستان کے رول کو ایک جیسا ہی سمجھنے لگے تھے۔ امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں نے "سوویت یلغار"

کے خلاف ایک بڑے گٹھ جوڑ کی بات سوچنی شروع کردی تھی جس میں مغربی حلیف، اسرائیل، عرب ممالک، ترکی اور ایران کو شامل کیا جانا تھا۔

لیکن جواہر لال نہرو کی قیادت میں ہندوستان نے اس گٹھ جوڑ میں شرکت سے انکار کردیا۔ دوسری طرف پاکستان تھا جو اس گٹھ جوڑ میں شامل ہونے کے لئے تیار تھا بشرطیکہ کشمیر اسے دے دیا جائے۔

ان حقائق کی مدد سے ہندوستان کی طرف امریکہ کے بڑھتے ہوئے معاندانہ رویہ کو اور مختلف حربوں کے ذریعے ہندستان میں تخریب کاری سے اس کی گہری دلچسپی اور شرکت کو آسانی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ بھی صاف ہوجاتا ہے کہ پاکستان ان تمام برسوں کے دوران ہندستان میں عدم استحکام پیدا کرنے کی اپنی کوششوں سے باز کیوں نہیں آیا، اور یہ بھی کہ امریکی وزیر خارجہ ڈین ایچی سن نے عرب "غیر جانبداری" کے تئیں صرف "مایوسی" کا اظہار کیوں کیا اور یہ نتیجہ کیوں نکالا کہ عرب "غیر جانبداری" اتنی خطرناک نہیں ہے جتنی جواہر لال نہرو کی غیر جانبداری۔

۲ رمئی ۱۹۵۱ کو ایک میٹنگ میں جس میں وزارت خارجہ کے عہدیداران اور امریکی جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے شرکت کی تھی پاکستان کی پوزیشن کے بارے میں جو رائے قائم کی گئی وہ اس طرح تھی:

"پاکستان جنوبی ایشیا میں ایک رول ادا کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان کی رائے عامہ ایران پر حملے کی صورت میں مزاحمت کا مطالبہ کرے گی۔ اگر کشمیر کا مسئلہ حل کردیا جائے تو ان سے کوئی بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ لیاقت پوری طرح ہمارے ساتھ ہیں۔ وہ اپنا سب کچھ تج کر آئے ہیں۔ پاکستانی بڑے بہادر اور جنگجو ہیں اور ضرورت پڑنے پر بڑی سی بڑی فوج تیار کی جاسکتی ہے۔ لیکن ایک بار پھر آلات کا مسئلہ حل کرنا ضروری ہے پاکستان ساتھ ہو تو مغربی ایشیا کا تحفظ کیا جاسکتا ہے، پاکستان کے بغیر مجھے (نائب وزیر خارجہ لیگھی م) مغربی ایشیا کے تحفظ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ البتہ ہمارے لیے پاکستان کو ہندوستان کے خلاف کوئی ضمانت دینا یقیناً ممکن نہیں ہے کیونکہ ہندستان ایک دوست ملک ہے۔"

ایک انتہائی خفیہ میمورنڈم میں جو ۱۳ مارچ ۱۹۵۱ء کو برطانوی اور امریکی جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کو دیا گیا۔ بات کچھ اور آگے بڑھائی گئی۔

"پاکستان ایک مسلم ملک ہے اور عربی زبان کو اپنانے جا رہا ہے۔ امن کے زمانے میں عراق میں پاکستانی افواج کی موجودگی یوروپی افواج کی موجودگی کے مقابلے میں نسبتاً آسان ہوگی"

ان دستاویزوں کے مطابق کشمیر مسئلے کو حل کرنے کے لئے مختلف تجاویز زیر غور آئیں۔ جن میں اسے ایک آزاد ریاست بنانے اور وادیٔ کشمیر کو تقسیم کرنے کی تجویزیں بھی شامل تھیں موخر الذکر تجویز کے تحت اننت ناگ اور سری نگر ہندوستان کو دیئے جاتے اور بارہ مولہ پاکستان کو۔ مگر ہندوستان کی رائے عامہ نے اس کھیل کو سمجھ لیا اور سارے منصوبے مٹی میں ملا دیئے۔

ان واقعات کے بعد فوجی گٹھ جوڑوں بالخصوص سیٹو اور سینٹو کے خلاف جواہر لال نہرو کے ثابت قدم موقف کے بعد جموں اور کشمیر میں تخریب کاری کا سلسلہ دو چند کر دیا گیا۔ اب شیخ عبداللہ کو جیتنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ ان دستاویزوں میں ایک جگہ لکھا گیا ہے "کہ تقسیم کے بدلے ریاست کی آزادی سے امریکہ کی دلچسپی پیدا کرنے کی شیخ نے کوشش کی تھی۔ اگرچہ ان دستاویزوں کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنے میں احتیاط سے کام لیا جانا چاہیئے، پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ چھٹی دہائی کے اوائل میں امریکہ کے پالیسی ساز آزاد کشمیر کے حق میں نہ تھے کیوں کہ انھیں خود ریاست کے اندر طاقتوں کے توازن پر یقین نہ تھا۔ ان دستاویزوں کے مطابق وزیر خارجہ مارشل نے کشمیر کو آزاد ریاست بنانے کی تجویز پر اس لیے اعتراض کیا تھا کہ اسطرح کشمیر" روسیوں کے ہاتھ لگ جائے گا"۔ اس لیے جو حکمت عملی تیار کی گئی وہ پاکستان کے ذریعے جموں اور کشمیر کے مقبوضہ علاقوں سے ریاست میں تخریب کاری کی حکمت عملی تھی۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جیسے کشمیر میں تخریب کاری کی پاکستانی کوششیں دو چند ہوتی گئیں ویسے امریکہ اسی پیمانے پر پاکستان کی فوجی طاقت بڑھانے میں حصہ لیتا رہا اگرچہ شاطرانہ چالیں وقتاً فوقتاً روپ بدلتی رہیں۔ لیکن ہندوستان سے متعلق پاکستان کی پالیسی کے اس اہم پہلو پر غور کرنے سے پہلے ایک اور حقیقت کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

خبر کے مطابق امریکہ کی تیزی سے حرکت میں آنے والی فوج نے جنوب مغربی ایشیا میں "تشویش کے علاقوں"، کا ایک نیم خفیہ نقشہ تیار کیا ہے۔ یہ نقشہ امریکی کانگریس کے بجٹ آفس کے ایک حالیہ مطالعے کا بنیادی حصہ ہے جس کا عنوان ہے۔ تیزی سے حرکت میں آنے والی فوج، پالیسی اور بجٹ سے متعلق مضمرات، یہ مطالعہ ۱۹۸۳ کے اوائل میں شائع کیا گیا۔

مغربی ایشیا میں تیزی سے حرکت میں آنے والی فوج کے دائرۂ عمل کے اس نقشے میں

سوڈان سے لے کر کوہ قراقرم تک کا علاقہ شامل ہے اور امریکی پاک فوجی گٹھ جوڑ کا پردہ اسطرح فاش ہوجاتا ہے کہ پاکستان کے پورے علاقے کو اس فوج کے دائرۂ عمل میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن نقشے کا سب سے زیادہ شرانگیز اور سنگین پہلو یہ ہے کہ پورے جموں اور کشمیر کو ہندستان سے کاٹ کر فوج کے دائرۂ عمل میں پاکستان کے ایک حصے کے طور پر نقشے میں دکھایا گیا ہے۔ یہ محض نقشہ جاتی جارحیت نہیں جیسا کہ بہت سے ماہرین ہندستان کو باور کرانا چاہیں گے۔ اس میں سنگین مضمرات موجود ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نقشہ اس بات کا دستاویزی ثبوت فراہم کرتا ہے کہ پاکستان کی فوجی حکومت مغربی ایشیا سے متعلق امریکی حربی پروگرام کا پوری طرح ساجھی دار بن گیا ہے اور تیزی سے حرکت میں آنے والی فوج نے کشمیر کو اپنا خاص نشانہ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ پاکستان عملی طور پر امریکہ کا فوجی حلیف بن گیا ہے۔

جموں اور کشمیر کی صورت حال آج افسوسناک حد تک لگ بھگ وہی ہو گئی ہے جو اگست ۱۹۵۳ء میں تھی جب شیخ عبداللہ کو اقتدار سے اس لیے ہٹایا گیا تھا کہ انہوں نے قومی مفادات کے خلاف ایک خطرناک راستہ اپنایا تھا اور ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کو کمزور کر رہے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ الحاق خود ان کی ہی قیادت میں عمل میں آیا تھا۔ اس واقعے کی بنا پر شیخ صاحب ۱۹۷۵ء کے کشمیر معاہدے تک قومی دھارے سے کٹے رہے۔

۱۹۵۳ء میں شیخ نے دانشمندی سے کام نہ لیتے ہوئے خود کو بہت بلند سمجھا تھا اور نسبتاً بھونڈے انداز میں الحاق کو چنوتی دی تھی اور اس کے لیے انہیں بھاری قیمت چکانی پڑی تو اس پر کسی کو تعجب نہ ہوا۔

لیکن ۱۹۸۵ء میں فاروق عبداللہ کی قیادت میں نیشنل کانفرنس نے تاریخ دہرانے کا ایک نیا راستہ تلاش کیا ہے۔ وہ قسم تو الحاق کی کھاتی ہے مگر ساتھ ہی کشمیری عوام میں علیحدگی پسندی کی نفسیات پیدا کر کے اس کی اصل بنیاد پر ہی کلہاڑے چلا رہی ہے۔

پنجاب میں دہشت گردی کے حالیہ عروج سے بہت پہلے پولیس نے جاسوسوں کے ایک بڑے غول کا پتہ لگایا تھا جو پچھلے کئی مہینوں سے ریاست کے پونچھ اور راجوری علاقوں سے اطلاعات نشر کیا کرتا تھا۔

خفیہ محکمے کے ایک اعلیٰ افسر نے جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا راقم الحروف کو بتایا کہ اس ٹولے کا سرغنہ ایک بااثر شخص تھا۔ واضح وجوہ کی بنا پر اس نے اس شخص کا نام نہیں بتایا۔

جاسوسوں کی یہ ٹولی جنگ بندی لائن کے اس جانب ہندوستانی افواج کے پڑاؤ کی جگہوں کے بارے میں اطلاعات جمع کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ہندوستان میں ہتھیاروں کی اسمگلنگ کر رہی تھی۔ اس افسر نے "سلامتی کی مصلحتوں" کی بنا پر یہ نہیں بتایا کہ کتنے لوگ گرفتار کیے گئے مگر اس نے یہ بتایا کہ ان میں سے کچھ جاسوسوں کو پاکستان کے خفیہ محکمے نے تربیت دی تھی اور یہ برابر پاکستان جاتے تھے۔

جاسوسی کے ساتھ ساتھ یہ لوگ پاکستان سے ہتھیار اسمگل کر کے شمالی ہندوستان میں پہنچایا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کا رابطہ آگرہ کے کسی شخص سے تھا دوسرے نے دلی میں غیر قانونی ہتھیاروں کی فروخت کا ایک اڈہ قائم کر رکھا تھا۔ یہ بتانے کے بعد افسر نے مذاحیہ انداز میں کہا کہ اگر میں نے اس حساس سرحدی ریاست میں پاکستان کے تربیت یافتہ جاسوسوں کی سرگرمیوں کی تفصیلات صحافیوں کو بتانی شروع کر دیں تو یہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے برابر ہوگا جو لوگ سرحد کے اس پار سے "اس کارروائی کو چلا رہے ہیں۔"

پاکستان نے تخریب کاری کا ایک اور ہتھکنڈہ ہندوستان میں ہیروئن کی اسمگلنگ کے روپ میں اختیار کیا ہے۔ اگر آپ اس نئی لعنت کا واضح اندازہ لگانا اور تخریب کارانہ قوتوں کے ساتھ اس کے تعلق کو سمجھنا چاہتے ہیں تو جموں اور کشمیر اور پنجاب کے سرحدی علاقوں کی سیر کریجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دو ریاستوں میں سرگرم عدم استحکام پیدا کرنے والی قوتوں اور ان اسمگلروں کے درمیان گہرا گٹھ جوڑ ہے۔ ہیروئن کی اسمگلنگ یقیناً بے حد منافع بخش دھندہ ہے۔ گولڈن کریسنٹ ممالک، پاکستان، ایران اور افغانستان افیم اور ہیروئن کی پیداوار کے روایتی مرکز رہے ہیں۔ ابھی حال تک پاکستان اور ایران کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ان نشوں کا عادی رہا ہے۔ ایران اور پاکستان کے ۱۰ لاکھ نشہ باز ہر سال ۵ سو سے ۸ سو ٹن تک افیم اور ہیروئن کا استعمال کرتے ہیں۔

ایران میں شاہ مخالف انقلاب اور افغانستان کے انقلاب کی کامیابی کے بعد ہندستان افیم اور ہیروئن کی اسمگلنگ کا خاص نشانہ بن گیا۔ امریکہ اور پاکستان دونوں ہی کے اس غیر قانونی تجارت سے مخصوص مفادات وابستہ ہیں، یہ الگ بات ہے کہ پاکستان کے فوجی حکمران بھی مذہب کی قسمیں کھاتے ہیں اور سرحد کے اس پار کے مذہبی احیاء پرست بھی۔

اسمگلنگ کو بڑھاوا دینے کے پیچھے پاکستان کی دو اغراض کا ہاتھ ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طرح کا غیر قانونی بیوپار کرنے والے بڑے سخت جان ہوتے

ہیں اور کوئی بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار رہتے ہیں اس لیے وہ جاسوسی اور دہشت گردی کے لیے بے حد موزوں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سرحد پار جانے والے بعض سکھ لڑکوں کو جب ماہرین تربیت دے چکے، تو انہیں ہیروئن کی اسمگلنگ کرنے والوں کے حوالے کردیا گیا تاکہ وہ انہیں استعمال کرسکیں۔ اس طرح مذہبی جنون کے ساتھ ساتھ پیسہ پیدا کرنے کا آسان راستہ انہیں تخریب کار قوتوں کے ہاتھ میں کھلونا بنادیتا ہے۔

جموں اور کشمیر میں جنگ بندی لائن سے لے کر پنجاب کی ہند پاک سرحد تک پورا خطہ ایک خاص قسم کی خوش حالی اور آسودہ حالی کا حامل نظر آتا ہے۔ پنجاب میں باہر جاکر پیسہ کمانے کا جو جنون ساتھا وہ اب کم ہو رہا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ گھر بیٹھے اتنا ہی پیسہ کمانے کا دروازہ اسمگلنگ کے ذریعے کھل گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان کے بعض اعلیٰ عہدے داروں نے نشیلی دواؤں کے تسکروں کیساتھ ساز باز کر رکھی ہے۔ کوئٹہ بلوچستان اور پشاور کے علاوہ اب اسلام آباد، راولپنڈی بھی نشہ آور چیزوں کی غیر قانونی تجارت کے اہم مرکز بن گئے ہیں۔

اگرچہ ابھی پاکستانی اخبارات نے جو سرکار کے کنٹرول میں ہیں ان اسمگلروں اور اقتدار کے کل پرزوں کے درمیان ساز باز پر کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے، ملک کے باہر ان اعلیٰ افسروں کے نام کھلم کھلا لیے جارہے ہیں جو اس گندی تجارت میں ملوث ہیں۔ کسی نے راقم الحروف سے یہ سوال کیا تھا کہ "اگر شہنشاہ ایران کے گھرانے کے لوگ بین الاقوامی پیمانے پر اسمگلنگ کے دھندے میں ملوث ہوسکتے ہیں تو پاکستان کے معاملے میں اس امکان کو کیوں نظر انداز کیا جائے؟"

حال ہی میں ڈنمارک کے صحافی ہینریخ کروگر کی ایک کتاب "مصدق سچائی" شائع ہوئی ہے جس میں نشہ آور اشیا کا بیوپار کرنے والوں اور ساری دنیا کے انقلاب دشمنوں کے درمیان سازباز کو ثابت کیا گیا ہے اس کا خیال ہے کہ گولڈن کریسنٹ ممالک اور سی آئی اے کو جوڑنے کا کام ایک مخصوص بچولیا کرتا ہے۔ یہ ہے عالمی کمیونسٹ دشمن لیگ۔ یہ تنظیم اس طرح کی چیزوں کے عالمی بیوپار میں تال میل پیدا کرتی ہے اور اس سے حاصل ہونے والا منافع انقلاب دشمنوں میں بانٹ کر سی آئی اے کے کام میں آسانی پیدا کرتی ہے۔

سی آئی اے نے پاکستان میں گھنا جال بچھا رکھا ہے اور ہیروئن کی تسکری سے متعلق سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتا ہے نیز اس طرح کے بڑے بیوپاریوں سے اس کے گہرے سمبندھ ہیں۔ ظاہر ہے یہ لوگ پاکستان کے بس میں نہیں ہیں۔ اس طرح پاکستان میں ہیروئن کی تسکری کرنے والوں نے

"ریاست کے اندر ریاست" قائم کر رکھی ہے۔ جنھیں سی آئی اے کی پوری پناہ حاصل ہے۔

بے بسی کے باوجود پاکستان ان تخریب کاروں پر بھروسہ کئے ہوئے ہے جنھیں سی آئی اے نے تربیت دی ہے۔ مری ضلع میں جبرات میں اور حاجی پیر درہ کے قریب مقبوضہ کشمیر کے عدیل آباد ضلع میں اس نے دہشت پسندوں کی تربیت کے کیمپ قائم کر رکھے ہیں جہاں ان لوگوں کو تربیت دی جارہی ہے جو پنجاب میں فوجی کارروائی کے دوران سرحد پار کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔

سرحد پار سے آنے والی اطلاعات مظہر ہیں کہ ان کیمپوں میں چھاپہ مار کارروائیوں اور ہوائی جہاز ہائی جیک کرنے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ باوثوق وسائل کا کہنا ہے کہ بعض دہشت پسندوں نے پوچھ گچھ کے دوران اس کا اقبال کیا ہے۔ ان خبروں سے یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ پاکستان نے چھاپہ مار کارروائیوں کے لیے ایک کمان بھی بنا رکھی ہے جس کا مقصد جموں اور کشمیر نیز پنجاب میں اس طرح کی کارروائیوں کی رہنمائی کرنا ہے، اور یہ کہ پاکستان نے اپنی چھاپہ مار فوج کو تین حصوں میں بانٹ رکھا ہے جس کا نام ایس ایس جی (خفیہ تخریبی گروپ) جس میں مجاہدین رضا کار اور نیم چھاپہ مار دستے شامل ہیں۔ ان دستوں کو الگ الگ کام سونپے گئے ہیں خاص طور پر کشمیر میں تخریب کاری کے کام۔ حال ہی میں انہیں نئی طرح منظم کیا گیا ہے اور ترقی یافتہ اسلحوں سے مسلح کیا گیا ہے۔ یہ مجاہد پونچھ، راجوری اور اوڑی سیکٹروں میں پھیلا دیے گئے ہیں۔

پاکستان نے چیر یکوٹ کمان پوسٹ کے قریب محمود گلی میں ایک توپخانے کا اڈہ تعمیر کیا ہے جو جنگ بندی کی لائن پر پونچھ کے قریب ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ خبروں سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ پاکستان نے سرحد کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر فوجیں اکٹھا کر رکھی ہیں اور بار بار تازہ کمک لارہا ہے۔ فوجوں کا یہ اجتماع خاص طور سے کشمیر کی سرحد پر کیا جارہا ہے اور گشت خاص طور پر راتوں کو لگائی جاتی ہے۔ یہ بھی خبریں ہیں کہ پونچھ سیکٹر میں سواجیان اور بھروٹی علاقے میں سرحدوں کے درمیان واقع زمین پر خندقیں کھودی جارہی ہیں اور جدید دفاعی آلات نصب کئے جارہے ہیں۔

اوچھی سے کاران والی تک جانے والی شاہراہ تیزی سے بنائی جارہی ہے جو علی آباد اور گلمرگ سیکٹر کو جوڑ دے گی۔ یہ ۴۰ کلومیٹر لمبی سڑک چینی ماہروں کی مدد سے بن رہی ہے۔

سکھ انتہا پسندوں اور کشمیری علیحدگی پرستوں کی آپسی سانٹھ گانٹھ کے لیے اگر کسی ثبوت کی ضرورت تھی تو وہ انڈین ایئر لائن کے سری نگر سے دلی آنے والے ہوائی جہاز کی جولائی ۱۹۸۴ء میں ہونے والی ہائی جیکنگ نے فراہم کر دیا۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت تھا کہ یہ دہشت پسند اور ان کے حامی ہوالی ریاست کے انتظامی عملے میں کس حد تک گھس چکے ہیں۔

طیارے کا اغوا کرنے والے جن میں کچھ الٹرا نوجوان بھی شامل تھے جنہیں اس پورے واقعے میں بہلا پھسلا کر پھنسایا گیا تھا اور جن کا استعمال کیا گیا تھا آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ممبر نکلے جس پر پابندی عائد ہے۔ لیکن یہ بات قطعی واضح ہے کہ یہ ۹ انتہاپسند جن کے پاس بندوقوں سے لے کر لوہے کے چھڑے تک موجود تھے کسی جادو کے ذریعے جانچ کے مرکزوں سے نہ گزرے ہوں گے جہاں دھات کی خبر دینے والے آلات نصب تھے صاف ظاہر ہے کہ پہرے داروں، چوکیداروں اور ہوائی اڈے کے عملے میں ان کے ہمدرد ضرور موجود رہے ہوں گے۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ اس وقت کشمیر میں کیا ہو رہا ہے؟

جموں اور کشمیر کے اسمبلی الیکشن کے دوران فاروق عبداللہ نے پلک جھپکتے عوامی ایکشن کمیٹی کے مولوی فاروق کے ساتھ گٹھ جوڑ بٹھالی حالانکہ ان دونوں کے درمیان ناموں کی یکسانیت کے علاوہ کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔

مولوی فاروق نے ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو کبھی حتمی تسلیم نہیں کیا اس کے علاوہ وہ شیخ عبداللہ کے کٹر مخالف تھے جنہوں نے پوری زندگی مولوی فاروق کے علیحدگی پسند رجحانات کا جم کر مقابلہ کیا۔ اس لیے یہ دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ فاروق نے جن وزیروں کو حکومت سے الگ کیا وہ سبھی شیخ عبداللہ کے دوست، پختہ ذہن اور تجربہ کار لوگ تھے اور اب بھی وزیراعلیٰ جی ایم شاہ کی حکومت اور پارٹی کے اس دھڑے کے پشت پناہ ہیں جو اس وقت برسر اقتدار ہے۔

عوامی ایکشن کمیٹی کے سربراہ میر واعظ مولوی فاروق اپریل ۱۹۸۵ء کے اوائل میں سعودی عرب اور کچھ دوسرے مسلم ملکوں کے طویل دورے کے بعد واپس آئے۔ پاکستانی شہر راولپنڈی کے اردو کے ہفت روزہ "انصاف" کی خبر کے مطابق جدہ میں نام نہاد خالصتان قومی محاذ کے لیڈروں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات مسلم یوتھ اسمبلی کے دفتر میں ہوئی اور تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہی۔

اخبار کی خبر کے مطابق "جموں اور کشمیر محاذ آزادی" کے وفد میں راجہ آزاد، راجہ پرویز اور محمد افضل شامل تھے۔ انہوں نے "محاذ کی جہد آزادی" کی تعریف کی اور محاذ کے وفد کو یقین دلایا کہ ان کی پارٹی "محاذ کے ساتھ پورا تعاون کرے گی خاص طور پر کشمیر کے اس حصے میں"۔ یاد رہے کہ اس محاذ کا بانی مقبول بٹ تھا جسے ایک سال پہلے پھانسی دی جا چکی ہے۔

برسبیل تذکرہ بتا دیا جائے کہ سعودی عرب میں اپنے قیام کے دوران میر واعظ کو رابطہ عالم اسلامی کی سپریم کونسل کا رکن چنا گیا جو ایک بین الاقوامی مسلم تنظیم ہے جس کے صدر دفاتر ریاض میں ہیں۔

میر واعظ کو نسل میں "آسطرف کے کشمیر" کے نمائندے کے طور پر شریک کیا گیا ہے، ان کے نام کی تحریک سردار عبدالقیوم خاں نے پیش کی تھی جو "آزاد کشمیر مسلم کانفرنس" کے لیڈر ہیں اور کسی زمانے میں مقبوضہ کشمیر کے صدر رہ چکے ہیں۔

رابطہ اگرچہ ایک غیر سیاسی تنظیم بتائی جاتی ہے مگر اس نے اپنے متعدد بیانات میں جموں اور کشمیر کو ایک "متنازعہ علاقہ" قرار دیا ہے اور ہندوستان کے ساتھ اس کے الحاق کو حتمی نہیں مانتی۔

یکم مئی ۱۹۸۴ء کو وزیر داخلہ نے لوک سبھا کو بتایا کہ اگرچہ ریاست کی موجودہ حکومت نے بعض اقدامات کئے ہیں لیکن اس کے باوجود قوم دشمن اور علیحدگی پسند عناصر جموں اور کشمیر میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مقبول بٹ کو پھانسی دیئے جانے کے بعد ان عناصر نے اپنی سرگرمیاں خاص طور سے تیز کر دیں۔ انہوں نے مظاہرے کئے، ہڑتالیں کرائیں۔ ساتھ ہی آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے رہنما بھی جلسے کرتے رہے اور اشتعال انگیز اور قابل اعتراض تقریریں کرتے رہے۔

ان سب کے باوجود کشمیر میں تخریب کاری کی کوشش ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی ہے اس کی وجہیں ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ وادی میں سامراج مخالف جذبات کی روایت بہت پرانی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد تخریب کاری کی بساط وسیع کی جانے لگی اور پنجاب اس طرح کی کارروائیوں کا خاص میدان بن گیا۔ بہت سے لوگ واقف ہیں کہ کسطرح ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان ساری دنیا میں گھومتے پھرے اور مبینہ "ہندو سامراج" کے مخالف اپنی کمزور آواز بلند کرتے رہے۔ اس وقت کسی نے انہیں سنجیدگی سے نہیں لیا مگر ۹ ویں دہائی کے اوائل میں خاص طور پر لوک سبھا کے لیے ہونے والے ان انتخابات کے بعد جن میں شریمتی اندرا گاندھی دوسری بار برسر اقتدار آئیں۔ پنجاب میں تخریب کاری کی کوششیں دوچند کر دی گئیں۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک علیحدگی پسند عناصر مفلوج سے رہے، یہ وہ زمانہ ہے جب جنتا پارٹی کا مرکز میں راج تھا اور پنجاب میں اکالیوں کی رہنمائی میں ملی جلی سرکار قائم تھی۔

پچھلے چار برسوں میں پنجاب میں جو کچھ ہوا ہے اس کی داستان سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ آسانی سے ٹالا نہیں جا سکتا۔ پنجاب میں "تخریب کاری کی جو کارروائیاں" کی جا رہی تھیں ان کا انداز طریقۂ کار اور ڈیزائن وہی تھا جو افغانستان میں اپنایا گیا فرق صرف اتنا تھا کہ افغانستان میں یہ کارروائیاں ہندوستان میں ابتدائی دور میں ہونے والی کارروائیوں سے کہیں زیادہ شدت رکھتی تھیں اور ہندوستان میں اصل ہاتھ پردے کے پیچھے سے کام کر رہا تھا۔

پنجاب کے واقعات کی تاریخ دہرانے کی ضرورت نہیں جن کا سلسلہ پچھلے چار برسوں سے جاری ہے البتہ بعض اہم حقائق کا ذکر ضروری محسوس ہوتا ہے۔

۹ ویں دہائی کے اوائل میں پاکستانی اخبارات پر زور شور کے ساتھ ہندوستان مخالف مہم شروع کی گئی جو حکومت کے کنٹرول میں ہیں۔ بنیادی موضوع یہ تھا کہ "سکھ حق خود ارادیت کے لیے لڑ رہے ہیں" اور پوری ثابت قدمی کے ساتھ جدوجہد میں مشغول ہیں۔

ایک طرف تو پاکستان نے اپنے یہاں جمہوریت کی بحالی کی تحریک کی ہندوستان میں غیر سرکاری حمایت پر خاص برہمی کا اظہار کیا، دوسری طرف خود صدر ضیاء الحق نے "ٹورنٹو اسٹار" کو مارچ ۱۹۸۳ء میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے یہ الزام لگایا کہ ہندوستان میں ۱۰ کروڑ مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا رہا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ پاکستان کی طرف سے "یلغار امن" کو نظر انداز کر کے سرکاری کنٹرول والے وسائل ابلاغ رات دن ہندوستان کے خلاف مہم چلاتے رہے ہیں۔ "مغربی پاکستان" نے ۹ فروری ۱۹۸۵ء کو لکھا ہے:

"اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ پاکستان مساوات کی بنیاد پر ہندوستان کے ساتھ دوستانہ رشتوں کا خواہاں ہے..... ہندوستان نے پاکستان کی طرف ہمیشہ معاندانہ اور غیر مصالحانہ رویہ اپنایا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس نے اندرونی معاملات میں مداخلت سے بھی گریز نہ کیا ..... ہندوستان کی وزارت خارجہ کے سکریٹری ایک طرف تو دونوں ملکوں کے درمیان بات چیت کے امکانات میں بہتری کی بات کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہندوستان نے راجستھان میں سورت گڑھ میں پاکستانی سرحد کے قریب ایک بکتر بند ڈویژن اور پانچ دوسری ڈویژنیں جمع کر دی ہیں جہاں سے آسانی کے ساتھ پاکستان پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان نے ہندوستانی افواج کے اس اجتماع پر سخت برہمی کا اظہار کیا ہے اور صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اقدامات شروع کر دیئے ہیں.....

"سفارتی حلقوں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ہندوستان کی ان کارروائیوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی مغربی سرحدوں پر سوویت فوجیں بھی جمع ہو رہی ہیں۔ ان حالات میں آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی جانب خیر سگالی کے مظاہرے میں ہندوستان کس حد تک سنجیدہ اور مخلص ہے اور دو طرفہ تعلقات کو معمول پر لانے کی کوششوں میں کتنا دم ہے۔"

یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ پرچار کی اس زوردار مہم کا مقصد تخریب کار عناصر کی مدد و اعانت میں پاکستان کے ملوث ہونے کی جانب سے بین الاقوامی رائے عامہ کی توجہ موڑنا ہے۔

سی آئی اے اور پاکستان کا خفیہ محکمہ ان تمام برسوں کے دوران ہندوستان دشمن دہشت پسندوں کی تربیت میں سرگرمی کے ساتھ شامل رہا ہے جس کے لیے خاص قسم کے کیمپ قائم کئے گئے ہیں۔ اس کا ثبوت ان دہشت پسندوں نے فراہم کیا ہے جنھیں جون ۱۹۸۴ء کے پہلے ہفتے میں پنجاب میں فوجی کارروائی کے بعد گرفتار کیا گیا اور پوچھ تاچھ کی گئی۔

سکھوں کے بھیس میں مسلمانوں کو قصور میں ایک پاکستانی توپخانے کے ایک بریگیڈیر نے تربیت دی۔ اس طرح کے بردستے میں تین سو سے چار سو تک مسلمان شامل تھے جنھیں تین چار مہینوں تک تربیت دی گئی۔

ایک اور مرکز گوجرانوالہ ضلع کے ایمن آباد میں ایک گوردوارے میں قائم تھا۔ اس میں خاص طور پر جاسوسی اور "گندے پرچار" کی تربیت دی گئی۔ راجستھان کی سرحد کے قریب رحیم یار خاں میں، اٹک کے قلعہ میں، داؤد کے قلعہ اور شیخ پورا شہر میں بس اسی طرح کے مرکز چلائے گئے دو دو سو اور تین تین سو کے گروپوں میں ایبٹ آباد کے فوجی کالج میں بھی انتہاپسندوں کو تربیت دی گئی۔

ان کیمپوں میں جن لوگوں کو تربیت دی گئی ان میں اسمگلر، مفرور مجرم اور دوسرے شورہ پشت عناصر شامل تھے جو سرحد پر سرگرم تھے۔ انھیں پاکستانی جاسوسی اداروں نے پنجاب اور راجستھان کے سرحدی علاقوں کے با اثر افراد کی مدد سے اپنے جال میں پھانسا اور خاصی مالی مدد فراہم کی۔

تربیت پوری کرنے کے بعد جس میں ترقی یافتہ ہتھیاروں اور گولہ بارود کے استعمال کی تربیت اور ہندوستان کے خلاف نفرت کی مہم شامل تھی ان دہشت گردوں کو پوشیدہ طور پر مختلف مقامات سے جموں اور کشمیر، راجستھان اور پنجاب میں داخل کیا گیا تاکہ تخریبی کارروائیاں کر سکیں۔ ان مقامات میں جموں کے کٹوعہ ضلع کا شہر ہری نگر، گورداسپور ضلع کا لساؤ بروال سیکٹر، فیروزپور ضلع اور راجستھان میں گنگانگر شامل تھے۔

جموں اور کشمیر میں سبوتاژ کے لیے پنجاب اور راجستھان کے کئی مقامات سے بھی ہتھیار پاکستان کے مقبوضہ کشمیر میں پہنچائے جاتے ہیں۔

ان کارروائیوں سے سی آئی اے اور پاکستان کی اخلاقی اور مالی وابستگی پر ہندوستان کے مختلف سیاسی حلقوں میں سخت ناراضگی پیدا ہوئی۔ وزارت خارجہ سے متعلق پارلیمانی مشاورتی کمیٹی

کے متعدد ممبروں نے مطالبہ کیا کہ پاکستان اور سی آئی اے کے ملوث ہونے کا صاف صاف اعلان کیا جائے اور پنجاب کے واقعات میں ان کے رول کے ثبوت فراہم کئے جائیں۔

سرکاری حلقے اگرچہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں لیکن انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ اس علیحدگی پرست تحریک کے پیچھے بیرونی ہاتھ ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ جگجیت سنگھ چوہان کا تعلق امریکہ کی بعض تنظیموں سے ہے اور ڈھلوں بھی اعلان کرتا رہا ہے کہ سکھ ایک الگ قوم، ہیں اور اس کے سمبندھ امریکی سنات کے ممبروں اور پاکستانی انتظامیہ کے اعلیٰ ترین عہدیداروں کے ساتھ قائم ہیں۔ سب سے بڑا انکشاف تو یہ ہوا ہے کہ چوہان کے رشتے واشنگٹن کے ہر ٹیج فاؤنڈیشن سے ہیں جو سی آئی اے سے ملحق ہے حالانکہ سرکاری حلقوں نے اس کی تصدیق ابھی تک نہیں کی ہے۔

سی آئی اے کے ڈائرکٹر ولیم کیسی نے جب یہ بات کہی تھی تو بہت زیادہ غلط نہ تھے کہ سی آئی اے کا خاص نشانہ آئندہ چند برسوں میں ملکوں کو ساتھ لانا ہوگا اور ان ملکوں میں امریکہ کے دوستوں کو بھرپور مدد دی جائے گی۔

چنانچہ ہندوستان میں جو امریکہ کا دوست نہیں ہے امریکہ اپنے دوستوں کی مدد کر رہا ہے اور انہی میں سکھ علیحدگی پرست بھی شامل ہیں۔ پاکستان کے سازباز کے ساتھ امریکہ نے ہندوستان کے اتحاد اور اس کی سالمیت پر بھرپور حملہ کیا ہے۔ سی آئی اے نے اس غرض سے ہندوستان اور بیرونی ممالک میں سکھوں کے ایک چھوٹے سے حلقے سے سانٹھ گانٹھ کرلی ہے۔ اس کھیل میں چین بھی شریک ہے اگرچہ فی الحال اس نے قدرے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ بعض "غیر دوست ملکوں" میں براہ راست فوجی مداخلت کے ساتھ ساتھ جس کا تازہ نمونہ نکاراگوا ہے ریگن سرکار کی حکمت عملی میں سی آئی اے کے نئے آقا ولیم کیسی نے تیار کی ہے انقلاب دشمن اور علیحدگی پرست طاقتوں کو سرگرم مدد فراہم کرنے کا انتظار کیا گیا ہے افغانستان انگولا اور کمپوچیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہم سب کو معلوم ہے، حالانکہ بین الاقوامی دہشت گردی اور تشدد کے میدان میں امریکی سامراج کے "کارناموں" کی فہرست ابھی پوری نہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے واشنگٹن اور اسلام آباد دونوں ہی تخریب کاری کی اس پالیسی کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ ان کی ڈپلومیسی اور تخریبی سرگرمیوں کا جائزہ ایک مربوط مجموعے کے طور پر لیا جانا چاہیئے۔ بعض ہندوستانی محقق اور ماہرین اس رویہ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور محض اس لیے کہ وہ یہ بات نہیں سمجھ پائے ہیں کہ کس طرح پاکستان

اسرائیل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک "ذیلی سامراجی" طاقت بن رہا ہے اور اس خطے میں سامراجی پالیسیوں کا ایک انتہائی موثر حربہ بن گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے۔

بعض محققین اور سفارت کار ایسے ہیں جو پاکستان کے رول کو صرف جغرافیائی سیاسی تناظر میں دیکھتے ہیں اور اسے پاکستانی ریاست کے کردار، اس کے سیاسی بالائی ڈھانچے اور غالب حکمراں اشرافیہ کی امریکہ کی عسکریت بند معیشت اور اس کی کثیر قوموں کارپوریشنوں کے ساتھ ساز باز اور گہرے رشتوں سے اسے براہ راست متعلق نہیں کرتے۔

یہاں بعض معنی خیز حقائق۔ جو اگرچہ خاصے جانے مانے ہیں پھر بھی ضرورت ہے کہ انہیں دہرایا جائے۔ پیش کئے جاتے ہیں۔ پاکستان میں صرف ۱۰ سال پہلے ۲۲ خاندان ۶۶ فی صد صنعتی اشاروں کے مالک تھے" ۸۸ فیصد بینکنگ اور ۹۷ فی صد بیمے کا کاروبار ان کے قبضے میں تھا۔ اگرچہ موجودہ صورت حال کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کیوں کہ بھٹو نے جو کچھ قومی ملکیت میں لیا تھا اسے دوبارہ ضیا نے اس دائرے سے نکال دیا ہے پھر بھی تلخ حقیقت یہ ہے کہ پنجابی، ہندوستانی مسلمان جو ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے ہیں اور بعض پارسی ملک کی معیشت پر حاوی ہیں مشرقی پاکستان کو جو اب بنگلہ دیش ہے شہری اور فوجی نوکر شاہی کے اعلیٰ عہدوں پر بہت کم نمائندگی حاصل تھی آج سندھیوں اور بلوچیوں کا یہی حال ہے، حالانکہ پٹھانوں کا مٹھی بھر حصہ کسی نہ کسی طرح ریاستی مشینری میں گھس گیا ہے۔ پاکستان کی معیشت سنگین بحران کا شکار ہے اور یہ بحران آگے بڑھنے والا ہے کیونکہ مزدوروں کی برآمد، جو کی زرمبادلہ کے حصول کا خاص ذریعہ ہے، کم ہونا شروع ہوگئی ہے۔ اسی لیے پاکستان میں توسیع پسندانہ رجحان ابھر رہا ہے جس کی حوصلہ افزائی امریکہ کر رہا ہے اور اسی لیے ہندوستان اور افغانستان ان منصوبوں کا خاص حصہ بن گئے ہیں اور یہ صورتحال اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ جمہوری عمل کے ذریعے پاکستان کے عوام اپنے مقدر کے مالک نہیں بن جاتے۔

(۴)

افغانستان میں کارروائی

افغانستان میں دو "عظیم طاقتیں"، امریکہ اور سوویت یونین "غائبانہ" جنگ لڑ رہی ہیں ہندوستان کے اندر اور بیرونی ملکوں میں عام وسائل ابلاغ کا ایک حصہ اس معاملے میں یہی زبان استعمال کر رہا ہے یہ وہ تصور ہے جس سے پاکستانی رہنماؤں کا ایک بڑا گروہ قطعی متفق نہیں جس میں بے نظیر بھٹو، خان ولی خاں، پاکستان کے مذہبی رہنما اور کراچی کی جامع مسجد کے امام جاوید نوی اور بلوچ رہنما شامل ہیں اس کے باوجود پاکستان کے فوجی رہنما اسی شدت کے ساتھ افغانستان پر "سرخ حملے" کا شور مچا رہے ہیں جیسے ہندوستان کے ساتھ "کشمیر کے جھگڑے" پر شور مچاتے ہیں۔

"ہم تو صرف افغانستان سے موصول ہونے والی ہنگامی درخواست پر عمل کر رہے ہیں" واشنگٹن کا کہنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ درخواست صرف ان افغان پناہ گزینوں نے کی ہے جو نشیلی چیزوں کا بیوپار کرتے ہیں یا جن کا ماضی جرائم زدہ رہا ہے یا اپنی ذاتی مصلحتوں کی وجہ سے پناہ گزیں بن گئے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی قطعی نہیں ہیں کہ ہم سبھی افغان پناہ گزینوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور ان لوگوں میں جو اپنی مرضی سے افغانستان کی موجودہ سرکار کو توڑنے پھوڑنے پر تیار ہو گئے ہیں اور ان لوگوں میں جنہیں گمراہ کر کے اس مسئلے میں پھانس لیا گیا ہے۔ فرق نہ کریں۔

ریگن سرکار نے افغان باغیوں کی حمایت کا معاملہ کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی باوجود اس کے کہ بعض اوقات اس کی وجہ سے پاکستانی حکومت کی پوزیشن خراب ہوتی ہے جو اس سے مسلسل انکار کر رہی ہے کہ وہ مجاہدین تک سرمایہ اور ہتھیاروں کے پہنچائے جانے کے سلسلے میں بچولیئے کا رول ادا کر رہی ہے۔ بلا شبہ امریکی سرکار جس شور غل کے ساتھ کمیونسٹ دشمن تحریکوں کی طرف اپنی ذمہ داری کا ڈھول پیٹتی ہے اس کی وجہ سے سی آئی اے بھی جو امداد کے پروگرام تیار کرتا ہے اور اسے عمل میں لاتا ہے، خبروں کے افشاں کے لیے خود کو آزاد سمجھتا ہے۔ اس کا بھرپور ثبوت چند مہینوں پہلے سامنے آیا جب "ٹائم" میگزین نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ سی آئی اے

کس طرح کے ہتھیار دے رہا ہے، ہتھیاروں کی فراہمی کدھر کی جا رہی ہے اور یہی نہیں بلکہ یہ بھی بتایا کہ " ایک مذہبی تنظیم کو بھیجے گئے ٹیلی فون کے آلات " کے پردے میں زمین پر بچھائی جانے والی سرنگیں کس طرح فراہم کی گئیں۔ جیسا کہ 'واشنگٹن پوسٹ' میں چھپے اپنے ایک مضمون میں میصر فلب گیلن نے لکھا ہے " کہ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اسطرح کے اسلحے سی آئی اے کی مدد کے بغیر جمع کئے جا سکتے تھے۔" کل ملا کر نام نہاد " خفیہ " پروگرام کی کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہی سب کچھ اتنا کھلم کھلا ہوا ہے جتنا امکانی طور پر ہو سکتا تھا

اس کے باوجود پروگرام کی وسعت اور اسے شروع کئے جانے کا وقت ان تمام لوگوں کے لیے باعث حیرت ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے افغانستان کے معاملات میں گہری دلچسپی نہیں لی۔ تخمینہ یہ ہے کہ امریکہ نے مجاہدین کی مدد پر ۲۰ر ۳۲ کروڑ ڈالر کی رقم خرچ کی ہے۔ یہ اس سے کہیں زیادہ بڑی رقم ہے جو اس نے نکاراگوا میں بائیں بازو کی سینڈینسٹا حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے خرچ کی ہے جس کی امریکی کانگریس میں کافی مخالفت کی جا چکی ہے۔ بہ ظاہر ریگن سرکار نے امریکی کانگریس کی حمایت سے حالیہ عرصے میں باغیوں کو ملنے والی مالی مادی امداد دو چند کر دی ہے کیونکہ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۴ء کو ختم ہونے والے مالی سال کے دوران " خفیہ پروگرام " کے لیے جو ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر کی رقم مختص کی گئی تھی اس کے علاوہ اس نے ۵ کروڑ ڈالر کی مزید منظوری دی ہے۔ اس رقم کو سرکاری طور پر فضائیہ کے لیے " مزید سامان کے حصول " کی غرض سے دیا گیا ہے۔ لیکن " وال اسٹریٹ جرنل " اور " واشنگٹن پوسٹ " دونوں ہی کا کہنا ہے کہ دراصل یہ رقم افغان باغیوں کو ملی ہے۔ اس طرح کی خبریں بھی آئی ہیں کہ وہائٹ ہاؤس ان پروگرام کی شروعات کے لیے نئے مالی سال میں ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر کی رقم طلب کرے گا۔

یہ انکشاف تو اور بھی زیادہ دلچسپ ہے کہ افغانستان میں سی آئی اے نے ۱۹۷۹ء کے وسط سے صدر کارٹر کے دور سے پیسہ لگانا شروع کر دیا تھا یعنی اس سال کے دسمبر میں سوویت فوجی مداخلت سے کئی ماہ پہلے ہی سے۔

یہ انکشاف بڑی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ افغان باغیوں کو زبردست مادی مدد امریکہ، چین، مصر اور دوسرے عرب ملکوں سے ملی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پوری عالمی رجعت پرست طاقتیں اور چین اس ملک کی تخریب کاری میں کس طرح ملوث ہیں۔ یہ سمجھنا محض سادہ لوحی ہے کہ افغانستان میں " باغیانہ کارروائیاں " اس وقت شروع ہوئیں جب کابل نے تخریب کاری کا مقابلہ کرنے کے لیے سوویت افواج کو دعوت دی۔ یہ تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ کیوں کہ

افغانستان میں تخریب کاری ہمیشہ سامراج کے ایجنڈے میں شامل رہی ہے۔

جو لوگ اس خطے کی تاریخ کی معمولی سی بھی معلومات رکھتے ہیں انہیں یاد ہوگا کہ پچھلی صدی کی ۱۰ویں دہائی اور موجودہ صدی کے اوائل میں برطانوی استعماری حملے اس مقصد سے کئے گئے تھے کہ وہ ہندوکش کی فوجی لحاظ سے اہم جگہ پر پیر جما لیتے جائیں اور اس طرح برصغیر ہند پر اپنی گرفت اور مضبوط کرلی جائے۔ افغان عوام پر ۱۸۴۲ء، ۱۸۷۸ء اور ۱۹۱۹ء میں جو جنگیں مسلط کی گئیں ان سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ ان میں سے دو جنگیں روس میں اکتوبر انقلاب کی کامیابی سے پہلے لڑی گئیں۔ یعنی سوویت یونین کے وجود میں آنے سے پہلے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد واشنگٹن نے افغانستان کے خلاف مختلف ہتھکنڈے استعمال کئے معاشی، سیاسی اور فوجی حربے اپنائے تاکہ وہ سیٹو اور سینٹو میں شامل ہو جائے۔ واشنگٹن کی سمجھ یہ تھی کہ اس "غائب کڑی" کی وجہ سے اس کے فوجی گٹھ جوڑ کی پوری زنجیر ہی چوپٹ ہو سکتی ہے۔

پھر پاکستان بننے کے بعد افغانستان نے پشتو بولی کے علاقوں کو پاکستان کا حصہ تسلیم کرنے اور ڈورانڈ لائن کو مشترکہ سرحد ماننے سے انکار کر دیا۔ اس سے صورتحال اور زیادہ الجھ گئی اور پاکستان اور افغانستان کی باہمی معاندت نے ایک نیا موڑ اختیار کر لیا۔

چھٹی دہائی کے وسط میں دو اور واقعات رونما ہوئے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ افغانستان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ سینٹو یا سیٹو میں شامل ہو جائے۔ دوسرے پاکستان کے حکمرانوں نے ملک کو ایک یونٹ بنا دینے کی کارروائی شروع کی جس کے حقیقی معنی یہ تھے کہ پشتو اور بلوچی زبانیں بولنے والوں کی شناخت ختم ہو جائے۔

ان دونوں باتوں کی وجہ سے افغان عوام میں بڑے پیمانے پر ناراضگی پھیل گئی اور پورے ملک میں کابل، قندھار، جلال آباد، اور دوسری جگہوں پر احتجاجی مظاہرے ہوئے، پشاور میں افغان قونصل خانے پر حملہ کیا گیا۔ افغان معیشت کو نقصان پہنچانے کے لیے اس کا تجارتی دفتر بند کر دیا گیا۔

تقریباً ایک دہائی تک افغان سیاست میں مختلف اتار چڑھاؤ آتے رہے اور پھر ۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء کو بادشاہ کے ایک چچیرے بھائی محمد داؤد کی رہنمائی میں بغاوت کامیاب ہوئی اور ملوکیت کا خاتمہ ہو گیا۔ یکم اگست ۱۹۷۳ء کو پہلی جمہوریہ افغانستان وجود میں آئی۔ اس نے فوری طور پر ترقی کا ایک پروگرام پیش کیا جس کی ملک کی ساری جمہوری طاقتوں نے حمایت کی۔ ان میں افغانستان

کی عوامی جمہوری پارٹی بھی شامل تھی۔

اس کے بعد بغاوتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ حکومت کا تختہ الٹنے کی پہلی کوشش ستمبر ۱۹۷۳ء میں ہاشم میر وانداال نے کچھ وزیروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کے ساتھ مل کر کی۔ جیسا کہ مغربی ذرائع ابلاغ خاص طور پر جرمنی کے اخبارات کا کہنا ہے ان ساری کوششوں کو سی آئی اے کی بھرپور حمایت حاصل تھی ایک اور کوشش حکومت کا تختہ الٹنے کی دسمبر ۱۹۷۳ء میں رسول اور بعض رجعت پرست مذہبی رہنماؤں نے کی۔ رسول ظاہر شاہ کے دور میں خفیہ پولیس کا سربراہ تھا۔ دونوں ہی کوششیں ناکام رہیں۔ چند مہینوں بعد ایک اور کوشش کی گئی۔ یہ نام نہاد "اسلامی جمہوریہ افغانستان" کے قیام کے لیے کی گئی تھی مگر یہ بھی ناکامی سے ہم کنار ہوئی۔

اس طرح کی کئی کوششوں کے بعد افغانستانی دفتر خارجہ نے یہ دعوا کیا کہ کابل کے پاس خاصے دستاویزی ثبوت اس بات کے موجود ہیں کہ پاکستان داؤد حکومت کا تختہ الٹنے کی ایک سازش کی تیاریوں میں پوری طرح ملوث ہے۔

دفتر خارجہ کے ایک ترجمان نے اسوسی ایٹڈ پریس کو بتایا کہ جو لوگ اس سازش میں شریک تھے انہیں گرفتار کیا گیا اور سازش کے متعلق مستند دستاویزیں ہاتھ لگیں۔ پاکستانی سفیر نے ان دستاویزوں کا معائنہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ان دستاویزوں نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستانی فوجی اور مالی دونوں ہی طرح سے ان کوششوں میں ملوث تھا، اس نے دعوا کیا۔ ان خبروں کو ساری دنیا میں بڑے پیمانے پر شائع کیا گیا

ایک ایسی ہی کوشش میں جو لوگ ملوث تھے ان میں حضر گل (ایک ممتاز تاجر) پاکستانی تجارتی بینک کے سابق سربراہ عبدالحنان، جنت خاں اور تین فوجی افسران شامل ہیں جن میں جنرل عبدالسلام بھی شریک تھے۔

اس وقت کے وزیر اعظم محمد داؤد نے اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری کرٹ والڈہم سے درخواست کی تھی کہ "حقائق جاننے کے لیے ایک غیر جانبدار مشن ساری صورت حال کی جانچ پڑتال کے لیے بلوچستان بھیجا جائے"۔ پاکستان میں بلوچیوں کے قتل عام کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"میں سمجھتا ہوں کہ آج کے حالات میں یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ عالمی برادری کو معاملے کی صداقت سے صحیح طور پر باخبر کیا جا سکتا ہے اور افغانستان میں بلوچ پناہ گزینوں کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ اسی کے ذریعے ان اسباب کا پتہ لگایا جا سکتا ہے جنہوں نے انھیں اپنے وطن سے بھاگنے پر مجبور کر دیا"۔

ان حقائق سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں واشنگٹن اور اس خطے کے اس کے حلیفوں کی مداخلت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ برسوں سے اس بات کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ دباؤ ڈال کر افغانستان کی اندرونی و بیرونی پالیسی میں تبدیلی لائی جا سکے نئی بات صرف یہ ہے کہ اب اس نے ایک خطرناک نوعیت اختیار کر لی ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے خود امریکہ کے اخبارات بھی تسلیم کرتے ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اپریل ۱۹۷۸ء کے فتحمند انقلاب کے بعد افغان عوام نے بوسیدہ سائنسی نظام کو الٹ دیا اور ایک نیا، آزاد اور جمہوری سماج بنانا شروع کیا تو یہ بات مغربی ملکوں کے حکمراں حلقوں کو پسند نہیں آئی، اور اسی طرح وہ ایران میں شاہ مخالف انقلاب کو بھی برداشت نہیں کر پا رہے ہیں۔

اسی لیے امریکہ کی رہنمائی میں سامراجی طاقتوں نے چین کے آقا ئیت پسندوں کی ساز باز کے ساتھ آزاد افغانستان کے خلاف ایک غیر معینہ جنگ چھیڑ دی۔ اس میں دوسری باتوں کے علاوہ ہتھیاروں کی، جنگ کے انتہائی وحشیانہ کیمیاوی وسائل سمیت لگاتار سپلائی اور تخریب کاروں کی تربیت کے لیے پیشہ ور ماہروں کی تقرری شامل ہے۔ تربیت یافتہ دہشت گردوں کے گروہوں کو چھپے چوری افغانستان میں بھی پہنچایا گیا اس کی شاید وہ دستاویزیں ہیں جنھیں جمہوری پبلک افغانستان نے اشاعت کے لیے جاری کیا ہے۔

اکیلے پاکستان سے تقریباً دو درجن تخریب کار ٹولے کام کر رہے ہیں۔ ان سبھی نے اپنی پردہ پوشی کے لیے "مسلم محاذوں اور پارٹیوں" کی آڑ لے رکھی ہے۔

۹ ۲ دسمبر ۱۹۸۲ء کو "واشنگٹن پوسٹ" میں امریکہ میں بین الاقوامی امور کے ایک جانے مانے ماہر سلیگ ایس، ہیریسن کا مضمون شائع ہوا۔ انہوں نے ریگن سرکار پر الزام لگایا ہے کہ وہ افغانستان کے ارد گرد کی صورت حال کے سیاسی تصفیہ کی مخالفت کر رہی ہے اور افغان عوام کے خلاف ایک لمبی "غیر معینہ" جنگ کا اس نے سہارا لے رکھا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ اپنے بس بھر اس بات کی پوری کوشش کر رہا ہے کہ صورت حال معمول پر نہ لائی جا سکے اور معاملے کو طے کرنے کے لیے اٹھائے گئے ہر سفارتی قدم کو ناکام بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔

اپنے اخذ کردہ نتائج کی تائید میں ہیریسن نے امریکہ کے خفیہ محکمے کے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ اپنی گفت گو کا حوالہ دیا ہے اس بات کے پیش نظر کہ افغانستان نے اس راستے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے جس پر بعض مغربی حلقے اسے چلانا چاہتے تھے، متذکرہ افسر نے

ہیرلیسن سے کہا کہ افغانستان تو "ہاتھ سے گیا"۔ ساتھ ہی اُسنے اس بات پر بھی زور دیا کہ امریکہ مستقبل میں غیر معین مدت تک باغیانہ سرگرمیوں کی ہمت افزائی کا ارادہ رکھتا ہے۔

مضمون نگار نے افغانستان کے اردگرد کی صورت حال طے کرانے میں اقوام متحدہ کو بیچ میں ڈال کر "بالواسطہ بات چیت" کے تصور کی حمایت کی۔ ساتھ ہی ہیرلیسن نے اس بات پر زور دیا کہ اگرچہ ریگن سرکار نے رسمی طور پر بات چیت کے تصور کی حمایت کی ہے، وہ اقوام متحدہ کی کوششوں کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں کوئی خاص مدد نہیں دے رہی ہے۔

ہیرلیسن نے وہائٹ ہاؤس پر کھلم کھلا الزام لگایا ہے کہ وہ جان بوجھ کر پاکستان پر دباؤ ڈال رہا ہے تاکہ براہ راست گفت وشنید کے ذریعے سیاسی سمجھوتے کے حصول کو زیادہ سے زیادہ مشکل بنا دیا جائے ان اطلاعات کے حوالے سے جو اس کے قبضے میں تھیں ہیرلیسن کہتا ہے کہ ایک وقت میں پاکستان تصفیہ کی تلاش کے لیے ایک وقت کہیں زیادہ حقیقت پسند رویہ سے کام لینے کے لیے تیار تھا۔ اس کا بہت کچھ سہرا افغانستانی حکومت کی تعمیری خارجہ پالیسی کے سر ہے اور ۱۴ مئی ۱۹۸۰ء نیز ۲۴ اگست ۱۹۸۱ء کے اس بیانات کے سر ہے۔ کابل کی تحریک پر ہی اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے خصوصی ایلچی دیگو کوردوویز کی معرفت وزارت سطح پر پاک افغان بات چیت اپریل ۱۹۸۲ء میں شروع ہوئی۔ جنیوا میں جون ۱۹۸۳ء میں گفتگو کا ایک دور بے حد کامیاب رہا۔ دیگو کوردوویز تو یہاں تک یقین کر بیٹھے کہ تصفیہ کا ایک فارمولا بھی تیار ہو گیا ہے۔ "بات چیت افغانستان کے معاملے میں مداخلت کا سدباب کرنے، مداخلت کے سدباب اور مستقبل میں اس کا اعادہ نہ ہونے سے متعلق بین الاقوامی اعانتیں فراہم کرنے، اور پناہ گزینوں کی واپسی جیسے نکات پر مرکوز رہی۔ طرفین کے درمیان ایجنڈے میں شامل بیشتر مسائل پر مفاہمت ہو گئی تھی اور یہ سمجھنے کے پورے اسباب موجود تھے کہ بات چیت کا ایک اور دور باقیماندہ مسائل کے جلد از جلد تصفیہ کے لیے افغانستان اور پاکستان کے درمیان براہ راست گفتگو کے امکانات پیدا کریگا لیکن امریکہ نے پاکستان کے وزیر خارجہ یعقوب علی خاں کے واشنگٹن کے سفر سے فائدہ اٹھا کر اسلام آباد پر دباؤ ڈالا اور وہائٹ ہاؤس نے تصفیہ سے متعلق خود اپنا فارمولا پاکستان پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات جنیوا بات چیت ختم ہونے کے فوراً بعد ۲ تا ۴ جولائی ۱۹۸۳ء میں امریکی وزیر خارجہ جارج شلز کے دورے سے صاف ظاہر ہو گئی۔ واشنگٹن نے ایک بار پھر یہ اعلان کیا کہ تصفیہ صرف امریکی ہدایات کی بنیاد پر ہی ممکن ہے اور دوبارہ انقلاب دشمن ٹولوں کے جرائم کی ستائش کی اور انہیں شاباشی دی۔

"ہم تمہارے ساتھ ہیں"، وہائٹ ہاؤس کے اس ایلچی نے پشاور کے قریب ایک فوجی

کیمپ میں باغیوں کے ساتھ ملاقات کے دوران بڑے جوش کیساتھ کہا۔ انہوں نے باغیوں کیساتھ امریکی حمایت کی توثیق کی۔ اب صاف ظاہر ہو گیا کہ امریکہ بات چیت کے سازگار نتیجہ کا سخت مخالف ہے چنانچہ اس نے کھلم کھلا اس کے خلاف مہم چلا رکھی ہے اور پاکستان کو بھی اسکے لیے مجبور کر دیا ہے۔

ریگن سرکار نے پاکستان کو افغانستان جمہوری ری پبلک کیخلاف جارحیت کے اڈے کے طور پر اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر استعمال کیا۔ کانگریس کی ایک کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کیسپر وینبرگر نے اعلان کیا کہ اگر ایک مضبوط پاکستان نہ ہوتا تو افغانستان میں مزاحمت (یعنی مداخلت کاروں کی انقلاب دشمن قزاقانہ کارروائیاں) کب کی ناکام ہو چکی ہوتیں۔ اسی لیے افغانستان میں گھس بیٹھ کے لیے تربیت دینے کی غرض سے جو کیمپ قائم کئے گئے ہیں ان میں جانا اسلام آباد آنیوالے سارے اعلیٰ امریکی مہمانوں کا ایک طرح سے مذہبی فریضہ بن گیا ہے۔ مگر اس کا مقصد کچھ اور بھی ہے یہ دکھانا مقصود ہے کہ امریکہ افغانستان کے خلاف غیر معینہ جنگ جاری رکھنے اور اس جنگ میں پاکستان کو زیادہ سے زیادہ ملوث کرنیکا ارادہ رکھتا ہے

مئی ۱۹۸۴ء میں پشاور کے قریب نصیر باغ کیمپ میں بولتے ہوئے امریکہ کے نائب صدر جارج بش نے ایک براہ راست اور دو ٹوک انداز میں یہ کہنے کی جرأت کی کہ جدوجہد اسوقت تک جاری رہیگی جبتک سوویت فوجیں واپس نہیں جاتیں۔ اس اعلان کیساتھ ساتھ بڑی آن بان سے ایک کروڑ ۴ لاکھ ڈالر کا ایک چیک افغان "پناہ گزینوں" کیلئے یعنی انقلاب دشمنوں کی ضرورت کیلئے پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ محض پرچار کیلئے کیا گیا تھا، یہ تو محض دکھاوا تھا۔ اس بہت بڑی رقم کو کون نظر انداز کر سکتا ہے جو امریکہ اور بعض دوسرے ملکوں نے پاکستان کو افغانستان میں مداخلت کا اڈہ بنانے کے لیے خرچ کیا ہے۔

دہشت گرد لٹیروں کی تربیت کیلئے کم سے کم ۱۴ مرکز پشاور کے علاقے میں قائم کیے گئے ہیں جس کا دورہ بش نے کیا۔ لٹیروں کے یہ ٹولے افغانستان کی سرحدیں ہر جگہ گھس بیٹھ کرتے ہیں افغان حکومت کے فراہم کردہ اعداد و شمار کیمطابق اسطرح کے ایک سو سے زائد مرکز پاکستان میں اب تک قائم کئے جا چکے ہیں۔ لٹیروں کی سرگرمیوں پر سی آئی اے نیز بعض دوسرے ملکوں کی خفیہ ایجنسیاں پیسے لگا رہی ہیں واشنگٹن نے اسلام آباد کو ایک معاہدے کے تحت ۳ ارب ۲ کروڑ ڈالر کی جو فوجی اور معاشی امداد دی ہے اس کا بھی بڑا حصہ اسی پر صرف ہو رہا ہے۔

افغانستان جمہوری ری پبلک کی امور خارجہ کی وزارت نے الزام لگایا ہے کہ جارج بش کے دورۂ پاکستان نے واشنگٹن کے اس ارادے کی تصدیق کر دی ہے کہ وہ افغان انقلاب دشمنوں کو ہتھیاروں کی سپلائی بڑھانا چاہتا ہے اور اس جارحیت کو "وصفی لحاظ سے ایک نئی معنویت" دینا چاہتا ہے۔ دورے نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ امریکہ اسلام آباد کو اپنی گاڑی میں اور زیادہ مضبوطی کیساتھ جوڑنا چاہتا ہے اور موجودہ صورتحال کیلئے نیز اسکے تصفیہ میں روڑے اٹکانے کیلئے امریکہ براہ راست ذمہ دار ہے۔

اسلام آباد اور کابل کے درمیان تصفیے کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے ایک نمائندے کی معرفت ہونے والی بات چیت کے تین ادوار کی تاریخ کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ ہر بار یہ امید پیدا ہوئی کہ بات چیت آگے بڑھی ہے اور ایسا لگا کہ بس پاکستانی رہنماؤں کے موقف میں کوئی تعمیری تبدیلی آنے ہی والی ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ جب ہی صورت پیدا ہوئی کسی ان دیکھے ہاتھ نے انھیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا بلکہ یوں کہا جائے کہ پیٹی سے پکڑ کر پاکستانیوں کو دور کھینچ لیا۔ اور ہر بار شعوری طور پر گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنے کے انداز میں تصفیہ کی ہر کوشش کو جھوٹی منطق کے ذریعے ناکام بنایا گیا۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اس محدود سوویت دستے کو واپس جانا چاہئے جو وہاں کی واحد جائز حکومت کی درخواست پر بیرونی جارحیت سے اسے بچانے کے لیے وہاں مقیم ہے۔ ان لوگوں کے مطابق اس بنیادی شرط کو ماننا لازمی ہے کہ اس کے بغیر افغانستان کی سلامتی کی ضمانت دینے اور باہر سے اس کے علاقے پر کسی حملے کے امکان کو ختم کرنے کے بارے میں کوئی بھی سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا۔ واشنگٹن کے اس موقف کا واضح مطلب یہ ہے کہ افغان بے یار و مددگار ہو جائیں اور بیرونی جارحیت کے خلاف اپنے دوستوں اور ہمدردوں سے مدد لینے کے حق سے محروم ہو جائیں جس کا خاکہ سامراج نے مرتب کیا ہے۔ پشاور کے نزدیک لٹیروں کے ایک کیمپ میں نائب صدر بُش نے "سوویت فوجوں کی واپسی اور جدوجہد جاری رکھنے پر" بولتے ہوئے کہا تھا کہ امریکی انتظامیہ صورت حال کو معمول کے مطابق بنانے کے بجائے علاقے میں اسے اور زیادہ دھماکہ خیز بنانا چاہتا ہے۔

حقائق بتاتے ہیں کہ اسلام آباد بہ رضا و رغبت ریاستہائے متحدہ امریکہ کی پالیسی کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ وہ تھوڑی تعداد میں سوویت فوجی دستوں کی موجودگی کو بڑھا چڑھا کر اسقدر وسیع بنا دیتا ہے گویا اس سے پاکستان اور سارے علاقے کی سلامتی کو "خطرہ" پیدا ہو گیا ہے۔

اصل میں پاکستان فوجی طاقت کو بڑھانے کے لیے افغانستان میں سوویت فوجوں کی موجودگی کو بہانہ بنا تا رہا ہے۔ اور اگر پاکستان واشنگٹن کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے افغانستان کو اپنی شطرنج کی چال کا مہرہ بنانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ بات قطعی ناپاک ارادوں سے کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے پاکستان کو جدید ترین امریکی ہتھیاروں کی فراہمی کو تیز رفتار بنانے کے جواز کو لیجئے۔ ان اسلحوں کی فہرست میں سرکاری اور غیر سرکاری دو فریقی معاہدوں کے تحت ایف۔۱۶ لڑاکو بمبار، ہارپون میزائیل، خود محرک توپ خانے، عملہ بردار بکتر بند گاڑیاں اور دوسرے ساز و سامان شامل ہیں۔ ان ہتھیاروں کی خصوصیت اور ان کی تعداد اور تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا رُخ صرف افغانستان

ہی کی طرف نہیں ہے۔

اگر ان سارے اسلحوں کو افغانستان کے خلاف ہی استعمال کرنا ہوتا تو پاکستان کو یقیناً پانی سے پانی پر مار کرنے والے ہارپون میزائیل کی ضرورت ہرگز نہ پڑتی کیونکہ افغانستان کا کوئی سمندری ساحل نہیں ہے۔ امریکی کانگریس کی سماعت کے دوران اس سوال پر اظہار خیال کیا گیا تھا اور انتظامیہ کے ترجمان نے گھما پھرا کر کہا تھا کہ اسلحے ہندوستان کے خلاف استعمال ہو سکتے ہیں۔ یہ بات محض اتفاقیہ ہی نہیں ہے کہ آج کے حالات میں لڑنے کے لیے تیار پاکستانی ٹینکوں کے دستوں کا ۳۰ فیصدی کشمیر کے اس حصے میں "کنٹرول لائن" پر تعینات ہے جس پر پاکستان قابض ہے۔

اس سلسلے میں کوئی بھی ہندوستان میں پاکستانی ایجنٹوں کی موجودگی پر توجہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتا جو مذہبی اور فرقہ وارانہ فسادات پھیلاتے ہیں اور کشمیر و پنجاب میں علیحدگی پسند جذبات بھڑکاتے ہیں۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ مئی ۱۹۸۴ء کے اواخر میں ٹائمس آف لندن کو دیئے گئے اپنے انٹرویو میں صدر ضیا الحق نے، ہندوستان نے جس دوستی اور تعاون کے معاہدے پر دستخط کرنے کی پیش کش کی تھی اس کی دو دفعات کو پاکستان کے ذریعے منظور کیے جانے کے امکانات کو سختی سے رد کر دیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان اپنی سرزمین پر بیرونی فوجی اڈے قائم کرنے کی اجازت نہیں دیں گے اور تمام مسائل کو صرف آپس ہی میں طے کریں گے۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے جون ۱۹۸۵ء میں امریکی دورہ کے موقع پر اپنے اس موقف کو دُہرایا تھا۔

اس سے پاکستان میں جو امریکی فوجی اڈہ قائم ہے اس کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔ واشنگٹن اور اسلام آباد اپنی ہر کوشش کر رہے ہیں کہ دنیا کو یہ راز معلوم نہ ہونے پائے کہ ایسے اڈے قائم کیے جا رہے ہیں۔ لیکن دوسرے ممالک کے اخباروں نے ایک سے زیادہ بار خبر شائع کی ہے کہ واشنگٹن اور اسلام آباد کے درمیان اس سلسلے میں خفیہ معاہدے ہو چکے ہیں۔

امریکی حکمت عملی ساز بحر ہند کو اہم خطہ تصور کرتے ہیں۔ حالات اجازت دیں تو پاکستان اس خطے میں امریکی "مفاد" کے تحفظ کے سلسلے میں اگر کلیدی نہیں تو اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے امریکہ کے مرکزی کمانڈ کی فوجی کارروائیوں میں شامل کیا گیا تھا جس کا رُخ بحر ہند اور بنیادی طور پر خلیج فارس کی طرف تھا۔ امریکی جنگی جہازوں کو فوجی اطلاعات دینے کے لیے واشنگٹن کے ذریعہ پاکستان کو اورین گشتی طیارے کی فراہمی کی خبر بے بنیاد نہیں ہے۔

اس طرح پاکستان امریکہ کی سامراجی حکمت عملی کا پُرزہ بن رہا ہے اور یہ کام وہ غیر موافق حالات کے بدولت نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کی حکومت نے سوچے سمجھے سیاسی رویے کے تحت ایسا کرنا منظور کیا ہے۔

اس سے ترکی اور سعودی عرب کو خفیہ طور پر ایک نئے فعال مشرق وسطیٰ اتحاد میں شامل کرنے کے لیے پاکستان کی سفارتی کوششیں واضح ہو جاتی ہیں۔ پاکستانی سفارت کاری نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ایران بھی اس اتحاد میں شامل ہو جائے۔ اس سے اس مقصد کے لیے استعمال کیے جانے والی نام نہاد اسلامی قدر مشترک کے مغالطے کا بھی پردہ فاش ہو جاتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اسلام آباد اپنے آپ یہ کام نہیں کر رہا ہے بلکہ چند دوسرے ممالک کی خفیہ سازش میں شامل ہو کر وہ ایسے اقدام کر رہا ہے۔

پھر بھی یہ بات سمجھنا نہایت مشکل ہے کہ واشنگٹن اور بیجنگ نے کابل میں مغرب نواز حکومت کو برسر اقتدار لانے کا کھلا معاہدہ کر لیا ہے۔ ان دونوں ملکوں نے قطار در قطار فوجی اڈوں اور کیمپوں سے افغانستان کو گھیر رکھا ہے جہاں توڑ پھوڑ کرنے والی ٹکڑیوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ افغانستان کی وزارت داخلہ نے کہا ہے کہ گزشتہ پانچ برسوں میں ۵۰ مراکز اور ۲۰ خصوصی اڈے قائم ہوئے ہیں جہاں امریکی اور چینی "مشیروں" کی ہدایت کے تحت پاکستان فوجی انسٹرکٹروں نے توڑ پھوڑ کرنے والے گروپوں کو تربیت دی گئی ہے۔ صرف گزشتہ تین برسوں میں ہی ان کیمپوں اور اڈوں میں ۵ ا ہزار دہشت گردوں نے تربیت حاصل کی ہے۔

اس بات کی تصدیق چینی اخبار "رین من ریباؤ" کی موجودہ کابل حکومت کے خلاف چلائی جا رہی مہم سے ہوتی ہے۔ اس اخبار میں ۱۹۸۰ء کے اوائل کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ "ملک کی آزادی کے لیے وسیع پیمانے کی چھاپہ مار تحریک کی جدوجہد تیز ہو رہی ہے"۔ گلگت کے علاقے میں ہمالیہ کے اس پار فوجی لحاظ سے اہم قراقرم سڑک، کیمپوں میں افغانوں کو ہتھیار فراہم کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر استعمال ہو رہی ہے جن میں اعلیٰ چینی عہدیدار اکثر مہمان ہوتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ افغانستان میں صورت حال جتنی زیادہ مستحکم ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ واشنگٹن، بیجنگ اور اسلام آباد کا اتحاد اس ملک میں غیر استحکام پیدا کرنے کی کوششیں تیز کر دیتا ہے۔ کابل نے کہا ہے کہ پچھلے سال کے اگست کے پہلے ہفتے میں کچھ چوٹی کے افغان باغی "تال میل کو بہتر بنانے" کیلئے بیجنگ گئے تھے۔ اور اس کے فوراً بعد دو پاکستانی جنرل — علی اکبر خاں اور سید اکبر حسین — بیجنگ پہنچے تھے۔ اس کے بعد پاکستان کے وزیر خارجہ یعقوب علی خاں نے بیجنگ کا دورہ کیا تھا۔

ملک میں ببرک کرمال کی حکومت کے مستحکم ہو جانے کے بعد یہ دورے کیے گئے تھے۔ افغان ناظر کے غیر متعصب مشاہدین نے خبر دی ہے کہ کرمال حکومت نے تمام اہم شہروں پر اپنا تسلط مضبوط کر لیا ہے۔ اس بات کے دوسرے ثبوت بھی موجود ہیں کہ استحکام بڑھ رہا ہے۔ افغانستان میں سوویت فوجوں کی تعداد حالانکہ غیر متغیر رہی ہے لیکن ۱۰ تا ۵ ا فیصدی مسلح افواج نے ہی اصلاً لڑائی میں

حصّہ لیا ہے۔ اور روزمرہ کی کارروائیوں میں صرف تقریباً ۵۰۰ فوجی ہی شامل ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ جس افغان فوج کا ۱۹۸۰ء کی اواخر تک شیرازہ تقریباً بکھر گیا تھا اس کو ایک مربوط فوج کی شکل دی گئی۔ یہ کام کچھ حد تک جبری بھرتی کے فوجیوں کی تنخواہ بڑھا کر اور کچھ حد تک جدید ہتھیاروں کے استعمال میں تربیت یافتہ افسروں کو شامل کر کے کیا گیا۔ آجکل زمین پر زیادہ تر فوجی کارروائی کی ذمہ داری افغان فوجیوں کے کندھے پر ہے۔ سوویت افواج تقریباً ہمیشہ ہی ہوائی کارروائی میں حصّہ لیتی ہیں اور صرف غیر معمولی حالات میں ہی افغانستان کی زمینی افواج کو کمک پہنچاتی ہیں۔

ایک طرح سے حالیہ مہینوں میں ببرک کرمال حکومت کی نمایاں کامیابی یہ ہے کہ اس نے فوجی لحاظ سے اہم پنج شیر وادی میں لمبے عرصے تک امن وامان بحال رکھا ہے جو اس کے پہلے احمد شاہ مسعود کی رہنمائی میں باغیوں کی دہشت گردی کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اس میں اس حقیقت کا بھی اضافہ کر لیجئے کہ چینی سرحد تک جانے والے کابل کے شمال مشرق میں واقع واخان کے تنگ درے کو بھی موثر ڈھنگ سے بند کر دیا گیا ہے۔

ان وقوعات ، اور جس طرح سے نئی افغان قیادت نے فادر لینڈ محاذ اور افغان سیاست کی دوسری روائتی ساختوں کو فعال بنا کر اپنے اثر کو وسیع بنایا ہے ان سے کابل حکومت کو یقیناً نئی خود اعتمادی حاصل ہو گئی ہے۔

افغانستان میں پیدا اس نئے رجحان سے واشنگٹن اور اسلام آباد گٹھ جوڑ کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور چینی رہنما بھی اس حادثے سے بے چین ہو اُٹھے۔

مشکل سے ہی کوئی پڑوسی ملک ہے جس سے چین کا سرحدی تنازعہ نہ ہو۔ پاکستان کا یقیناً محاصل دوسرا ہے کیونکہ بیجنگ اور اسلام آباد دونوں نے غیر قانونی طور پر ہندوستان کے علاقے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ چین کی سرحد سے ملحق افغانستان کے پہاڑی صوبے بدخشان کو وہ ہتھیانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔

افغان چینی سرحد حالانکہ ۷۰ کلومیٹر سے زیادہ دوری تک نہیں پھیلی ہوئی ہے لیکن چینی فوج اور خفیہ خدمات نے اس سرحد کی ہر کلومیٹر کو چھوٹی موٹی چھاونی بنا دیا ہے۔

اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ خشکی سے گھرا ہوا یہ ملک جنوبی ایشیا میں توڑ پھوڑ کا خاص نشانہ بن گیا ہے اور پنٹاگن کا اندازہ ہے کہ اگر ایک طرف سوویت یونین افغانستان میں اور دوسری طرف ویتنام، کمپوچیا میں الجھے رہا تو اس کے وسائل بتدریج گھٹتے جائیں گے اور اس کی طاقت زائل ہو جائیگی۔ اس پہلو کے علاوہ پنٹاگن خلیج فارس اور بحر ہند میں اپنی فوجی طاقت کو بڑھانے کا افغانستان کو بہانہ

بنا رہا ہے۔

پاکستان ہمارے برصغیر میں چنگاری کو سلگتا اور شعلے کو بھڑکتا رکھنا چاہتا ہے۔ وہ ایشیا میں "صف اوّل" کی ریاست تصور کیے جاتے اور امریکی ہتھیار حاصل کرنے کے لیے افغانستان کو بہانہ بنا رہا ہے۔ زور شور سے لیکن غیر ایماندارانہ احتجاج اس بات کے خلاف کیا جاتا ہے کہ پاکستان افغان باغیوں کی مدد کر رہا ہے یا مسئلے کے سیاسی حل کے وہ خلاف ہے۔ لیکن یہ بات سچ ہے کہ ضیاء حکومت ایک طرف اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے منصوبے کو پورا کرنے میں تندہی سے مشغول ہے اور دوسری طرف دونوں ہاتھوں سے پیٹرو ڈالر سمیٹ رہا ہے جو افغان پناہ گزینوں کی "فلاح" کے لیے اور اسلام کے نام پر کچھ عرب ممالک بھیج رہے ہیں۔ لیکن اس کثیر رقم کا بہت بڑا حصہ افغانستان میں گڑبڑ پھیلانے کے لیے صرف کیا جا رہا ہے۔ اس طرح "افغانستان کارروائی" پاکستانی حکمرانوں کے لیے چین اور امریکہ سے فوجی ساز و سامان حاصل کرنے، رجعت پرست عرب حکومتوں سے پیٹرو ڈالر بٹور نے اور اپنے ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کا بہانہ ہے۔

یہ حقیقت کہ افغانستان میں باغیوں کو پاکستان کے ذریعہ اسلحہ فراہم کیے جاتے ہیں، قابل وثوق ذرائع سے مصدقہ ہو چکی ہے۔ مرحوم مصری صدر انور سادات نے این بی سی کو اپنے انٹرویو میں بتایا تھا کہ ریاستہائے متحدہ افغان باغیوں کے لیے اس وقت سے مصر سے اسلحہ خرید رہا ہے جب سے افغانستان حکومت نے اپنی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کے تحفظ کے لیے سوویت افواج کو بلایا ہے۔ اے بی سی ٹیلی ویژن نٹ ورک نے ایک سے زیادہ بار اعلان کیا ہے کہ ریاستہائے متحدہ، مصر، سعودی عرب اور پاکستان، افغان باغیوں کو مسلح کرنے اور تربیت دینے کی کارروائی میں خفیہ طور سے ملوث ہیں۔

افغانستان کی صورت حال اور اس ملک میں عدم استحکام پیدا کرنے میں پاکستان کا رول اصل میں اس جد و جہد کی شدت کا غمازہ ہے جو ایک طرف سماجی اور معاشی پالیسیوں میں ترقی پسند رجحان رکھنے والی اور سیکولر، اور دوسری طرف ملک کے اندر اور باہر کٹھ ملائیت پسند، جاگیردارانہ اور دقیانوسی ذہنیت رکھنے والی حکومتوں کے درمیان ہو رہی ہے۔

اس لحاظ سے افغان انقلاب کی کامیابی اور ناکامی بڑی حد تک ناوابستہ ممالک اور خاص کر جنوبی ایشیا کے ممالک کی لیاقت پر منحصر ہے جو اپنی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

علاقے کے کسی بھی دوسرے ملک کی طرح افغانستان کو بھی اقتدار اعلیٰ کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لیے جس قسم کی حکومت چاہے منتخب کرے اور ترقی کے جس سماجی اور معاشی رجحان کو چاہے اپنائے۔

اس افغانستان مخالف رجحان کی اصل وجہ پاکستان کے فوجی حکمرانوں اور اس مقصد سے تمام دقیانوسی نظریات کی حامل حکومتوں کا یہ خوف ہے کہ جمہوریت پسند اور سوشلزم کی طرف مائل افغانستان

کے ابھرنے سے علاقے کے لوگ ایک نئے نمونے سے روشناس ہو جائیں گے۔ اور وہ حکومتیں خاص طور سے اس بات سے خوفزدہ ہیں جن کی باگ ڈور مذہبی جنونیوں کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ترقی پسند اور جمہوریت پسند افغانستان کا شمال مغربی سرحدی صوبے، بلوچستان، سندھ اور جاگیردارانہ پنجاب تک سارے ملک پر زبردست اثر پڑے گا۔

افغانستان میں "اسلام خطرے میں ہے" کا ہوا جزوی طور پر اس لیے کھڑا کیا جا رہا ہے کیونکہ کچھ جاگیردار مسلم ریاستیں اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ کہیں ان کے موجودہ سماجی نظام کو سوشلزم کی لہر بہا نہ لے جائے اور جزوی طور پر وہ سوویت مخالف مغربی حلیفوں کے دباؤ میں ایسا کر رہی ہیں۔ امریکی سامراجی اور چینی شاونیت پرست قائد اور عرب رجعت پسند پاکستان کو افغانستان سے لڑنے کی ترغیب دے رہے ہیں اور اس کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔

یہ ہوا کھڑا کر دینے کے بعد کابل حکومت سے براہ راست گفت گو کرنے سے انکار کے لیے اسلام آباد میں منعقد اسلامی کانفرنس کی تجویز کو اب پاکستان بہانہ بنا رہا ہے۔ لیکن اس سے نہ پوری صورتحال واضح ہوتی ہے اور نہ یہ نظریہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان عظیم طاقتوں کے "چنگل" میں پھنس گیا ہے۔

افغانستان نے ایک بار پھر پاکستان اور ایران سے درخواست کی ہے کہ وہ تعلقات کو معمول کے مطابق بنانے کے لیے بات چیت کریں۔ ۱۴ مئی ۱۹۸۰ء سے یہ ساتویں دفعہ ہے کہ کابل نے یہ پیش کش کی ہے۔ کابل نے آخری پیش کش اس صورت میں کی ہے جب افغانستان میں ہونے والے واقعات کے بہت سے حقائق عیاں ہو چکے ہیں۔ ساری دنیا اور خاص کر امریکہ اور پاکستان کے سنجیدہ لوگوں کے سامنے یہ بات رفتہ رفتہ واضح ہوتی جا رہی ہے کہ افغانستان کے خلاف یہ بلا اعلان جنگ اس اشتعال اور سازش کا راست نتیجہ ہے جس کا منصوبہ پنٹاگان، بیجنگ اور اسلام آباد محور نے بنایا ہے۔

یہاں ایک معقول سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ پاکستان بات چیت کے ذریعہ افغان مسئلے کو حل کرنے کے لیے تیار کیوں نہیں ہوتا جبکہ افغان پناہ گزیں اس کے لیے اہم سماجی و معاشی مسئلہ بن چکے ہیں؟

اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے کیونکہ اس کی پیچیدگیاں جتنا اوپر سے نظر آتی ہیں اس سے کہیں زیادہ گہری ہیں۔

پاکستان کی سرزمین سے تخریب کاری کرنے والا افغان انقلاب دشمنوں کا نہایت ہی جنونی دستہ حزب اسلام پارٹی ہے جس کا رہنما ۴۰ سالہ دہشت گرد گل بدین حکمت یار ہے۔ وہ کئی خصوصی یونٹوں کا انچارج ہے جو سی آئی اے، فوجی خفیہ خدمت اور پاکستان کی وزارت خارجہ سے مستقل رابطہ قائم رکھتی

ہیں اور افغان پناہ گزینوں کے ذہنوں میں نظریات ٹھونسنے کی کوشش کرتی ہیں۔

دہشت گرد گروپ مقامی آبادی کو دہشت زدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً ہر تخریبی کارروائی کے بعد دہشت گرد پرچے تقسیم کرتے ہیں جس کے ذریعہ لوگوں کو دھمکایا جاتا ہے کہ اگر انھوں نے معاملے کی رپورٹ قانون کے محافظوں تک پہنچائی تو انھیں خطرناک نتائج بھگتنے پڑیں گے۔

یہ حقائق ان کے طریقۂ کار کو واضح کرنے کے لیے بیان کیے جارہے ہیں۔ یہ سب بالکل اسی انداز کے ہیں جن کا تجربہ ہمیں ہندوستان کے کچھ حصوں میں ہورہا ہے۔ یہ منظم بین الاقوامی دہشت گردی کا حصہ ہے جس کی تنظیم اور منصوبہ سازی کہیں اور ہوتی ہے۔

کیا یہ محض اتفاق ہی ہے کہ ہندوستان میں پنجاب، جموں و کشمیر میں اور افغانستان میں عدم استحکام کو پاکستان سے منظم کیا جارہا ہے؟ دونوں کارروائیوں میں بنیاد پرستی کارفرما ہے جو ہندوستان میں ہندو 'کافروں' اور افغانستان میں کمیونسٹ 'کافروں' کے خلاف ہے۔

اس کا جواب کچھ بھی ہو لیکن یہ بات یقینی ہے کہ افغانستان کے خلاف بے اعلان جنگ اور اسکے اصل اور امکانی نتائج ایشیائی امن کے لیے سنگین خطرہ پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے فوجی ڈکٹیٹروں کے ذہن میں یہ بات بالکل واضح ہوجانی چاہئے کہ پاکستان کو اپنی کلیدی جائے وقوع کی بدولت ایشیا میں امن برقرار رکھنے اور پُرامن ڈھنگ سے تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے معاون رول ادا کرنا چاہئے، اور وہ یہ رول ادا کرسکتا ہے۔

بہت دن نہیں بیتے جب پاکستان کی عوامی پارٹی کی رہنما نصرت بھٹو نے فرانسیسی اخبار کو دیئے گئے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ "جسے افغانستان کا مسئلہ کہا جاتا ہے اس پر پاکستان کی فوجی حکومت کے ذریعہ مچایا جانے والا غل غپاڑہ ایک جعل و فریب اور دھوکے سے بھی کچھ زیادہ ہے۔" انھوں نے مزید کہا کہ " اگر پاکستان کی عوامی پارٹی پاکستان میں برسرِاقتدار آتی ہے تو وہ ببرک کرمال کی رہنمائی میں جمہوری افغانستان کی جائز حکومت کو سرکاری طور پر منظور کرے گی۔ اور تمام مسائل، بات چیت کے ذریعہ حل کرے گی۔" انھوں نے بات یہیں ختم نہیں کی بلکہ انھوں نے یہ بھی کہا کہ "تخریب کار فوجی عناصر جو جمہوری جمہوریہ افغانستان کے خلاف مداخلت کرنے کے لیے پاکستان کی سرزمین کو استعمال کرتے ہیں، وہ مداخلت پسند ہیں اور ان کی موجودگی پاکستان کے لیے سنگین خطرہ ہے۔"

یہ تبصرہ بذاتِ خود بہت واضح ہے اور اس کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی پورے مسئلے کا لب لباب یہ ہے کہ اسلام آباد جو پاکستانی عوام کی جمہوری حقوق کو سلب کرنے کیلئے اسلام کا استعمال کررہا ہے، وہ دن رات اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ نہ صرف افغانستان کے خلاف نیابتی جنگ جاری رکھے ہے بلکہ اسے شدید بنا رہا ہے۔ تلخ حقیقت یہ ہے کہ خود کو

"صفِ اوّل کی ریاست" اور "خلیج کا صحن" کہنے کے پس پردہ وہ اس علاقے میں یقیناً کسی اور کا کھیل کھیل رہا ہے۔

اس چال کو ناکام بنا کر اور اپنی آزادی اور اپنے اقتدارِ اعلیٰ کا تحفظ کر کے افغانستان کے عوام یقیناً حب الوطنی کے اپنے فرائض پورا کر رہے ہیں۔ لیکن وہ اس سے کچھ زیادہ کر رہے ہیں۔ وہ ایشیا میں امن کے مقصد کے لیے بیش قیمت حصّہ ادا کر رہے ہیں جہاں امن کو پاکستانی فوجی حکمراں اور ان کے مربیوں کی طرف سے برابر خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔

۲۔ ہند، پاک فوجی تناسب

جنوبی ایشیا اور بحر ہند میں خطہ جاتی سلامتی کے تناظر میں

رشیدالدین خاں

خطّہ جاتی تناظر

جنوبی ایشیا میں سات ریاستیں ہیں، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، شری لنکا اور جزائر مالدیپ۔ ہندوستان برصغیر کی حیثیت رکھتا ہے جو ہمالیہ سے لے کر بحر ہند تک پھیلا ہوا ہے اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا نیز رقبے کے لحاظ سے ساتواں سب سے بڑا ملک ہے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش آبادی کے لحاظ سے دنیا میں بالترتیب ۱۰ ویں اور آٹھویں حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں بے حد گنجان آبادی ہیں اور خاصے وسیع علاقے کے حامل ہیں۔ نیپال اور بھوٹان خشکی سے گھرے پہاڑی ممالک ہیں اور شری لنکا اور مالدیپ بحر ہند کے جزائر ہیں۔ آبادی، رقبہ اور قدرتی وسائل کے اعتبار سے جنوبی ایشیا کا ۷۵ فی صد حصہ ہندوستان میں ہے۔ یہ اس خطے کی واحد ایسی ریاست ہے جس کی سرحدیں خشکی اور تری کے ذریعے دوسری سبھی چھ ریاستوں سے مل جاتی ہیں۔ ان میں سے چار ریاستوں کے ساتھ اس کی بری سرحدیں ملتی ہیں اور دو کے ساتھ بحری سرحدیں۔ ساتھ ہی طبعی لحاظ سے وہ جنوب مغربی ایشیا میں افغانستان سے، وسط ایشیا میں تین سوویت جمہوریوں سے مشرقی ایشیا میں چین سے، جنوب مشرقی ایشیا میں برما سے، نیز بحری سرحد کے ذریعے انڈونیشیا سے بہت قریب ہے۔ پاکستان مشرق میں ہندوستان سے

گھرا ہوا ہے، اس کی مغربی سرحدیں جنوب مغربی ایشیا میں افغانستان اور کسی قدر ایران سے مل جاتی ہیں اور شمال میں وہ چین اور سوویت یونین دونوں سے بہت قریب ہے۔ اس کی بحری سرحد آبنائے ہرمز سے کچھ فاصلے پر اومان کی بحری سرحد سے مل جاتی ہے۔ بنگلہ دیش کی سرحدیں ہر طرف سے ہندوستان سے ملتی ہیں، ویسے مشرق میں اس کی سرحد کا کچھ حصہ برما سے بھی ملتا ہے۔ ہمالیہ کے دامن میں واقع نیپال اور بھوٹان کے جنوب میں ہندوستان ہے اور شمال میں چین۔

سیاسی نظاموں کے لحاظ سے ہندوستان ایک ری پبلکن وفاقی پارلیمانی جمہوریہ ہے جو سماج کو سیکولر بنانے پر یقین رکھتی ہے، پاکستان اور بنگلہ دیش اسلامی جمہوریائیں ہیں اور دونوں جگہ فوجی سرکاریں قائم ہیں۔ شری لنکا صدارتی طرز کی جمہوریہ ہے، جہاں ہنگامی حالات نافذ ہیں اور جہاں بدھ مت کو غالب مذہب کی حیثیت حاصل ہے، نیپال ایک ہندو سر قبیلی ملوکیت کا حامل ہے جہاں بنیادی پنچایت پر عمل کیا جاتا ہے، بھوٹان میں بدھ مت کی مذہبی ملوکیت ہے اور مالدیپ میں فوجی ڈکٹیٹر شپ۔

چھ بڑی نیوکلیائی طاقتوں میں سے تین جنوب ایشیا کے اردگرد واقع ہیں۔ سوویت یونین اور چین کے علاقے بھی ملتے ہیں اور بحر ہند میں ان کے بحری جہاز بھی موجود ہیں۔ امریکہ نے بحر ہند میں اپنے اڈے بھی قائم کر رکھے ہیں اور اس نے تیزی سے حرکت میں آنے والی فوج پر مشتمل جو مرکزی کمان حال میں بنائی ہے اس کے دائرۂ اختیار میں جنوبی ایشیا بھی شامل ہے۔ اس طرح "ہمارا فوجی ماحول روز افزوں پیمانے پر نیوکلیائی بنتا جا رہا ہے۔"

"عام تصور کے برخلاف جنوبی ایشیا دنیا کے بیشتر خطوں کے مقابلے میں عسکریت بندی کے لحاظ سے پیچھے ہے"۔ جنوبی ایشیا میں مسلح افواج اور آبادی کا تناسب سب سے کم ہے۔ عالمی سطح پر ترقی پذیر دنیا میں یہ تناسب ۴ اور ۸ کا، اور ترقی یافتہ دنیا میں ۹ اور ۵ کا ہے۔ ۱۰ سال کے اندر یعنی ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۰ء تک جنوبی ایشیا میں یہ تناسب ہر ایک ہزار آبادی پر تین اور ایک سے گھٹ کر ۲ اور ۲ ہو گیا۔ اس طرح عالمی معیار کے لحاظ سے یہ خطہ اسلحہ بندی کے میدان میں پسماندہ ہے۔ جنوبی ایشیا میں روئے زمین کی آبادی کا تقریباً ۲۰ فی صد حصہ رہتا ہے لیکن یہاں کے فوجی اخراجات روئے زمین کے فوجی اخراجات کا صرف ۱،۲ فی صد ہیں (۱۹۸۰ء میں ۵،۵ ارب ڈالر) جبکہ باقی ترقی پذیر دنیا میں چین کو چھوڑ کر، جس کی آبادی کا تناسب عالمی آبادی کے تناظر میں تقریباً اتنا ہی ہے تقریباً ۱۵ فی صد فوجی اخراجات ہیں۔ برسبیل تذکرہ بتا دیا جائے کہ ترقی یافتہ دنیا جس کی آبادی کہیں زیادہ کم ہے روئے زمین کے فوجی اخراجات کا ۸۰ فی صد خرچ کرتی ہے۔ عالمی فوجی تحقیق و ترقی کا ۹۷ فی صد اور اسلحے کی عالمی تجارت اور منتقلی کا ۹۶،۴ فی صد حصہ اسی سے تعلق رکھتا ہے۔ تقسیم اسلحہ کے معاملے میں بھی جنوبی ایشیا

بہت پیچھے ہے۔ مغربی ایشیا کو ۷ ء ۴۲ فی صد ہتھیار ملتے ہیں، افریقہ کو ۳ ء ۲۲ فی صد، مشرقی ایشیا کو ۲ ء ۱۳ فی صد اور لاطینی امریکہ کو ۷ ء ۱۰ فی صد، جبکہ جنوبی ایشیا کو سب سے کم یعنی ۸ ء ۸ فی صد ہتھیار ملتے ہیں۔

جنوبی ایشیا "چاروں طرف سے اعلیٰ تر اخراجات کی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے"۔ جس میں چین، سوویت یونین، جنوب مغربی ایشیا، مغربی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا شامل ہیں۔ خطّے کے اردگرد کے علاقے میں صرف فوجی اخراجات ہی نہیں بڑھ رہے ہیں بلکہ اسلحوں کی ریل پیل بھی بڑھ رہی ہے۔ ترقی پذیر قوموں کی عالمی پیمانے پر جو اسلحے فراہم کیے جا رہے ہیں ان کا آدھے سے زیادہ حصّہ ہمارے پڑوس میں آ رہا ہے، جس میں جنوب مغربی ایشیائی کشیدگی سے بھرے اور ٹکراؤ میں الجھے ہوئے خطّے (جن میں تقریباً ۵ سال سے ایران عراق جنگ جاری ہے اور افغانستان بدستور ٹکراؤ کا مرکز بنا ہوا ہے) اور جنوب مشرقی ایشیا (جن میں کمپوچیا اور تھائی لینڈ نیز ویت نام اور چین کی باہمی سرحدیں کبھی پرسکون نہیں بن پاتیں) شامل ہیں۔ لیکن جنوبی ایشیا کے فوجی اخراجات عام قومی پیداوار کے فی صد تناسب کے اعتبار سے ۷ ء ۳ سے گھٹ کر ۹ ء ۲ رہ گئی ہے (آج کا عالمی تناسب ترقی یافتہ دنیا میں ۴ ء ۵ فی صد اور ترقی پذیر دنیا میں ۱ ء ۵ فی صد ہے۔)

ہند۔پاک تعلقات اور عالمی طاقتیں

طاقت کے تعلقات کے دو تناسبات ہیں جو جنوبی ایشیا میں سلامتی کے ماحول پر مشترکہ طور سے اور شدت کے ساتھ طاری ہیں، یہ ہیں ہند۔پاک تعلقات اور اس خطّے میں امریکہ اور سوویت یونین کے فوجی تصورات اور مفادات۔ امریکہ کے ساتھ پاکستان کی گہری ساز باز اور اس کا فوجی گٹھ جوڑ اور سوویت یونین کے ساتھ ہندوستان کا کثیر پہلو تعاون اور مفاہمت ہی اس خطّے کے دو اہم اور ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے طاقتی تناسبات ہیں۔ دراصل پاکستان کو امریکہ کی فوجی حکمت عملی میں بنیادی مقام حاصل ہے اور کم سے کم ۱۹۵۴ء سے امریکہ کی سبھی سرکاریں اسے مسلسل ایک قابل اعتماد حلیف اور افغانستان کی حالیہ صورت حال کے تناظر میں ہی نہیں بلکہ سرد جنگ کی سیاست میں جس کا بنیادی نقطہ "کمیونزم کو قابو میں رکھنے" اور نام نہاد سوویت توسیع پسندی" کا توڑ کرنے کی امریکی عالمی پالیسی ہے۔ نیز مغربی ایشیا کی اسلامی ریاستوں کے نظام کے ساتھ مفاہمت کے رشتے قائم کرنے کے سلسلے میں بھی مغربی اشتراک کے نظام کے لیے ایک 'اہم عنصر' اور 'محاذی ریاست' قرار دیتی رہی ہیں۔ اس صورت حال نے جنوبی ایشیا میں خطّہ جاتی سلامتی کے سلسلے میں ایک

خاص حیثیت حاصل کرلی ہے۔ سوویت یونین کے ساتھ ۱۹۵۵ء کے بعد سے ہندوستان کا گہرا اور روزافزوں کثیر پہلو تعاون اور ۱۹۷۱ء میں امن دوستی اور تعاون کے ہند۔سوویت معاہدے کی صورت میں اس کی سرکاری توثیق کے ساتھ مختلف سماجی سیاسی نظام رکھنے والی دو ریاستوں کے درمیان ایک انوکھی قسم کے بین ریاستی تعلقات کی صورت گری عمل میں آئی ہے جو سوشلسٹ عالمی طاقت اور ناوابستگی کے ایک اہم نقیب ملک کے درمیان قائم ہیں اور جو امن واستحکام کے سلسلے میں فیصلہ کن نوعیت رکھنے والے ایک خطہ جاتی عنصر کے طور پر سامنے آرہا ہے۔

آبادی، قدرتی وسائل، صنعتی ذیلی ڈھانچے، تکنیکی سائنسی عملے، زرعی پیداوار، عام قومی پیداوار، فوجی اخراجات، دفاعی پیداوار اور فوجی طاقت کے لحاظ سے ہندوستان دنیا کی ایک سب سے بڑی قوم بن گیا ہے۔ وہاں مستحکم جمہوری نظام قائم ہے جو عام بالغ رائے دہندگی پر مبنی ہے (رائے دینے والوں کی آبادی امریکہ کی مجموعی آبادی سے ایک تہائی زیادہ ہے) اور اپنی ملی جلی معیشت کے پروگرام سے، جس میں پرائیویٹ اور پبلک (سرکاری) سیکٹر دونوں کو اہمیت حاصل ہے اور جس کا مقصد مساوی بنیادوں پر انصاف بہم کرنا اور چالیس سے اڑتالیس فی صد لوگوں کو غریبی کی سطح سے اوپر لانا ہے، ہندوستان سماجی واقتصادی تبدیلی کے ایک ایسے پروگرام پر چل رہا ہے جس کی مثال دنیا میں ملنی مشکل ہے۔

تقسیم کے زخموں کے بعد آزادی کی خوشیوں میں ہندوستان نے جو خواب دیکھا، وہ تھا اچھی ہمسائیگی کی فضا میں ترقی کا خواب۔ اقتصادی ترقی پر زور تھا، صنعتی ترقی کے راستے پر آگے بڑھنا تھا اور لوگوں کی زندگی کا معیار بلند کرنا تھا۔ دفاع ترجیحات میں کوئی اونچا مقام حاصل نہ تھا۔ "پچاس کی دہائی میں ہندوستان کا خیال تھا کہ جی ڈی پی کے دو فی صد سے بھی کم کے چھوٹے دفاعی پروگرام سے اس کی حفاظتی ضروریات پوری ہوں گی .... لیکن ہندوستان کے اس یقین کو اکتوبر ۱۹۶۲ء کے چینی حملہ نے ... اور پھر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے ساتھ مختصر سی جنگ نے ختم کرکے رکھدیا۔ چین کے حملہ سے خاص طور پر ہندوستان کو ایک تلخ ترین تجربہ ہوا۔" ۲۲ اگست ۱۹۶۳ء کو سرکار کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پر جو تقریر جواہر لال نہرو نے کی اس میں بہت درد تھا۔ اپنی اس تقریر میں انھوں نے پوری قوم کے احساسات کی ترجمانی کی تھی۔ انھوں نے کہا۔ "ہم خوابوں کی دنیا میں رہتے چلے آئے تھے، یہ دنیا ظالم ہے۔ ہم نے امن کا پرچم ہر جگہ لینے کی بات سوچی تھی مگر ہم کو دھوکا دیا گیا۔ پاکستان نے ہم کو دھوکا دیا، چین نے ہم کو دھوکا دیا، پوری دنیا نے ہم کو دھوکا دیا۔ امن کے راستے پر چلنے کی ہماری کوششوں کو مسدود کردیا گیا ہے۔ ہم مجبور رہیں ایک دفاعی جنگ

کی تیاری کرنے کے لیے، حالانکہ ہماری یہ مرضی نہیں تھی۔"

اس صدمہ کے نتیجہ میں ہندوستانی فوج کی تعداد دو برسوں میں چار لاکھ سے بڑھا کر آٹھ لاکھ ساٹھ ہزار کر دی گئی۔ اور ۱۹۶۲ء میں ہندوستان نے فوج کے نو ڈویژن قائم کیے جن کو نئے سرے سے تربیت دی گئی اور نئے ہتھیار دیئے گئے۔ شمالی سرحدوں پر مواصلات اور ٹرانسپورٹ کا جال بہت مضبوط بنایا گیا۔ دفاعی اخراجات کو بڑھا کر دوگنا کر دیا گیا۔ اور اگلے دو برسوں میں یہ اخراجات جی ڈی پی۔ کے چار اور چار عشاریہ پانچ فی صد کے درمیان تک پہنچ گئے۔ مشینی اوزاروں اور فولاد کی پیداوار اور دھاتوں اور دوسرے خام مال کی پیداوار بڑھا دی گئی۔... ریلوے کی کارکردگی بہتر بنائی گئی۔... اور پاور پراجیکٹ کی تکمیل کا کام تیز کیا گیا۔.. اور سب سے اہم بات یہ کہ بنیادی صنعتوں میں اور ہتھیاروں میں قومی خود کفالت حاصل کرنے کے لیے تمام تر کوششیں کی گئیں۔ برسوں کے لیے ہندوستان کے دفاعی اخراجات ۳ء۵ اور ۴ فی صد کے درمیان رہے مگر ۸۳ - ۱۹۸۲ء میں یہ مجموعی قومی آمدنی کے ۵ فی صد حصہ تک پہنچ گئے۔ ۱۹۶۲ء سے ہندوستان اپنی دفاعی تیاری ایک خاص سطح پر رکھنے کے لیے مجبور ہوا اور ۱۹۷۸ء جگ ور جہاز خریدنے کے لیے اسوقت تک سب سے بڑا واحد سودا کیا۔ ۱۹۷۹ء میں اس سے بھی زیادہ مالیت کے ہتھیار خریدنے کے لیے بات چیت شروع کی گئی۔ ۱۹۸۴ء تک ہندوستان نے ۵۰۰ ملین ڈالر کی قیمت پر چالیس فرانسیسی مراج ۲۰۰۰ جنگی طیارے اور آٹھ برٹش سی ہریر جنگی طیارے حاصل کر لیے تھے۔ سی ہریر جہازوں کو ہندوستانی بحریے میں شامل کر لیا گیا ہے اور ان کو آئی این ایس وکرانت سے اپنی کارروائی کرنی ہے۔ جو ہندوستان کا واحد طیارہ بردار سمندری جہاز ہے۔ اس وقت جو روسی ساخت کے مگ ۲۳ اور مگ ۲۷ جہاز ہیں ان کے علاوہ مگ ۲۹ بھی ہوائی بیڑہ میں شامل کر لیے جائیں گے جن کے بارے میں دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ وہ امریکی ایف ۱۶ سے زیادہ موثر ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستان وہ پہلا ملک ہے جس کو روس نے یہ جہاز فراہم کیا ہے۔ روس نے، اطلاع کے مطابق، مگ ۳۱ فراہم کرنے کی بھی پیش کش کی ہے، جو ابھی تیاری کے مراحل سے گزر رہا ہے۔

پاکستان اپنی آبادی، رقبہ، جغرافیائی اہمیت، مجموعی اقتصادی ترقی، دفاعی اخراجات، ہتھیاروں کے معیار اور فوج کے اعتبار سے علاقائی پیمانے پر بھی اور عالمی پیمانہ پر بھی ایک اہم ملک ہے۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے بعد اس کے وجود کے وقت سے ہی پاکستان نے مختلف سیاسی، نظریاتی اور نفسیاتی وجوہ کی بنا پر اپنے آپ کو ہندوستان کے برابر اور ٹکر کا ملک تصور بھی کیا اور اسی انداز میں اپنے کو پیش بھی کیا۔ اس کے اس تصور اور انداز میں ۱۹۷۱ء کے بعد بھی کوئی فرق نہیں آیا جب مشرقی پاکستان کا اس کا حصّہ الگ ہو کر ایک آزاد مملکت بن گیا۔ اپنی ذات کے متعلق اس تصور اور اس پر مبنی پالیسیوں سے اس کی

خارجہ پالیسی اور ہندوستان کے ساتھ تعلقات کے کچھ خاص پہلوؤں کی وضاحت ہوتی ہے۔ پاکستان نے یہ کوشش کی کہ امریکہ اور اسلامی ملک خاص طور پر کچھ عرب ملک اور عام طور پر بین الاقوامی برادری کے دوسرے ملک بھی اس کو اسی حیثیت میں قبول کریں اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔ اگر دونوں ملکوں میں موازنہ کیا جائے تو پاکستان، ہندوستان سے چھوٹا ملک ہے۔ آبادی میں سات گنا کم اور رقبہ میں چار گنا کم۔ جہاں تک سماجی و اقتصادی ترقی کا تعلق ہے، مثلاً حقیقی ترقی، درآمد برآمد، خواندگی اور تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کا پھیلاؤ، تو ہندوستان، پاکستان سے آگے ہے۔ لیکن جہاں تک دوسرے شعبوں کا تعلق ہے مثلاً توانائی کی فی کس پیداوار، شہروں کا پھیلاؤ، صحت اور علاج و معالجہ کی سہولیات اور فی کس مجموعی قومی آمدنی تو پاکستان، ہندوستان سے آگے ہے۔ پاکستان دفاع پر ہندوستان سے زیادہ فی کس مجموعی قومی آمدنی خرچ کرتا ہے۔ ہندوستان کا یہ خرچہ نو ڈالر ہے اور پاکستان کا ۲۹ ڈالر۔

پچھلے سات برسوں کے دوران، جب سے جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالا، پاکستان کے فوجی بجٹ میں خاصا اضافہ ہوا۔ حالانکہ بھٹو کے دور میں بھی ۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک مسلح افواج میں ۷۰ فی صد کی توسیع کی گئی اور دو بلین ڈالر کا ساز و سامان فوج کو مہیا کیا گیا۔ بھٹو کے دور میں دفاعی اخراجات ۷۳-۱۹۷۲ء میں ۴۲۳ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۸۱۲ کروڑ روپے تک پہنچ گئے۔ مگر جنرل ضیاء کے آنے کے بعد سے اس خرچہ میں مزید اضافہ ہوتا رہا۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں یہ ۷۹-۱۹۷۸ء کے مقابلہ میں دوگنا سے بھی زیادہ ہو گیا اور ۸۵-۱۹۸۴ء تک یہ تین گنا ہو گیا۔ پاکستانی روپیوں میں یہ اخراجات ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۱۶۰۱ کروڑ روپے، ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۲،۵۲۲ کروڑ، اور ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۰۳۷ کروڑ تھے یعنی کل بجٹ کا ۳۰ فی صد۔ اس میں وہ امداد شامل نہیں جو بیرونی ملکوں سے حاصل ہوتی۔ ۱۹۷۶ء میں سعودی عرب نے ۱.۱ بلین ڈالر کی رقم فراہم کرنے سے اتفاق کیا جس میں ۵۵۰ ملین ڈالر کی رقم ہتھیار بند فوج کو جدید بنانے کے لیے تھی۔ امریکہ سے ہتھیاروں کی سپلائی ۱۹۵۹ء کے ایگزیکٹو سمجھوتہ کے تحت ہوئی ہے۔ ۱۹۸۲ء میں امریکہ نے ۳.۲ بلین ڈالر کی رقم فوجی اور اقتصادی امداد کے طور پر دی۔ اطلاعات کے مطابق چین نے پچاس کیانگ۔۵ جنگی طیارے فراہم کیے اور مزید ایک سو ایسے طیارے فراہم کرنے جا رہا ہے۔ دو انجنوں کا یہ جہاز روسی مگ۔۱۹ میں ترمیم و تبدیلی کے بعد بنایا گیا ہے۔

لیکن جنوبی ایشیا کے "عدم تحفظ کے نظام" جیسا کہ امریکہ کے کچھ تجزیہ نگار اس کو کہنا پسند کرتے ہیں، کی صورت اور وجوہات کو ہندوستان اور پاکستان کی دفاعی صلاحیتوں کے تقابلی ڈھانچوں میں تلاش نہیں کیا جانا چاہیے۔ اگر "جنوبی ایشیا کے تحفظ کا نظام، عدم تحفظ کا نظام" ہے جیسا کہ اسٹیفن کوہن نے کہا ہے، اور جس کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے، تو اس کی ایک وجہ وہ چالیں بھی ہیں جو

بحراوقیانوس کے اس پار کا ایک طاقتور ملک، جو اپنے آپ کو حال ہی میں ختم ہوئے یوروپی نوآبادیاتی نظام کا وارث سمجھتا ہے، ۱۹۴۵ء سے عالمی سیاسی شطرنج پر چلتا رہا ہے۔ اس پر کمیونزم کے پھیلاؤ کا آسیب اس طرح مسلط ہوگیا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو آزادی کی بنیادوں کو حفاظت کرنے والے محافظ و مجاہد کے روپ میں دیکھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ تیسری دنیا میں آزادی کے یہ ستون کون تھے، جن کو یہ عالمی محافظ و مجاہد بچا رہا تھا اور کیسے؟ ان میں دنیا کا سب سے بڑا نسل پرست جنوبی افریقہ، مسلسل جنگ پر آمادہ اسرائیل، کیوبا کا استحصال پسند باتستا، چلی کا فاشسٹ پنوشے، ویت نام کے تاناشاہ باؤدی اور این گو دین دیم اور ان کے علاوہ مختلف ملکوں کے شیخ، سلطان، ڈکٹیٹر اور وہ جنرل شامل ہیں جنھوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں حکومتوں کا تختہ الٹا دیئے جانے کے بعد اقتدار حاصل کیا ہے۔ یہ پاکستان کی خوش قسمتی رہی ہے کہ یہاں کے فوجی حکمرانوں اور تختہ الٹا دیئے جانے کے بعد اقتدار حاصل کرنے والی حکومتوں کو، امریکہ کی امداد اور حمایت حاصل رہی ہے۔ صرف ایک ذوالفقار علی بھٹو تھے، جو پاکستان کے پہلے منتخب حکمراں تھے، جن کو یہ حمایت حاصل نہیں رہی۔ انھوں نے اپنی آخری وصیت میں کہا کہ ان کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر انھوں نے امریکہ کی نافرمانی کی تو ان کو دوسروں کے لیے ایک "ہیبتناک مثال" بنایا جائے گا۔ اور جب وہ پھانسی پر چڑھ گئے تو ان کو یقین تھا کہ ان کو "ہیبت ناک مثال" بنایا جا رہا ہے۔ یہ ہے آزادی کی حفاظت۔

۱۹۷۱ء کی ہند۔ پاک جنگ کے بعد، جس کی وجہ مشرقی پاکستان کے واقعات تھے جن کے نتیجہ میں بنگلہ دیش وجود میں آیا، ۱۹۷۲ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان شملہ سمجھوتہ پر دستخط ہوئے۔ یہ سمجھوتہ دو ملکوں کے درمیان عملی تعلقات کا نمائندہ تھا اور اس کے بعد جنوبی ایشیا میں فضا مقابلتاً پُرامن رہی۔ اور یہ فضا ستر کی دہائی کے دوران قائم رہی۔ مگر اسّی کی دہائی کے آغاز میں صورت حال یکسر بدل گئی۔" اسّی کی دہائی کا آغاز عالمی سلامتی اور عالمی سیاست کیلئے منحوس رہا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد پہلی بار ہمارا رُخ ایسے بحرانی حالات کی طرف تھا جن کا نتیجہ عالمی نیوکلیائی جنگ ہوگا۔"

اسّی کی دہائی کی اس سرد جنگ کی ابتدا ان واقعات سے ہوئی جو ۱۹۷۷ء میں مئی اور اگست کے درمیان پیش آئے تھے۔ مئی میں ہارن آف افریقہ کے بحران کو امریکہ نے روس کی طرف سے اپنی طاقت کے مظاہرہ کے روپ میں دیکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ اور روس کے درمیان ہو رہی وہ بات چیت یک طرفہ طور پر منسوخ کرنے کا اعلان کیا گیا جو بحر ہند کو امن کا علاقہ قرار دیئے جانے کے امکانات کے بارے میں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد اگست میں امریکہ کے اس ارادہ کا اعلان کیا گیا کہ راپڈ ڈیپلائمنٹ فورس قائم کی جائے گی جس کا دائرۂ عمل بحیرۂ احمر اور خلیج کے درمیان کا علاقہ ہوگا۔

اس کے بعد ٹکراؤ کی حکمت عملی شروع ہوئی اور جو بھی کوئی واقعہ پیش آتا اس کو موقف سخت کرنے کا بہانہ بھی بنا دیا گیا اور جواز بھی۔ یہاں اس سلسلے میں چند ایک واقعات کو اختصار سے پیش کرنا صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مئی ۱۹۷۸ء میں ناٹو ملکوں کی چوٹی کانفرنس میں ٹکراؤ کے طریقہ کی توثیق کی گئی اور دفاعی اخراجات میں پندرہ فی صد کا اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جون میں صدر کارٹر نے روس کے ساتھ "تعاون اور تصادم" کی بات کی۔ جنوری ۱۹۷۹ء میں ایران میں شاہ کو ہٹا دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی وہاں قائم امریکہ کا دوسرے ملکوں پر نظر رکھنے اور جاسوسی کا سسٹم ختم ہو گیا۔ دسمبر میں افغانستان میں روس کی فوج داخل ہو گئی۔ جنوری ۱۹۸۰ء میں کارٹر نے دھمکی دی "خلیج میں مداخلت مت کرو۔" انھوں نے کہا کہ مغربی ایشیا میں امریکہ کے اہم مفادات کی حفاظت کے لیے طاقت کا استعمال بھی کیا جائے گا۔ اس کے بعد کارٹر کے اس اعلان کو ٹھوس شکل دی گئی اور آر ڈی ایف کا قیام عمل میں لایا گیا اور بحر ہند میں ڈیگو گارشیا اڈے کو وسعت دی گئی اور اس کا درجہ بڑھا دیا گیا۔ پاکستان کو ہتھیاروں کی سپلائی نئے سرے سے شروع کی گئی اور نتیجہ کے طور پر ہندوستان بھی ہتھیار حاصل کرنے لگا۔ چین نے ویت نام پر حملہ کیا اور کمپوچیا کے معاملہ پر ویت نام اور تھائی لینڈ میں جھگڑا ہوا۔ ۱۹۸۳ء میں امریکی سینٹرل کمانڈ کو تشکیل دیا گیا۔ اس طرح سے ایران اور افغانستان کے واقعات کو طاقت کی رسہ کشی میں اس لحاظ سے بنیادی اہمیت حاصل ہو گئی کہ ان کی وجہ سے پہلی بار جنوبی ایشیا کو، نہ صرف جنوب مغربی ایشیا کے ساتھ بلکہ خلیج کے ساتھ بھی جوڑا گیا۔ اور فوجی حکمت عملی کے اعتبار سے پورے مغربی ایشیا کے حالات کے ساتھ بھی اس کا ناطہ جوڑا گیا۔ اس طرح سے جنوبی ایشیا بھی اس قوس میں شامل ہو گیا جس کو برزنسکی نے "بحرانوں کی قوس" کہا۔

امریکہ کی حفاظتی ترجیحات میں جو یہ اہم تبدیلی آئی اس میں پاکستان کو اتنی زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی، جتنی اسے کبھی حاصل نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن سمندری گزرگاہوں پر پاکستان کو ایک اہم پوزیشن حاصل ہے، جہاں سے خلیج کا تیل لایا جا رہا ہے۔ یہ ایک نئی صورت حال ہے۔ "عالمی معاملوں میں امریکی دلچسپی کے کل پس منظر میں اور مجموعی طور پر اس کی خارجہ پالیسیوں میں جنوبی ایشیا بہت عرصہ تک زیادہ توجہ کا مرکز نہیں رہا،" اور "تحفظ کے نقطۂ نظر سے بھی امریکہ نے اس خطہ میں اتنی دلچسپی نہیں لی جتنی مشرقی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں لی۔" مگر کارٹر انتظامیہ نے سابق امریکی حکومتوں کے مقابلے میں جنوبی ایشیا کی طرف مسلسل توجہ دی۔ پچھلی حکومتوں میں صرف کینڈی انتظامیہ (۱۹۶۱-۶۳ء) نے اور پھر نکسن انتظامیہ نے ۱۹۷۱ء کے جنوبی ایشیا کے بحران میں اس علاقہ میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

۱۹۸۳ء میں امریکی سینٹرل کمانڈ قائم ہونے سے پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات

اپنے عروج پر پہنچ گئے۔ سینٹرل کمانڈ کا دائرۂ عمل مصر سے لے کر پاکستان تک اور کینیا سے لے کر ایران تک انیس ملکوں پر پھیلا ہوا ہے۔ مگر ان میں شام، لبنان، اردن اور اسرائیل شامل نہیں ہیں۔ امکان یہ ہے کہ کمانڈ کا ہیڈکوارٹر یا تو ڈیگو گارشیہ میں ہوگا ورنہ مسیراہ جزیرے (عمان) میں ہوگا۔ خیال یہ کیا جا رہا ہے کہ امریکہ کی حکمت عملی میں پاکستان کو خلیج کے ملکوں اور امکانی طور پر خمینی کے جانے کے بعد ایران میں ایک اہم بلکہ بنیادی رول ادا کرنا ہوگا۔ امریکہ کا محاذی ملک بننے سے پاکستان کو فوجی اعتبار سے اتنی اہمیت حاصل ہوگئی کہ انسانی حقوق، نشہ آور دواؤں کی اسمگلنگ، جمہوریت اور نیوکلیائی ہتھیاروں کے پھیل جانے کی اہمیت اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ افغانستان کی صورت حال کے پیش نظر پاکستان کو فوجی اور اقتصادی امداد نئے سرے سے شروع کرنے میں کارٹر انتظامیہ سی منگٹن ترمیم کے نفاذ کے حق سے دستبردار ہوگیا۔

اسلامی ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات اور اپنی مضبوط فوجی حکومت کی بنا پر یہ امکان ہے کہ پاکستان کو امریکہ بحرِ ہند کے علاقہ میں ایک بہت ہی اہم طاقت کی حیثیت سے تسلیم کرے جس میں امریکہ کے خیال کے مطابق جنوبی ایشیا میں روسی اثر و رسوخ کو پھیلنے سے روکنے کے علاوہ خلیج میں امریکہ کے ہنگامی منصوبوں میں علاقائی حمایت اور مدد مہیا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ پاکستان ہی نے پہلے "امریکہ کو اور اس کے بعد چین کو برصغیر کے مسئلوں میں ملوث کیا۔ . . . غیر جانبدار تحریک کے معماروں نہرو، ناصر اور ٹیٹو نے یہ محسوس کیا تھا کہ علاقائی جھگڑوں کو اعلیٰ طاقتوں کی گروپ بندیوں سے وابستہ کر کے ان کو حل کرنے کی کوشش سے یہ بات یقینی ہو جائے گی کہ یہ جھگڑے کبھی حل نہیں ہوں گے اور متعلقہ علاقوں کے ملک بیرونی طاقتوں کے دست نگر ہو کر رہ جائیں گے۔" حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ "جنوبی ایشیا میں چین کے داخل ہونے سے حالات اور زیادہ پیچیدہ ہوگئے ہیں۔ اگر کل تک علاقائی سیاسیات پر امریکہ اور روس کے درمیان تناؤ کا اثر تھا، مگر اب اس پر روس اور چین کے جھگڑوں کا فاضل اثر پڑنے لگا ہے۔ بہت لوگ اس بات پر یقین نہیں کرتے کہ جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں امریکہ کی جگہ کسی حد تک چین نے لی ہے۔ ایسا شاید اس لیے ہوا کہ امریکہ بااثر علاقائی طاقتوں کو اپنا شریک کار بنانے کی پالیسی پر کاربند ہے۔" جنوبی ایشیا کے حالات پر نظر رکھنے والے ایک امریکی مبصر کا کہنا ہے کہ چین کے ساتھ مکمل سفارتی تعلقات قائم کرنے سے "ایشیا سے متعلق امریکی پالیسیوں پر اور مشرقی ایشیا اور ایشیا کے دوسرے حصوں میں طاقت کے توازن پر بلکہ پوری دنیا میں طاقت کے توازن پر" بہت گہرا اثر پڑا ہے۔

کچھ مبصرین کی یہ رائے ہے کہ "۱۹۷۹ء میں افغانستان میں روس کی فوجی مداخلت

اور درّۂ خیبر کے اس طرف روس کی موجودگی سے پاکستان کی سلامتی کا مسئلہ سنگین بن گیا۔"
اس کے علاوہ پاکستان کو افغانستان سے آئے ہوئے تیس لاکھ رفیوجیوں کے مسئلہ کا سامنا بھی ہے۔ ان رفیوجیوں کی وجہ سے جو پاکستان کو قیمت ادا کرنا پڑتی ہے اس سے پاکستان کا روشن خیال رائے عامہ اب واقف ہو رہا ہے۔ پاکستان کے ایک سابق سفارت کار کا کہنا ہے ۔" ان تیس لاکھ رفیوجیوں کی دیکھ بھال پر ہمیں خزانۂ عامہ سے امریکی ڈالروں کے حساب میں تین سو ملین ڈالر سالانہ خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ ان کے لیے جو امدادی سامان آتا ہے اس کو درآمدی محصول سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے اور اس سے سالانہ ۵۰ ملین ڈالر کا خسارہ ہوتا ہے ۔ یہ رفیوجی ہماری سماجی سروس اور عام ترقیاتی ڈھانچہ پر ایک بوجھ بن گئے ہیں . . . رفیوجی کم اجرت پر کام کرنے پر تیار رہیں اس وجہ سے ہماری اپنی لیبر کو روزگار کی تلاش میں دوسری جگہوں کو جانا پڑتا ہے ۔ رفیوجی ٹیکس نہیں دیتے ہیں۔ طویل مدتی بنیادوں پر ہمارے تجارتی ڈھانچہ میں اضافہ کیے بغیر وہ قلیل مدتی بنیادوں پر اپنا منافع کماتے ہیں۔ موجودہ اور مستقبل کے ماحولیاتی سسٹم پر ناکارہ اثر پڑا ہے ۔ اگر وہ سختی سے قانون کی پابندی بھی کریں تب بھی بہت سے علاقوں میں ان کی تعداد اصل باشندوں سے زیادہ ہونے کی وجہ سے تناؤ پیدا ہوتا ہے ۔ ایران کے انقلاب سے ہیروئن بنانے والے بھاگ کر پاکستان آئے، افغانستان کے بحران سے افغانستان اور پاکستان میں افیم کی پیداوار میں بہت اضافہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پاکستان اس وقت ہیروئن پیدا کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا مرکز ہے ۔ افغان رفیوجیوں پر سالانہ ۸ بلین روپے کا خرچہ آتا ہے جو امریکہ کے ۶۰۰ ملین ڈالر کی رقم کے برابر ہے۔ اس کے برعکس امریکہ، سعودی عرب اور خلیجی ملکوں سے جو سالانہ امداد حاصل ہوتی ہے وہ امریکہ کے ۴۳۰ ملین ڈالر کے برابر ہے۔"

اس سابق سفارت کار کا مزید کہنا ہے کہ " افغانوں کا ہم پر کیا قرضہ ہے : پچھلے تین ہزار برسوں کے دوران انھوں نے یا تو حملہ آوروں کو ہمارے علاقوں میں داخل ہونے کی اجازت دی یا ان کے ساتھ شامل ہو کر آ گئے اور برصغیر میں آباد ہو گئے ۔" ان حالات کے پیش نظر اور امریکی اور روسی مفادات کے ٹکرا جانے کے پیش نظر اس سابق سفارت کار نے سجھاؤ دیا ہے کہ پاکستان " مستقل غیر جانبداری کا رویہ اپنائے، فوجی اتحادوں میں شامل ہونے سے انکار کر دے، ملک میں بیرونی ملکوں کے اڈے بنانے کی اجازت نہ دے، اور دوسرے ملکوں کی لڑائیوں میں ملوث نہ ہونے کے موقف کا پابند رہے ۔" ان کا مزید کہنا ہے کہ پاکستان کو فن لینڈ کے بدلے آسٹریا کا راستہ اپنانا چاہیئے ورنہ اندیشہ صرف یہ نہیں کہ پاکستان کے ٹکڑے ہو جائیں گے بلکہ اس کا وہی حشر ہو گا جو پولینڈ کا ہوا تھا۔ اس کے حصّے کر دیئے جائیں گے، اس پر قبضہ کیا جائے گا اور صدیوں تک اس کی قومی شناخت ختم ہو جائے گی۔

اسی طرح افغانستان کی صورت حال کو بدلنے کے لیے بھی فن لینڈ کی مثال دی جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ "فن لینڈ طریقہ" کا انتظام کسی سیاسی حل کی بنیاد بن سکتا ہے جس میں روس کی طرف سے مرحلہ وار طریقہ پر اپنی فوج واپس نکالے جانے کی بات شامل ہوگی۔

افغانستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات میں مسلسل تناؤ سے پاکستان کو خطروں کا اندیشہ ہے۔ اس سلسلے میں اس نے یہ قیاس آرائی بھی کی ہے کہ کس طرح کے خطرے اسے درپیش ہیں۔ قیاس آرائی کے اس عمل میں امریکہ کے پالیسی سازوں نے کئی امکانات کی ترتیب و تفصیل تیار کی۔ ۱۹۸۰ء میں ایسی دو دلچسپ رپورٹیں تیار کی گئیں۔ ایک میں فرانسس فوکویامہ نے، جو اب ریگن انتظامیہ کے پالیسی پلاننگ اسٹاف کے رکن ہیں، چار قسم کی فوجی کارروائیوں کے منظر نامے تیار کیئے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان منظر ناموں کی تفصیلات ان کو، پاکستان کے جوائنٹ اسٹاف ہیڈ کوارٹر کی طرف سے، اس وقت مہیا کی گئیں جب وہ پاکستان کی سلامتی سے متعلق حالات کا موقع پر جائزہ لینے کے لیے پاکستان آئے تھے۔ یہ منظر نامے ہیں:

۱۔ روس پاکستان کے اندر اور پاک۔افغان سرحد پر افغان رفیوجی کیمپوں پر حملہ کرے گا۔ اس سے گوریلا پست ہمت ہو جائیں گے اور سرحد کے اس طرف ان کی سرگرمیاں ختم ہو جائیں گی۔

۲۔ روس سرحد کے نزدیک پاکستان کے علاقہ پر قبضہ کرے گا اور اس علاقہ کو اپنے قبضہ میں رکھے گا۔ اس سے پاکستان مشتعل ہو جائے گا۔ "روس کا مقصد ہے کہ پاکستان کو پست ہمت کرے ... اور اس کو سبق سکھائے ... روس کچھ پہاڑی دروں پر قبضہ کرنے کے لیے بھی ایسا ہی کرے گا۔"

۳۔ روس کے بدلے ہندوستان، پاکستان پر حملہ کرے گا۔ مقصد یہ کہ پاکستان کی فوج کو تباہ کیا جائے۔ اور اس کے علاقہ پر قبضہ کیا جائے۔ سیاسی مقصد یہ ہوگا کہ جنوبی ایشیا میں ہندوستان کی قیادت کی تصدیق ہو جائے اور اس خطہ میں بڑی طاقت مانا جائے۔

۴۔ ہندوستان اور روس دونوں باہمی تال میل سے پاکستان پر حملہ کریں گے۔ ہندوستان مشرق سے اور روس مغرب سے۔ مقصد یہ ہوگا کہ پاکستان کے حصّے کیے جائیں۔ روس کا مقصد یہ ہوگا کہ سمندر تک اس کی رسائی ہو اور افغانستان کی جنوبی سرحد پر اس کا قبضہ۔ ہندوستان کا مقصد یہ ہوگا کہ تقسیم کو یکسر مٹایا جائے۔

پاکستان کے اعلیٰ فوجی افسروں کی طرف سے یہ بھیانک منظر نامے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس کو امریکہ سے امداد حاصل ہو۔ کارٹر کی "مونگ پھلی" امداد نہیں (۴۰ ملین ڈالر) بلکہ تین عشاریہ دو بلین ڈالر

کی امداد اور ایف ۔ ۱۶ جنگی بمبار جہاز، وہ اس میں کامیاب رہا۔ لیکن وہ امریکہ کے ساتھ ۱۹۵۹ء کے باہمی ایگزیکٹو سمجھوتہ کو ایسے سمجھوتہ میں تبدیل کرنے میں ناکام رہا جیسا کہ امریکہ اور اسرائیل کے درمیان موجود ہے۔

دوسری رپورٹ اسٹیفن کوہین نے تیار کی۔ یہ مقابلتاً مفصل ہے اور اس کی بنیاد پاکستان کے ماہروں اور فوجی لیڈروں کے ساتھ بات چیت پر ہے۔ کوہین روس اور ہندوستان کے حملوں کو خارج از امکان قرار دیتے ہیں۔ وہ اس بات کو بھی رد کرتے ہیں کہ ہندوستان کو پاکستان کا وجود مٹانے کی نیت ہے۔ وہ جو چار منظرنامے پیش کرتے ہیں، وہ یہ ہیں :

۱۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے پر روس کی یلغار : پاکستان اس کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کر پائیگا مگر روس کو ایسا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس علاقہ میں کوئی تیل نہیں، گیس نہیں اور فوجی اعتبار سے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس پر قبضہ کرنے سے وہ خلیج سے دور ہو جائے گا جس پر اس کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔

۲۔ بلوچستان کی طرف سے روس کی یلغار : فوجی حکمت عملی کے اعتبار سے یہ علاقہ اہم ہے مگر اس سے عالمی جنگ کا خطرہ ہے کیونکہ اس کو امریکہ سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اس یلغار میں بھی پاکستان کچھ کر نہیں پائے گا۔ البتہ وہ کچھ دیر کے لیے اس کو ٹالنے میں کامیاب ہو گا۔

۳۔ پاکستان کے اندر افغان پناہ گزینوں پر روسی حملہ : اس کو ممکن مان لیا گیا ہے۔

۴۔ بلوچ اور دوسرے ناراض قبیلوں کو روسی امداد و حمایت : کوہین اس کو ممکن تصور کرتا ہے مگر زیادہ اغلب نہیں۔ فوکویامہ کا کہنا ہے کہ پاکستان کے فوجی افسروں نے اس امکان کو رد کر دیا مگر کوہین کا خیال ہے کہ پاکستان کو براہ راست فوجی کارروائیوں کے بدلے اسی خطرہ کا سامنا ہے۔

یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ ترجیحات کو مسخ کر کے جنوبی ایشیا کے ملکوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ ترقی سے نہیں بلکہ دفاع سے سلامتی کے لیے ایک مستحکم بنیاد فراہم ہوتی ہے۔ فوجی اتحادوں سے نظر کمزور ہو کر رہ گئی ہے اور مفادات کا ادراک کرنے کی طاقت بگڑ کر رہ گئی ہے۔ بہرحال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات معمول پر لانے اور باہمی فائدہ اور بقائے باہم کے لیے جنوب ایشیائی ملکوں کے علاقائی تعاون ایس۔اے۔آر۔سی کے ذریعہ اشتراک و تعاون کی کوششیں جاری ہیں۔ ارادے نیک ہیں مگر اس کے لیے موثر سیاسی ارادہ اور بصیرت کی ضرورت ہے۔

علاقائی سلامتی اور بحر ہند

بحر ہند کے خطہ کی سلامتی، آزادی اور امن کے مسئلہ کا ہماری عالمی سیاست کے ساتھ ایک نازک اور

گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک ایسا خطّہ ہے جو تین ترقی پذیر براعظموں، افریقہ، ایشیا اور آسٹریلیا اور مختلف جزیروں پر رہنے والی برادریوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملاتا ہے۔ اسی کی دہائی میں بحرِ ہند کو علاقائی اور عالمی تحفظ کے ماحول کے لیے ایک نمایاں اہمیت حاصل ہوئی۔

بحرِ ہند ۷۵ ملین کلومیٹر پانی پر پھیلا ہوا ہے جو دنیا کے بحری رقبہ کے ۲۰٫۵ فی صد اور زمین کی سطح کے ۱۵ فی صد حصہ کے برابر ہے۔ اس کے ساحلوں پر اور ساحلوں کے عقب میں اڑتالیس سے پچاس تک ملک آباد ہیں۔ یعنی اقوامِ متحدہ کے ممبروں کی کل تعداد کا تیسرا حصہ۔ ان ملکوں میں مشرقی افریقہ کے پندرہ، بارہ عرب ملک، جنوبی ایشیا کے سات، جنوب مشرقی ایشیا کے دس، جنوب مغربی ایشیا کا ایک اور آسٹریلیا میں دو ملک شامل ہیں۔ ان ملکوں کی آبادی دنیا کی کل آبادی کے تیسرے حصّہ کے برابر ہے، یعنی ایک ارب اور ساٹھ کروڑ۔ ان کے کلچر مختلف ہیں، نسلیں الگ الگ ہیں، زبانیں مختلف ہیں، سماجی و اقتصادی حالات مختلف اور سیاسی نظام مختلف ہیں۔ ان میں سے اکثر ملکوں نے پچھلے چالیس برسوں کے دوران سیاسی آزادی حاصل کی۔

بحرِ ہند کے ساحلی علاقے اور عقبی ملک زمانہ قدیم اور قرونِ وسطیٰ کی تہذیبوں کا گہوارہ رہ چکے ہیں۔ یہاں فن، ہنرمندی، کاریگری، مختلف عقائد اور مختلف مذاہب اور طریقۂ رہن سہن کی نشوونما ہوئی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران ان ملکوں نے یوروپ کی بڑی بڑی نوآبادیاتی سلطنتوں کو دیکھا اور ان کے سیاسی اور اقتصادی غلبہ کی مختلف صورتیں۔ لیکن یہی وہ خطّہ ہے جہاں سے نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے لیے قومی تحریکیں شروع ہوگئیں۔

یہ خطّہ معدنی دولت سے مالامال ہے۔ یہاں معدنی تیل کے ۶۵ فی صد وسائل ہیں جن کو مغربی ملکوں نے تلاش کیا، ۸۷ فی صد قدرتی ربڑ، ۷۰ فی صد ٹین، ۲۸ فی صد مینگنیز، ۳۲ فی صد کرومیم، ۲۵ فی صد معدنی لوہا، ۱۲½ فی صد معدنی سیسہ، ۱۱٫۵ فی صد نکل، ۶۷ فی صد جست، ۳۴ فی صد بکسائٹ اور ۳۱ فی صد ہیروں کے علاوہ دنیا میں سب سے بڑے تھوریم اور تتانیم کے ذخیرے ہیں۔ اس کے علاوہ خام مال کے ٹرانسپورٹ کے لیے بحرِ ہند سمندری جہازوں کی ایک اہم گذرگاہ ہے۔ صرف امریکہ دنیا کے اس حصّہ سے چالیس مختلف قسم کے خام مال درآمد کرتا ہے۔ مغربی یوروپی ملک اپنا خریدا ہوا ۶۰ فی صد خام تیل، جاپان ۹۰ فی صد، آسٹریلیا ۶۰ فی صد اور امریکہ ۲۰ فی صد آبنائے ہرمز کے راستے سے لے جاتے ہیں۔

بحرِ ہند کے خطّہ میں ہندوستان سب سے بڑا ملک ہے جس کے ساحل پانچ ہزار کلومیٹر پر پھیلے ہوئے ہیں یعنی تقریباً ہماری بری سرحدوں کے برابر۔ بحیرۂ عرب میں ان ساحلوں کا مغربی حصّہ، جنوبی، جنوب مغربی

اور مغربی ایشیا کے دفاعی ماحول کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ ساحلوں کا مشرقی پہلو، جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کے قریب پڑتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فوجی حکمت عملی میں جغرافیائی لحاظ سے کسی ملک کو امن یا جنگ کے زمانہ میں بحر ہند کے پورے خطہ میں کسی فوجی اور دفاعی نوعیت کے منصوبہ کے نتیجہ میں اہمیت حاصل کرنے کی پوزیشن حاصل نہیں جتنی ہندوستان کو۔

بحر ہند کے پس منظر میں تحفظ کے ماحول کے سلسلے میں کچھ اہم حقائق کو زیر غور لانا مناسب ہے۔ ایک وہ جسے امریکہ "حکمت عملی کا اتحاد عمل" کہتا ہے۔ اور جس کے تحت مغربی ایشیا سے جنوب مغرب تک اور جنوب سے جنوب مشرقی ایشیا تک کے ممالک آتے ہیں۔ اس کے علاوہ راپڈ ڈیپلائمینٹ فورس قائم کیا گیا ہے اور اس کو امریکی سینٹرل کمانڈ کے تحت لایا گیا ہے جس کے دائرہ میں انیس ممالک آتے ہیں۔ بحر ہند، خلیج اور بحر احمر میں امریکی ٹھکانوں اور بحری سہولیات کا جال بچھا ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ میں سمس ٹاون، بحری اڈہ اور وال فش بے اڈہ۔ مصر میں راس باناس بحری اور ہوائی اڈہ اور قاہرہ ویسٹ ایر فیلڈ، سومالیہ میں بیر بیرا، اور ماگا ڈشو، کینیا میں مومباسا بحری اڈہ اور نیروبی اور نانو بیکی ہوائی اڈے، عمان میں مسی راہ، ٹول، مسکت، تمایت، سلالہ اور قوس، سعودی عرب میں راس تنورا میں بحرین، تھائی لینڈ میں اوٹاپا اور ٹکلی کے اڈے، شری لنکا میں ترکومالی، سنگاپور میں تنگھس، بحرین، آسٹریلیا میں پرتھ، نارتھ ویسٹ کیپ اور گوام اور بحر ہند میں ڈیگو گارشیہ۔ اطلاع کے مطابق روس کو عدن میں پے رین اور باہ لک اور سکوترا کے جزیرے میں سہولیات میسر ہیں۔ مگر ان کا کوئی اڈہ موجود نہیں ہے۔

اڈوں کے اس سلسلہ میں ڈیگو گارشیہ کو فوقیت حاصل ہے۔ پچاس کی دہائی تک یہ ایندھن بھرنے کی سہولیات کے لیے استعمال ہوتا تھا، ساٹھ کی دہائی میں یہ مواصلات کا مرکز بن گیا، ستر کی دہائی کے آغاز میں یہاں گودی کی سہولیات کا انتظام کیا گیا اور ستر کی دہائی کے آخر پر یہ ایک بڑا بحری اڈہ بن گیا جس میں نیوکلیائی کاروائیوں کا انتظام تھا۔

ڈیگو گارشیہ کی جغرافیائی پوزیشن فوجی نوعیت کی حکمت عملی کے اعتبار سے اہم ہے۔ بحیرۂ روم میں مالٹا کی طرح یہ بھی اس خطہ کی اہم جگہوں سے برابر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ مغربی آسٹریلیا میں نارتھ ویسٹ کیپ کے امریکی مواصلاتی مرکز اور ایتھوپیا کے بحر احمر کے ساحل میں اسمارا اڈے کے وسط راہ میں ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈیگو گارشیہ آج فوجی اڈوں کے جال کے بالکل بیچ میں ہے۔ جنگ وجدال کی ترقی یافتہ آئی سی بی ایم اور ایس ایل ایم بی ٹیکنالوجی کی صورت حال میں اور پولارس اور پوزی ڈان نیوکلیائی آبدوز کشتیوں کی موجودگی میں ڈیگو گارشیہ مربوط جارحانہ حکمت عملی کا ایک حصہ

ہے جس کو صرف روس کے خلاف ہی استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ جس کو اس پورے خطہ میں کہیں استحکام، خود مختاری اور قدرتی وسائل کے اور کہیں آزادی کی تحریکوں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس کو امریکہ کی فوجی نوعیت کی عالمی اور علاقائی حکمت عملی میں ایک بنیادی مرکز کے طور پر فوجی لحاظ سے ترقی دی جا رہی ہے۔ جہاں تک روس کا تعلق ہے تو اس کی ۷۰ فی صد فوج بری علاقوں میں تعینات ہے۔ جبکہ امریکہ کی ۷۰ فی صد فوج بحری علاقوں میں تعینات ہے۔ اس سے دونوں کے فوجی منصوبوں میں فرق آجاتا ہے۔ ایس ڈی آئی کے تیار ہونے پر، حال ہی میں ڈیگو گارشیہ کا ذکر اُن پانچ جگہوں کے سلسلے میں کیا گیا جہاں امریکہ کا جی۔ای۔او۔ڈی۔ایس۔ایس نظام نصب کرنا ہے۔ یہ نظام راڈار کی طرح خلا کا معائنہ کرتا ہے اور یہ کمانڈ، کنٹرول اور کمیونکیشن یعنی سی تھری کو سائبیریا میں نصب روسی آئی سی بی ایم کی کھوج لگانے میں مدد کر سکتا ہے۔ اس وقت بھی امریکی محکمۂ دفاع کا ۷۰ فی صد مواصلاتی کام مصنوعی سیاروں کے ذریعہ انجام دیا جا رہا ہے۔ ان باتوں اور ایس ڈی آئی کی دوسری صلاحیتوں اور ایکس رے لیزر نظام کے نتیجہ میں ہتھیاروں کی ایک نئی دوڑ شروع ہوگی جس میں تعداد کے بدلہ معیار پر زور ہوگا۔" اسی کی دہائی کا ڈیگو گارشیہ اکیسویں صدی کی ہتھیاروں کی دوڑ کی نشاندہی کرتا ہے۔"

بحر ہند کو امن کا علاقہ بنائے رکھنے کا خیال پہلے ساٹھ کی دہائی کی ابتدا میں سامنے آیا۔ قاہرہ میں ۱۹۶۴ء کی غیر جانبدار چوٹی کانفرنس میں شریک لیڈروں نے سامراجی طاقتوں کے فوجی ٹھکانے قائم کرنے کے واضح ارادوں کی مذمت کی اور اس کارروائی کو جدید نوآبادیت اور سامراجیت کا ناجائز پھیلاؤ قرار دیا۔ بحر ہند کو امن کا علاقہ قرار دیئے جانے سے تعلق پہلی قرارداد ۱۹۷۰ء میں لوساکا کی غیر جانبدار چوٹی کانفرنس میں منظور کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں سری لنکا نے پہل کی اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں بحر ہند کو امن کا علاقہ قرار دیے جانے سے متعلق قرارداد پیش کی۔ ہندوستان اور دوسرے ساحلی ملکوں نے سری لنکا کی پوری حمایت کی۔ قرارداد میں بڑی طاقتوں سے اپیل کی گئی کہ" وہ تقریباً ۳۰ ساحلی ملکوں کے ساتھ فوری طور پر صلاح مشورہ شروع کرے ..... تاکہ بحر ہند میں فوجی موجودگی کی توسیع اور زنجیری روک دی جائے .... تمام فوجی تنصیبات اور ٹھکانے ختم کیے جائیں .... نیوکلیائی ہتھیار اور عام تباہی کے ہتھیار ہٹائے جائیں ... اور اعلیٰ طاقتوں کی موجودگی ختم کی جائے ..." اس قرارداد کا، ہر سال اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں، پہلے سے زیادہ ووٹوں کی حمایت سے، اعادہ کیا گیا اور اس نظریہ کو فروغ دینے کے لیے عملی اقدامات تجویز کرنے کے پندرہ ملکوں کی ایک ایڈہاک کمیٹی قائم کی گئی۔

"پچھلے چھ سال سے بحر ہند کے ساحلی اور عقبی ملک اقوام متحدہ کے اندر یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ بحر ہند سے متعلق ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جائے۔ لیکن امریکہ اور اس کے اتحادیوں

کی طرف سے مسلسل مخالفت کی وجہ سے بحر ہند کو امن کا علاقہ قرار دیئے جانے سے متعلق اقوام متحدہ کی اڈہاک کمیٹی کی کوششیں رائیگاں ہوگئی ہیں۔ اور اس سے متعلق بین الاقوامی کانفرنس منعقد کرنے کے امکانات نظر نہیں آتے۔ پروگرام کے مطابق اس کانفرنس کو ۱۹۸۱ء میں منعقد ہونا تھا مگر ایسا لگ رہا ہے کہ شاید ۱۹۸۶ء میں بھی یہ کانفرنس نہیں ہوگی۔ حالانکہ یہی وہ وقت ہے جبکہ ٹھوس مصالحت کی ضرورت بہت زیادہ ہوگئی ہے۔

بحر ہند کو امن کا علاقہ قرار دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ (۱) بحر ہند میں ڈیگو گارشیہ جیسے فوجی اور بحری اڈے ہٹا دیئے جائیں (۲) وہ کارروائیاں بند کی جائیں جن کا مقصد بحر ہند کو عالمی ٹکراؤ، علاقائی فوجی اتحادوں اور جدید نوآبادیت کے ارادوں کے لیے استعمال کرنا ہو (۳) آزادی کی تحریکوں کو دبانے کی اور نوآزاد ملکوں کو ڈرانے دھمکانے کی کوششیں بند کی جائیں (۴) ساحلی ملکوں کی خود مختاری، استحکام اور سلامتی کی تصدیق (۵) طاقت کی دھمکی کی سیاست کاری اور قانونی طور پر قائم کی گئی حکومتوں کو غیر متحکم کرنے کی کوششیں ترک کی جائیں (۶) قدرتی اور دوسرے وسائل پر ان ملکوں کے جائز حقوق کا اعادہ۔

انہی مثبت اقدامات سے بحر ہند فوجی اڈوں، آبدوز کشتیوں اور جنگی جہازوں کے زون کے بدلے حقیقی طور پر امن کا علاقہ بن جائے گا جس میں مختلف ممالک امن کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کر سکیں گے۔ تمام ممالک کے جہازوں کی پُر امن نقل و حرکت یقینی بن جائے گی، اور سائنسی تحقیق، تمدنی تبادلوں اور تکنیکی جانکاری اور ٹیکنالوجی کو مشترکہ طور پر استعمال کرنے کے لیے باہمی سمجھوتوں اور مختلف ملکوں کے درمیان سمجھوتوں کو فروغ حاصل ہوگا۔ اور اسی سے اس خطّے کے غریب عوام کو فائدہ ہوگا۔

۳۔ برصغیر کے اوپر منڈلاتا نیوکلیائی سایہ

آر۔ راما راؤ

برطانیہ کی واپسی کی حکمت عملی

برصغیر ہند کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کو امریکی فوجی حکمت عملی میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ برطانیہ کے سویز نہر کا علاقہ خالی کرنے کے باعث امریکہ کو بحر ہند کے نزدیکی اور خلیجی علاقوں میں زیادہ اور فوری دلچسپی پیدا ہوگئی۔ لیکن اس کے باوجود بحر ہند اور ہندوستان، امریکہ کی دلچسپی کے علاقے ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ اس سے ہندوستان اور ان دوسرے ملکوں کو تشویش پیدا ہوگی جو بحر ہند اور ساحلی ملکوں کو اعلیٰ طاقتوں کی رسہ کشی اور اس تناؤ سے دور رکھنا چاہتے ہیں جو لازمی طور سے اعلیٰ طاقتوں کی رسہ کشی سے پیدا ہوگا۔ یہ بات خالی از معنی نہیں کہ جب برطانیہ نے بحر ہند کا علاقہ خالی کیا، جس پر دو صدیوں سے زیادہ عرصہ کے لیے اس کا غلبہ رہا، تو اس نے جانے سے پہلے چیگوس جزائر، جس کا جزیرہ ڈیگو گارشیہ ایک حصہ ہے، کو ماریشس سے علیحدہ کیا اور اسے بی آئی او ٹی یعنی برٹش انڈین اوشن ٹیرٹری یعنی برطانیہ کا بحر ہند کا علاقہ بنا دیا۔ ان جزائر کے چھن جانے کے بعد ہی ماریشس کو آزادی حاصل ہوگئی۔ ڈیگو گارشیہ کے جزیرے سے وہاں کے باشندوں کو نکال دیا گیا اور ماریشس کو، ان باشندوں کی از سر نو بحالی کے لیے، برائے نام رقم، معاوضہ کے طور پر دی گئی تاکہ ان کے جزیرہ کو امریکی فوجی ٹھکانے کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

ابتدا میں برطانیہ نے یہ اعلان کیا تھا، اور اس پر عام طور پر یقین بھی کیا گیا تھا کہ ڈیگو گارشیہ کا جزیرہ، امریکہ کو، وہاں اپنا مواصلاتی سہولیات کا مرکز قائم کرنے کے لیے دیا جا رہا ہے تاکہ وہ اپنی آبدوز کشتیوں، بحریہ کے یونٹوں اور مصنوعی سیاروں کے ساتھ محفوظ ٹیلی مواصلاتی رابطہ قائم رکھ سکے۔ اس خیال کی بنیاد یہ تھی کہ ساٹھ کی دہائی کے آغاز اور وسط میں امریکہ نے اپنی وہ محفوظ ٹیلی کمیونکیشن ٹیکنالوجی پوری طرح مکمل نہیں کی تھی جس کے ذریعے وہ آبدوز کشتیوں کے، پانی کے نیچے جانے پر یا دور سمندروں میں ڈیوٹی یا کسی اور کام کے لیے جانے پر ان کے ساتھ رابطہ قائم رکھ سکتا۔ اس سے بھی اہم وجہ یہ تھی، جس کو ظاہر نہیں کیا گیا کہ امریکہ ان دنوں پوزیڈان میزائیلوں کا تجربہ کر رہا تھا جس کو وہ آبدوزوں میں پولارس میزائیلوں کے مبدل

کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ پوزیڈان میزائیلوں کی پہنچ بہت دور تک تھی اور ان میزائیلوں سے لیس آبدوز اگر بحرہند کے شمال میں تعینات کی جاتیں تو ان سے روس کے جنوبی علاقوں کی آبادی اور تنصیبات کو خطرہ لاحق ہوتا۔ روس کے یہ علاقے اور تنصیبات تب تک مقابلتاً حملوں کے خطرے کے دائرے سے باہر تھے۔ چونکہ بحرہند امریکہ کی اپنی ملکی بندرگاہوں سے کافی دور ہے۔ بلکہ یوروپ، بحیرۂ روم اور بحرالکاہل میں امریکی بحری اڈوں سے بھی کافی دور ہے، اس لیے اگر امریکہ کی میزائیلوں سے لیس آبدوزوں کو بحرہند میں کام کرنا تھا تو اس کے لیے امریکہ کو بحرہند میں ایک محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ ڈیگو گارشیہ ایک ایسا جزیرہ ہے جو بحرہند کے ساحلی ملکوں سے دور ہے، یہاں آبادی کی کسی قسم کی دخل اندازی کا سوال نہیں، روس کی وہاں تک رسائی مشکل ہے کیونکہ روسی بحری یونٹوں کے بندرگاہوں سے روانہ کے وقت سے ہی ان پر نظر رکھی جاسکتی ہے۔ اس لیے یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں صرف امریکی آبدوزوں کا ٹھکانہ ہی نہیں بن سکتا بلکہ اسکی سمندری فوج آر۔ ڈی۔ ایف یعنی راپڈ ڈیپلائمنٹ فورس (وہ فوج جو فوری طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ آجاسکتی ہے) اور مصنوعی سیاروں پر نظر رکھنے والے یونٹوں کے ٹھکانے بھی یہاں پر قائم ہوسکتے تھے۔

امریکہ کے مقاصد

ڈیگو گارشیہ کی منتقلی کے وقت امریکہ کے فوجی ماہر، سفارت کار اور اسکالر اس بارے میں مختلف آراء کا اظہار کر رہے تھے کہ امریکہ بحرہند کے خطہ میں ٹھکانہ کیوں قائم کرنا چاہتا ہے۔ امریکی اسکالروں کے ایک طبقہ (خواہ وہ اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا، خواہ غیر ارادی طور پر غلط اطلاعات پہنچانے کے ایک ذریعہ کے طور پر کام کر رہا تھا) کا کہنا تھا کہ امریکہ بحرہند کے علاقہ میں اس لیے ایک ٹھکانہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ وہ اس خطہ میں روس کے بحری ٹھکانے بند کرانے کا معاملہ طے کرنے کے کام میں اسے استعمال کرسکے۔

مگر جب اس ڈیگو گارشیہ کے جزیرہ پر ہوائی اڈے اور اس کے ساحل کے ساتھ ساتھ آبدوز کشتیاں رکھنے کی جگہیں تعمیر کرنے کا کام شروع کیا تو امریکہ کے ارادے واضح ہونے لگے اور روس کے ساتھ معاملہ طے کرنے کی باتیں بند ہونے لگیں۔ ساٹھ کی دہائی کے وسط سے لے کر، اس وقت تک، جب تیل کے بحران کے بعد امریکہ نے غیر مبہم طریقہ پر ڈیگو گارشیہ میں اپنا ٹھکانہ مضبوط بنانے کا کام شروع کیا، وہ باتیں ظاہر ہوگئیں جن کی بنیاد پر امریکی انتظامیہ نے اس خطہ میں اپنی موجودگی دکھانے کا فیصلہ کیا۔

نکسن نے اپنے اس نظریئے میں کہا تھا، جس کا اعلان ستر کی دہائی کے آغاز میں کیا گیا تھا، جب امریکہ نے ویت نام سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا، کہ امریکہ تیسری دنیا کے ملکوں میں اپنے آپ کو فوجی لحاظ سے ملوث نہیں کرے گا، خاص طور پر ان ملکوں میں جو امریکہ کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل

نہیں ہیں۔ اس کے بدلے کچھ علاقائی سرداروں کو کافی فوجی طاقت حاصل کرنے میں مدد کی جائے گی تاکہ وہ اپنے اپنے خطوں میں غالب رہیں اور ان مفادات کا تحفظ کریں، جن کو امریکہ اپنے مفادات مانتا ہے۔ اس طرح سے خلیج میں شاہ ایران، بحیرۂ روم کے مشرق کے ایشیائی ساحلی علاقے میں اسرائیل اور برّاعظم افریقہ کے جنوبی حصوں میں جنوبی افریقہ امریکہ کے علاقائی ایجنٹ بن گئے۔ اس طرح سے بحرِ ہند کے جنوب مغربی ساحلی علاقہ پر اور تیل کی دولت سے مالامال خلیج پر، جہاں سے بحرِ ہند میں داخل ہو سکتے ہیں، اس کے ایجنٹوں کا کنٹرول تھا۔ اور دوسری طرف عدم تشدد پر یقین رکھنے والا ہندوستان، جو امن چاہتا تھا۔ ان حالات میں امریکہ کو بحرِ ہند میں موجودگی کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن اس سے اہم بات یہ تھی کہ امریکہ کے سیاسی لیڈر اور ان سے بھی زیادہ امریکی عوام اس بات کے خلاف تھے کہ امریکہ کسی ایسے ملک کے معاملوں میں عملی طور پر ملوث ہو جو اس کے ساحلوں سے دور ہوں۔

چنانچہ امریکی لیڈر اس بات پر بھی غور کرنے لگے کہ بحرِ ہند کے علاقہ کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ بنائے جانے اور اس میں بحری سرگرمیاں محدود کرنے سے تعلق سمجھوتے کیے جائیں۔ یہ بات خارجہ معاملوں سے تعلق کمیٹی کے چیرمین آف دی ہاؤس لی ہیملٹن نے ۴ر فروری ۱۹۷۴ء کو کمیٹی کی میٹنگ میں اس وقت کہی جب ان دنوں کے جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے چیرمین ایڈمرل مورر ڈیگو گارشیہ میں ہوائی پٹریاں، ڈاک یارڈ، اور باقی تعمیرات کی تجویزوں کا خاکہ پیش کر رہے تھے۔ ایڈمرل مورر نے پھر وہی پرانی بات کہی تھی کہ اگر امریکہ ڈیگو گارشیہ پر اپنا مکمل ٹھکانہ تعمیر کرے، تو امریکی سفارت کار روس کو پیش کش کر سکیں گے کہ وہ (روس) بحرِ ہند میں اپنے ٹھکانے ہٹا دے اور اپنی بحریہ کی سرگرمیاں محدود کرے اور اس کے بدلے امریکہ ڈیگو گارشیہ کا ٹھکانہ بند کر دے گا۔ مگر امریکی بحریہ کے چیف آف اسٹاف ایڈمرل زُم والٹ نے ۲۰ر مارچ ۱۹۷۴ء کو کانگریس کی ایک سب کمیٹی سے کہا کہ ڈیگو گارشیہ میں اڈہ بنانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ امریکی مسلح افواج کو اس خطہ میں واقعات و حالات پر امریکہ کے حق میں اثر ڈالنے کا ذریعہ فراہم ہو جائے۔ امریکہ کے دوسرے حکام کے بیانات سے ایڈمرل زُم والٹ کی ان باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ خارجہ دفتر کے سیاسی و فوجی معاملات سے تعلق بیورو کے ان دنوں کے ڈائریکٹر سیمور وائس نے ۶ر مارچ ۱۹۷۴ء کو مشرق قریب اور جنوبی ایشیا سے تعلق ہاؤس کمیٹی کے سامنے اور بحری اوپریشنز کے چیف کے دفتر میں سیاسی و فوجی ڈویژن کے ڈائریکٹر ریر ایڈمرل چارلس ڈی۔ گرو جین نے ۱۱ر جولائی ۱۹۷۴ء کو مسلح افواج سے تعلق ہاؤس کمیٹی کے سامنے، بیانات میں اس بات کی تصدیق کی کہ امریکہ کی بحری فوج کے سمندری جہازوں کے پاس میں ہونے سے امریکہ کے اس ارادے کا اظہار ہوتا ہے کہ اس کے مفادات کا تحفظ کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کو سفارتی سطح پر یہ بات واضح کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے کہ علاقائی سیاسی توازن میں

امریکی مفادات کا خیال رکھا جانا چاہیے۔

ترقی پذیر ملکوں کو دھمکیاں

سیدھی سادی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امریکی بحریہ کا ایک طاقتور بیڑا بحر ہند میں موجود ہے، اس کو امریکہ ساحلی ملکوں کو ڈرانے دھمکانے میں استعمال کر سکتا ہے۔ طاقت یا طاقت کے استعمال کی دھمکی ان ملکوں میں ایسی سیاسی تبدیلیاں لانے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے جو امریکہ کے اقتصادی اور فوجی مفادات کے ساتھ میل کھاتی ہوں۔

اس سے ہندوستان جیسے غیر جانبدار ملکوں میں بہت تشویش پیدا ہو گئی۔ یہ ملک فوجی اتحادوں کی سیاست سے دور غیر جانبدار رہنا چاہتے ہیں۔ غیر جانبدار ملک مگر عام طور پر اس صورت حال کے ایک پہلو کو سمجھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ کہ علاقے میں محض بیرونی طاقتوں کی موجودگی سے اس علاقہ کے ترقی پذیر ملکوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ان ترقی پذیر ملکوں کے درمیان باہمی مسئلے ہوں، حقیقی یا خیالی۔ اور علاقہ کا کوئی بھی ملک کسی بڑی طاقت سے، پاس میں موجود اس کی فوج کی مدد مانگ سکتا ہے، اور اپنے ہمسایہ ملک یا اپنے علاقائی حریف کے خلاف اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ یہ تو ہر کوئی جانتا ہے کہ برطانیہ نے کیسے ہندوستان میں غلبہ حاصل کر لیا۔ ایک ہندوستانی حکمراں کو دوسرے ہندوستانی حکمراں کے خلاف اکسانے اور لڑانے کے بعد آخر کار دونوں کو تباہ کر کے ہی اس نے یہ غلبہ حاصل کر لیا۔ یہی کچھ اب بڑے پیمانے پر بحر ہند اور خلیجی علاقہ میں ہو رہا ہے۔

امریکہ یہ بات یقینی بنانا چاہتا ہے کہ خلیجی علاقہ کا تیل اس کو اور اس کے اتحادیوں کو کسی رکاوٹ کے بغیر دستیاب رہے۔ اگر اس معاملے کو قطعی طور پر تجارتی نقطۂ نظر سے نمٹانے کی کوشش کی جائے، اس صورت میں اس معاملے کو پوری توجہ اور وقعت ملنی چاہیے۔ کیونکہ پھر خلیجی ملکوں، جو یہ تیل بیچتے ہیں، کے مفادات بھی اس وقت اسی طرح قابل توجہ اور وقعت ہوں گے جب ان کو امریکہ سے ٹیکنالوجی اور دوسری چیزوں کی ضرورت کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر امریکہ اپنی پیداوار بیچنے کے سلسلے میں پابندیاں اور بندشیں عائد کر سکتا ہے عرب ملک بھی تیل کے سلسلے میں ایسا کر سکتے ہیں۔ امریکہ تیل چاہتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ عرب ملک تیل ان کے سامنے رکھیں اور اپنی بیرونی اور اندرونی پالیسیوں کو امریکہ کے کہنے کے مطابق بناتے اور بگاڑتے رہیں۔

سعودی عرب کے شاہ فہد نے مغربی ملکوں کے لیے تیل کی برآمد پر پابندی لگائی کیونکہ امریکہ نے عرب ملکوں اور فلسطینیوں کے خلاف اسرائیل کی کارروائیوں کی حمایت کی۔ مگر مغربی ملکوں کو عرب ملکوں کا

تیل بند کرنے کی یہ کارروائی عرب ملکوں میں عدم اتحاد اور غیر عرب مسلم ممالک کی بے دلی سے برقرار نہیں رہ سکی۔ اس کے بعد مغربی ایشیا کے ممالک عراق اور ایران کی جنگ کی وجہ سے اور زیادہ نفاق کے شکار ہو گئے۔

شاہ کی تنزلی کے فوراً بعد ایران کی انقلابی حکومت نے، ایران کے وہ فنڈ جو امریکہ میں بند کیے گئے تھے، واپس حاصل کرنے کے لیے امریکی سفارت خانہ کے عملے کو یرغمالی بنا دیا۔ امریکی فوج کا ان یرغمالیوں کو رہا کرنے کی چھاپہ مار کارروائی ناکام ہوئی۔ اس کے بعد ایران کے خلاف امریکہ کی ناراضگی بڑھ گئی۔ اس لیے، اس خطے میں موجود، امریکی آر ڈی ایف یونٹ کا، مناسب موقعہ ملنے پر، شاید پہلا کام ایران میں مداخلت ہوگا۔

امریکہ کی فوجی حکمت عملی کو جو ایرانی انقلاب سے دھکا لگا وہ اس کی چارہ جوئی کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ مغربی ایشیا کے حالات کا مشاہدہ کرنے والے ایک جانکار میسر فریڈ ہیلی ڈے کا کہنا ہے:

" (ایران کے خلاف) عراق کو بھڑکانے میں مغربی ملکوں کا جو بھی رول رہا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اب اس میں اس طرح کے داؤں پیچ لگا رہے ہیں تا کہ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اور زیادہ سے زیادہ فائدہ تو یہ ہوگا کہ وہ ایران میں ایسے انقلاب کے لیے زمین ہموار کرنے کے قابل ہو جائیں جس سے شاہ مخالف انقلاب کا فیصلہ رد ہو جائے۔ کم سے کم فائدہ یہ ہوگا کہ خلیج کے دو بڑے ملک فوجی اعتبار سے کمزور ہو جائیں گے اور مغربی ملک پھر سے اس خطہ میں اپنا اثر و رسوخ قائم کریں۔"

امریکہ کے راپڈ ڈیپلائمنٹ فورسز کا رول

خلیج اور بحر ہند میں امریکی آر ڈی ایف (ایک جگہ سے دوسری جگہ تک فوری طور پر پہنچ جانے والی فوج) کو تعینات کرنے کے بعد، ان حالات میں، امریکہ کی طرف سے حق شفع کی امکانی ترکیبوں کو اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ روس کا ہوّا کھڑا کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے افغانستان میں روسی فوجیوں کی موجودگی، ایک بہت اچھا بہانہ ہے۔ مثال کے طور پر آر ڈی ایف کے ایک سابق کمانڈر جنرل والنے ایف وارنر نے کہا تھا کہ آر ڈی ایف یونٹوں کے قریب کے ٹھکانوں پر ہونے کی صورت میں امریکہ "فوج کو زمین پر اتار سکتا ہے اور وہاں (اس پھرتی سے) پہلے پہنچ سکتا ہے (یعنی گڑبڑ کی جگہ پر یا اس ملک میں جس پر امریکہ قبضہ کرنا چاہتا ہو، یا اپنے قبضہ کو قائم رکھنا چاہتا ہو) کہ ان کو ہٹانے کی ذمہ داری روس پر عائد ہو گی۔" ایک اور آر ڈی ایف کمانڈر جنرل پال ایکس کیلی نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کیلی کا کہنا ہے کہ آر ڈی ایف کی حکمت عملی، حق شفع ہے۔ یعنی " اپنی فوج لڑائی کے زون میں پہلے پہنچا دو" اس سے حریف کو یہ وارننگ ملے گی کہ اس کی طرف سے کوئی دشمنانہ کارروائی یا مزاحمت، امریکہ کے ساتھ مکمل جنگ کی موجب بنے گی۔ اس طرح دشمن کو مقابلہ سے دستبردار ہونے کا باعث موقع فراہم ہو گا۔"

وہ ساحلی ممالک جن کے پاس قدرتی وسائل ہوں اور امریکہ ان پر قبضہ کرنا چاہتا ہو، یا وہ ملک جو ناطرفداری کے راستے پر چلتے ہوں یا جن کے بارے میں شبہ ہو کہ وہ روس کے قریب ہیں، ان کے آر ڈی ایف کی توجہ کا مرکز بننے کا امکان رہے۔

پاکستان: خلیج اور برصغیر میں اس کا امکانی کردار

امریکہ اور چین کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں جنرل یحییٰ خاں کے رول کے باوجود ۱۹۷۱ء کے بعد امریکہ نے پاکستان کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ یحییٰ خاں کے بعد بھٹو آئے۔ اُن کے اقتدار میں آنے کے لیے اگرچہ امریکہ نے ہاں کر دی تھی مگر امریکہ کے پالیسی وضع کرنے والے، ان پر مکمل بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ خاص کر جب امریکہ کی انٹلی جنس (جاسوسی) ایجنسیوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اقتدار سنبھالنے کے بعد بھٹو نے سب سے پہلا اہم کام یہ کیا کہ پاکستان کے ایٹمی انرجی کمیشن کو نئے سرے سے منظم کیا اور اسکو یہ ہدایت دی کہ وہ بم بنانے کے لیے پوری رفتار کے ساتھ ٹیکنالوجی اور دوسرا ضروری ساز و سامان حاصل کرے۔ بھٹو نے اپنے اسلامی بم کے پراجیکٹ کے لیے سعودی عرب اور لیبیا سے مالی امداد حاصل کی۔ لیبیا نے ان کو نائجر سے دو سو ٹن یورینیم حاصل کرنے میں بھی مدد دی۔ فرانس نے انھیں خفیہ طور پر بیشتر ڈرائینگ مہیا کیے۔ مگر امریکہ کے دباؤ سے فرانس اپنے اس وعدے سے مُکر گیا کہ وہ پاکستان کو ایٹمی ایندھن صاف کرنے اور اسے اعلیٰ بنانے کا پلانٹ قائم کرنے میں مدد دیں گے۔ اس پلانٹ سے پاکستان اسیّ کی دہائی کے آغاز میں ایٹم بم بنانے کے کام آنے والا پلوٹونیم بنانے کے قابل ہو جاتا۔ کسنجر نے بھی پاکستان کو وارننگ دی تھی کہ بہتر یہ رہے گا کہ وہ نیوکلیائی ری پروسینگ پلانٹ قائم نہ کرے۔ ظاہرا طور پر بھٹو نے اس وارننگ کو نظر انداز کیا اور امریکی امداد کی پیش کش کو بھی، جو وارننگ کے ساتھ ساتھ کی گئی تھی۔ امریکہ کا کہنا نہ ماننے پر ان کو جلد ہی خمیازہ بھگتنا پڑا اور پاکستان پھر فوجی کنٹرول کے تحت میں آیا۔

مگر پاکستان کے نئے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ انتہائی سمجھدار اور ہوشیار حکمران ہیں۔ افغانستان میں روسی فوج کی موجودگی سے پاکستان، راتوں رات امریکہ کے لیے بہت اہم بن گیا اور پاکستان کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے امریکہ، بھاری پیمانے پر، اقتصادی اور فوجی امداد دینے کے لیے بیقرار ہو گیا۔ ضیا نے اس امریکی امداد کو فوج پر خرچ کیا۔ کیونکہ فوج پر ہی ان کے اقتدار کی بنیاد قائم ہے۔ سندھ اور بلوچستان میں پنجاب کی فوج اور سول بیوروکریسی (غیر فوجی افسر شاہی) کی غیر مقبولیت دیکھ کر ضیا نے اسلام کا استعمال کیا جس کو تمام صوبوں میں مشترکہ عنصر کی حیثیت

حاصل ہے ۔ انھوں نے مذہبی تنظیموں اور متوسط طبقے اور نچلے متوسط طبقے کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بھی اسلام کا استعمال کیا کیونکہ ان طبقوں کے لوگ انتہائی طور پر مذہبی ہیں ۔ مذہب کے تئیں ان کی پابندی سے ان کو مغربی ایشیا میں لاکھوں پاکستانیوں کے لیے روزگار حاصل کرنے میں مدد مل گئی ۔ انھوں نے مغربی ایشیا میں خدمات انجام دینے کے لیے باقاعدہ فوجی دستے بھی فراہم کیے ۔ رپورٹوں کے مطابق سعودی عرب میں پاکستانی فوجیوں کی تعداد بیس ہزار ہے اور دوسرے خلیجی ملکوں میں دس ہزار ہے ۔ بیرون ملک میں کام کرنے والے پاکستانیوں کی آمدنی سے پاکستان کو تجارتی توازن کا خسارہ کم کرنے میں مدد ملی ہے ۔ یہ حالات نظر میں رکھ کر ہم، تمام باتوں کے باوجود، یہ کہہ سکتے ہیں کہ جنرل ضیاء الحق اپنے ملک کو ایک انتہائی مشکل دور میں سے نکال کر آگے لے جانے میں کامیاب ہوئے ہیں ۔

پاکستان کے لیے ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان کے صدر ببرک کرمل کی حمایت کے لیے روس کو اپنی فوج افغانستان بھیجنی پڑی ۔ یہ وہ وقت تھا جب حفیظ الامین کے قتل کے بعد افغانستان ایک بحران میں سے گزر رہا تھا ۔ یہ واقعہ امریکہ کے لیے تشویشناک تھا ۔ ایران امریکہ کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور یرغمالیوں کے بحران کے بعد ایسا لگ رہا تھا کہ ایران امریکہ سے پوری طرح نفرت کرتا ہے اگرچہ آیت اللہ نے کمیونزم کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کو چھپا کے نہیں رکھا مگر امریکہ کو شک رہا کہ ایران شاید روس کے ساتھ کسی قسم کا سودا سمجھوتہ نہ کر لے ۔ بصورت دیگر یہ امکان کہ شاید روس، ایران میں داخل ہو جائے یا کم سے کم افغانستان کے اپنے اڈوں سے وہ ایران کے بلوچی ساحل پر قبضہ کر لے ۔ اس لیے امریکہ کے پالیسی بنانے والوں نے اس بات کو اہم سمجھا کہ بحر ہند کے علاقہ میں آر ڈی ایف کو مضبوط بنایا جائے تاکہ وہ ایران میں مداخلت کرنے یا اس خطے میں کسی اور جگہ بحران کی صورت میں یا بحران کو روکنے کے لیے، مداخلت کے قابل ہو ۔ یہ بھی خیال رہا کہ شاید ایران اور عراق کے غیر متوقع حالات و واقعات امریکہ کے لیے دونوں سے کسی ایک ملک میں مداخلت کا موقع فراہم کریں ۔ خلیج کے خطے میں یا بحر ہند کے ساحلی ملکوں میں مؤثر مداخلت کرنے کے لیے امریکہ کو قریبی اڈوں کے علاوہ ایک قابل بھروسہ اتحادی کی ضرورت تھی — ایک ایسا اتحادی جو وہ رول ادا کرے جو شاہ کے تحت ایران کے لیے مخصوص تھا ۔

ظاہر ہے کہ اس کے لیے پاکستان ایک موزوں ملک تھا ۔ اس کے پاس ایک بہت ہی اچھی فوج تھی جو تربیت یافتہ تھی اور جو اعلیٰ ہتھیاروں سے لیس تھی ۔ اور اس ملک کا حکمراں ایک فوجی ڈکٹیٹر تھا ۔ امریکی محکمۂ دفاع اور محکمۂ خارجہ کو جمہوری حکومتوں خاص کر تیسری دنیا کی جمہوری حکومتوں کے مقابلے میں ڈکٹیٹر حکمرانوں سے نمٹنے میں آسانی محسوس ہوتی ہے، خواہ وہ ڈکٹیٹر فوجی ہوں یا غیر فوجی ۔ اس کے علاوہ پاکستان کی

جغرافیائی پوزیشن بھی، امریکہ کی اس خطے کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت موزوں تھی۔ پاکستان کی سرزمین سے امریکہ، خلیجی ملکوں، بحر ہند کے ساحلی ملکوں اور بذات خود برصغیر میں بھی، اپنی طاقت کو آگے بڑھا سکتا تھا۔ چنانچہ پاکستان کو بھاری فوجی اور اقتصادی امداد کی پیش کش کی گئی، جس کی مالیت تین عشاریہ دو (۳۶۲) بلین ڈالر ہے۔ اور اس کو پھر سے امریکہ کا ایک قریبی اتحادی مان کر منظور کیا گیا۔ یہ اس کے باوجود کہ پاکستان نیوکلیائی ہتھیار تیار کرنے کے پروگرام پر عمل کر رہا تھا۔ پاکستان کے مصدقہ ذرائع کا کہنا ہے کہ پاکستان "اسمبلی لائن" بنیاد پر اعلیٰ قسم کا یورینیم تیار کرتا رہا ہے۔ کیونکہ اس نے جون ۱۹۸۴ء میں دو ہزار سے تین ہزار ایس ڈبلیو یو یعنی سیپریٹ ورک یونٹ کی صلاحیت کا سینٹری فیوگ پلانٹ قائم کیا تھا۔ جو سالانہ اعلیٰ قسم کا ۵۴ کلوگرام یورینیم پیدا کر سکتا ہے جو تین بم بنانے کے لیے کافی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے چھ ہزار سے آٹھ ہزار ایس ڈبلیو یو کی صلاحیت کا سامان خریدا تھا جس سے وہ کچھ وقت کے بعد چھ سے نو بم بنا سکے گا۔ ابھی حال ہی میں پاکستانی ایجنٹ کناڈا اور امریکہ میں کرسٹان خرید رہے تھے جو بم چلانے کے نظام میں کام آتا ہے۔ اس طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نیوکلیائی ہتھیاروں کو پھیلنے سے روکنے کے اصول کا پابند ہونے کے باوجود امریکہ نے خاموشی سے یہ بات منظور کی ہے کہ پاکستان ایک غیر نیوکلیائی ملک سے نیوکلیائی طاقت رکھنے والا ملک بن رہا ہے۔

پاکستان ایک نیوکلیائی طاقت

ان باتوں اور دوسری معقول اور سنجیدہ شہادتوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا نامناسب نہیں ہوگا کہ پاکستان کچھ مدت سے نیوکلیائی ہتھیار جمع کرتا رہا ہے۔ غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق چین نے اپنے اس بیس کلوٹن یورینیم بم کے ڈرائننگ اور ڈیزائن پاکستان کو مہیا کیے ہیں جس کا تجربہ اس نے ۱۹۶۴ء میں کیا تھا۔ خود پاکستان کے تجزیہ کرنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ پاکستان ہی وہ آلہ ہے جس کو چین، ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اس لیے چین سے بم کی تفصیلات حاصل کرنے میں پاکستان کو دقت نہیں ہوئی ہوگی خاص طور پر جبکہ چین کو یہ پوری طرح معلوم ہے کہ اگر اس نے بم ڈیزائن کے اعداد و شمار پاکستان کو مہیا نہیں کیے تو وہ خفیہ طور پر کسی اور ذریعہ سے یہ حاصل کر سکتا ہے یا اسے مقامی طور پر تیار کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان نے بھی تو دس سال پہلے نیوکلیائی بم کا تجربہ کیا تھا۔

فرانس اپنے نیوکلیائی پاور پلانٹ بیچنے کے لیے پاکستان کے ساتھ پھر سے نیوکلیائی تعاون شروع کر رہا ہے۔ ایسے ہر پلانٹ کی قیمت دو بلین ڈالر ہے۔ امکان ہے کہ فرانس پاکستان کو

ایندھن صاف کرنے کے بعد اسے قابل استعمال بنانے کا ایک بڑا پلانٹ قائم کرنے میں بھی مدد کرے گا جس کے ڈرائنگ اس نے پاکستان کو پہلے مہیا کیے تھے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان کے پاس اس وقت یورینیم بموں کا ایک خاصا ذخیرہ ہوگا۔ مستقبل قریب میں، اس کے پاس یقینی طور پر پلوٹونیم بم بھی ہوں گے۔ پلوٹونیم بم کیلئے صرف پانچ کلوگرام فیزل (شق ہوجانے والا) مواد درکار ہوگا جبکہ یورینیم بم کے لیے صاف کیے ہوئے نہایت اعلیٰ قسم کے پندرہ کلوگرام یورینیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہندوستان کے پالیسی ماہروں کو یہ باتیں مدنظر رکھ کر ہی اپنی پالیسی وضع کرنی ہوگی۔ پاکستان میں قائم نیوکلیائی سہولیات کی نوعیت اور صلاحیت کے بارے میں جو سنجیدہ اور قابل قدر شہادتیں خود سینیٹر کرانس ٹن اور دوسرے ذمہ دار لیڈروں نے جمع کی ہیں ان سے کرانس ٹن یہ اندازہ کرنے کے قابل ہو گئے ہیں کہ پاکستان کی بم بنانے کی رفتار کیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ آثار بھی نظر آرہے ہیں کہ پاکستان کے لیڈر ہندوپاک پس منظر میں ایٹمی نشانوں کے معاملوں کی بھی پڑتال کر رہے ہیں۔

پاکستان کے تجزیہ کار ماہروں کو یہ پوری طرح معلوم ہے کہ نیوکلیائی حملوں کے خلاف اس صورت میں عملی طریقہ دفاع ہے اگر حملہ کرنے والے کے پاس ابتدائی نوعیت کی نامکمل نیوکلیائی طاقت ہو۔ ابتدائی نوعیت کی نامکمل نیوکلیائی طاقت سے مراد، بموں کی محدود تعداد اور ناقص ڈلیوری سسٹم (بم لے جانے اور چھوڑنے کا نظام) اس صورت حال میں، وہ ملک جس پر حملہ کیا گیا ہو بموں کے حملوں کو ناقص و ناکارہ بنانے کے لیے روایتی پی جی ایم ہتھیاروں کا استعمال کرکے اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ لیکن اگر حملہ کرنے والے کے پاس بموں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہو، جیسا کہ اسرائیل کے پاس ہے اور جیسا کہ پاکستان قائم کر رہا ہے، تو وہ ایک غیر نیوکلیائی ملک پر، بلکہ اس ملک پر بھی، جس کے پاس اس کی ابتدائی نوعیت کی نامکمل طاقت ہو، ایٹمی حملہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ پاکستان کو جو امریکہ نے ایف ۔ ۱۶ لڑاکو بمبار جہاز مہیا کیے ہیں، ان کا دائرۂ عمل اتنا وسیع ہے اور ان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ نیوکلیائی میزائیل لے کر ہندوستان میں نیوکلیائی تنصیبات، سیاسی مرکزوں اور اہم صنعتی کمپلیکسوں پر حملہ کرنے کے بعد پاکستان میں اپنے اڈوں پر صحیح سلامت واپس آسکتے ہیں۔ ایف ۔ ۱۶ کے اندر ایک ایسا الیکٹرانکس نظام موجود ہے کہ اگر دشمن کا جہاز یا میزائیل اس کی طرف بڑھ رہا ہے تو اسے ایک دم اس کا پتہ چل سکتا ہے اور اس سے نمٹنے کے لیے جوابی اقدامات کے نظام کو متحرک کر سکتا ہے۔ پاکستان کے پاس مانٹرنگ، یعنی نگرانی کے سسٹم بھی ہیں جو ہندوستانی کے فضائی اور زمینی علاقوں پر نظر رکھ سکتے ہیں اور ہندوستانی فوج اور ہوائی جہازوں

کی تقسیم و ترتیب اور حرکات کا پتہ متعلقہ پاکستانی فوج کو دے سکتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی ساحلوں اور ہندوستانی بحریئے پر بھی نظر رکھی جاتی ہے۔ پاکستانی بحری فوج کو اتنا مضبوط بنایا گیا ہے کہ وہ ہندوستانی بحری یونٹوں اور ساحلی علاقوں کی تنصیبات پر پورے اعتماد کے ساتھ حملہ کر سکتے ہیں۔

موجودہ حالات میں پاکستان، ہندوستان کو ایک زبردست خطرہ پیش کر سکتا ہے۔ نیوکلیائی ہتھیاروں کے لحاظ سے بھی اور روائتی ہتھیاروں کے لحاظ سے بھی۔ اور اگر پاکستانی فوج کی تربیت و تقسیم کو مدنظر رکھا جائے، جس کا ۸۰ فیصد حصّہ ہندوستان کی سرحدوں کے قریب تعینات کیا گیا ہے، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان اپنے ارادوں کے سلسلے میں کسی رازداری سے بھی کام نہیں لے رہا ہے۔

پاکستان کی امکانی حکمت عملی

پاکستان کی حکمت عملی کا، اس کی مجموعی ہئیت میں جائزہ لیا جانا چاہئے۔ نیوکلیائی خطرے کو ہندوستان کے بالمقابل پاکستان کی حکمت عملی میں صرف ایک عنصر کی حیثیت حاصل ہے، مگر ایک اہم عنصر کی نیوکلیائی ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ جو روایتی ہتھیاروں کے لحاظ سے پاکستان تیزی کے ساتھ مضبوطی حاصل کر رہا ہے، اس سے وسیع پس منظر میں بھی پاکستان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، پاکستان ایٹمی خطرے کے خوف کو استعمال کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کا یہ اندازہ ہو کہ مجموعی صورتحال فیصلہ کن حد تک اس کے حق میں ہے۔ ایٹمی خطرے کی دھمکی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو ملک یہ دھمکی دے رہا ہے وہ اس ہتھیار کو اس صورت میں اس ملک کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار ہے جس کو دھمکی دی جا رہی ہو۔ (جیسے امریکہ نے ۱۹۴۵ء میں جاپان کے معاملہ میں کیا) اگر اس نے وہ مطالبے نہیں مان لیے جو دھمکی دینے والا ملک پیش کر رہا ہو۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نیوکلیائی اعتبار سے کسی طاقتور ملک کی طرف سے بھی کسی ایسے ملک کو نیوکلیائی دھمکی دینے کا امکان کم ہے، جس کے پاس زیادہ ایٹمی ہتھیار نہ ہوں۔ کیوں کہ اس میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کم طاقت والا ملک یہ سوچ کر کہ وہ ہر حال میں خطرے میں گھرا ہے، جوابی کارروائی کی دھمکی دے بلکہ طاقتور ملک پر ایک دو بم گرا بھی دے۔

جہاں تک ہندوستان اور پاکستان کا تعلق ہے تو پاکستان میں عوام کے بہت بڑے طبقے کو اس بات کا یقین ہے کہ ہندوستان کے پاس بم ہے۔ مگر پاکستان میں صاحب اختیار لوگ ہیں، ان کے بارے میں یہ سوچنا ٹھیک رہے گا کہ وہ ہندوستان کے حقیقی حالات سے واقف ہوں گے، وہ حالات جن سے نہ تو پاکستانی عوام اور نہ ہی ہندوستانی عوام واقف ہیں۔

کیونکہ ظاہراً طور پر بیرونی ایجنسیاں ہندوستان کے سرکاری دفاتر سے کوئی بھی دستاویز حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان کی نیوکلیائی صلاحیت کے بارے میں ایک جانکار پاکستانی ماہر نے جو تجزیہ کیا، وہ یوں ہے :۔

۱۔ ہندوستان کی نیوکلیائی صلاحیت کو بین الاقوامی معائنہ کے دائرہ میں لایا جا رہا ہے، حالانکہ ہندوستان کی نیوکلیائی سہولیات میں مقامی حصہ بڑھتا جا رہا ہے اور ہندوستان کو کوئی بھی نیوکلیائی چیز، جس کی اسے ضرورت ہو، خود ڈیزائن یا تیار کرنے کی قابلیت حاصل ہے۔

۲۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے نیوکلیائی شعبہ کی بیوروکریسی تحفظات قبول کرنے میں زیادہ اطاعت شعار بن گئی ہے شاید اس لیے کہ وہ واقف ہیں کہ نیوکلیائی سہولیات کو سنبھالے رکھنے، کل پرزوں، اور نیوکلیائی سازوسامان کی سپلائی کے سلسلے میں مشکل وقت آرہا ہے۔"

پاکستان اور دوسرے مبصروں نے زود فہمی سے اس کے لازمی نتیجوں کو ذہن نشین کیا لیکن ہندوستانی عوام کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ تارا پور کے لیے ایندھن کی سپلائی کے واقعہ کے بعد ہندوستان نے ایک دم بیرونی دباؤ کے آگے سر تسلیم خم کیا اور اس سے پاکستان نے یہ نتیجہ اخذ کیا اور شاید صحیح طور پر کہ ہندوستان نے ۱۹۷۴ء کے بعد نیوکلیائی خود کفالت حاصل کرنے میں بہت کم پیشقدمی کی ہے یا کی ہی نہیں ہے۔ چنانچہ پاکستان کے ماہرین یہ سمجھ گئے کہ امریکہ نے (اسی لیے) پاکستان کو نیوکلیائی تحفظ کی پیش کش کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ چین کو ہندوستان کی نیوکلیائی پیش قدمی سے کوئی پریشانی نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان نے ایٹمی ہتھیار ذخیرہ کرنے کے سلسلے میں کوئی خاص پیش قدمی نہیں کی ہے۔

خیر ہندوستان تو پچھڑ گیا مگر پاکستان نے نیوکلیائی شعبہ میں حیرت انگیز پیش قدمی کی۔ اس میں ایک تو اس کے فوجی اور صنعتی قائدین کا دخل تھا اور اس کے علاوہ حالات نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ نیوکلیائی پروگرام کے لیے بنیاد بھٹو نے ڈالی تھی اور انھوں نے ہی اس کا بنیادی ڈھانچہ تیار کرا دیا تھا مگر جنرل ضیاء نے بھٹو کو اپنے راستے سے ہٹانے کے بعد اپنی ذہین اور ہوشیار رہنمائی کے تحت اس پروگرام کو جاری رکھا اور پاکستان کو ایک نیوکلیائی طاقت بنا دیا۔ جنرل ضیاء نے یہ خود ہی کہا کہ پاکستان یورینیم کو پانچ فیصد کنسنٹریشن تک اعلیٰ درجہ کا بنا سکتا ہے۔ مگر انھوں نے یہ بھی کہا کہ بم بنانے کے لیے یورینیم کو نوّے فیصد تک اعلیٰ درجہ کا بنانا ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ مگر یہ تو صرف درجے کی بات ہے اور جب پانچ فیصد تک بنانے کی سہولیت موجود ہے تو اس سہولیت کو درجہ بڑھانے کے لیے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ اس سے صرف مقدار میں فرق پڑے گا، اس لیے سوال یہ نہیں کہ پاکستان

کے پاس بم میں استعمال ہونے والا مواد تیار کرنے کی اہلیت ہے یا نہیں بلکہ یہ کتنی مقدار میں بنانے کی اہلیت ہے۔

اختر علی کا کہنا ہے کہ اتفاقاً کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے جنرل ضیاء اپنے ملک کے نیوکلیائی پروگرام پر آگے بڑھنے کے قابل ہو پائے۔ افغانستان میں روس کی موجودگی، ایران میں شاہ کا زوال، شاہ کے جانے کے بعد ایران اور امریکہ کے درمیان تعلقات میں خرابی، اور ریگن کا امریکہ کا صدر منتخب ہو جانا۔ یہ ہیں عالمی پیمانے کے وہ واقعات جن کو جنرل ضیاء نے بڑی چابکدستی کے ساتھ پاکستان کے حق میں استعمال کیا۔ ان کو علم ہے کہ امریکہ تب تک ان کو ہٹانے کی نہیں سوچے گا جب تک وہ نیوکلیائی تجربہ نہ کریں۔ مگر ان کے دوست اور دشمن، سب پاکستان کی نیوکلیائی صلاحیتوں سے واقف ہیں۔ اور پاکستان کے لیے یہ ٹھیک ہے کہ وہ اسرائیل کا طریقہ اختیار کرے۔ یعنی ہتھیار بنائے، ان کو اسلحہ خانہ میں جمع کرے اور بالواسطہ طور پر ہر کسی کو یہ جاننے کا موقع دے کہ پاکستان ایک نیوکلیائی طاقت بن گیا ہے لیکن اس کا کبھی اعلان نہ کرے۔ واقعی طور پر یہ بہترین حکمت عملی ہے جس کو ضیاء اختیار کر سکتے ہیں۔ کھلے عام نیوکلیائی بم کا تجربہ نہ کرنے سے پاکستان کو امریکہ سے بھاری پیمانے کی امداد جاری رہے گی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۸۷ - ۱۹۸۶ء سے لے کر چھ برسوں میں دی جانے والی چھ بلین ڈالر کی فوجی امداد کے دونوں ملکوں میں بات چیت چل رہی ہے۔ اسلام آباد میں امریکہ کے سفیر ڈین ہنٹن کے مطابق پاکستان امریکہ سے ہاک جہاز اور درمیانی اور بھاری اُڑنے والی ہتھیار اور میزائیل مانگ رہا ہے امریکی سفیر نے کہا کہ "ہمارے پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان پر حملہ کرنے والے ملک کو، حملہ کرنے سے پہلے، دو نہیں تین بار سوچنا پڑے۔"

امریکہ شاید اس بات پر بھی غور کر رہا ہے کہ پاکستان کو نیوکلیائی پاور پلانٹ مہیا کرے تاکہ "ضیاء الحق سرکار کو نیوکلیائی بم بنانے کے پروگرام سے باز رکھا جائے"۔ ایسے ہر پلانٹ کی قیمت دو بلین ڈالر ہے۔ امریکہ کے ایک حاکم نے واشنگٹن میں کہا "مقصد یہ ہے کہ پاکستان کو ایک ایسے انتظام میں بند کیا جائے جس کو وہ توڑنے کی جرأت نہ کر سکے۔" اس بیان کی رپورٹ لندن کے "سنڈے ٹائمز" میں چھپ چکی ہے۔ مگر اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ امریکہ پاکستان کے بارے میں کس خاص انتظام کی سوچ رہا ہے جس کے تحت وہ امریکہ کے کیمپ میں برقرار رہے۔ یہ ممکن ہے کہ بھاری فوجی امداد اور تحفظ کی ضمانت کے بدلے پاکستان اپنے نیوکلیائی پروگرام کو چھپائے رکھے اور عام طور پر وہی پالیسیاں اختیار کرے جو اس خطے میں امریکہ کی پالیسیوں سے میل کھاتی ہوں۔ کم سے کم امریکہ کی یہی امید ہے۔

پاکستان ــ مسئلے

ضیاء کے نقطۂ نظر سے مسئلہ یہ ہے کہ مجوزہ امریکی امداد سے پاکستان کے کیا فائدے ہوں گے اور اس کو قبول کرنے سے پاکستان اور خود ان کی ذات کو کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ دوسری صورت میں اگر امداد کی اس پیش کش کو رد کرے تو کیا فائدے ہوں گے اور اس کے نتائج میں کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مسئلے کا سامنا ایک یا دوسری صورت میں پاکستان کے ہر حکمراں کو کرنا پڑا ہے۔

اس بات کا امکان کم ہے کہ صدر ضیاء کو امریکی فوجی اور اقتصادی امداد جاری رہنے جانے کے راستے پر چلنے میں کوئی دقت محسوس ہوگی۔ اس راستے پر چلنے سے یہ بات یقینی ہو جائے گی کہ پاکستان فوجی لحاظ سے اور مضبوط ہو جائے گا اور ملک میں حقیقی اقتدار فوج کے ہاتھوں میں رہے گا اور ملک کی باگ ڈور ضیاء کے ہاتھ۔ نقصانات یہ ہوں گے یا قیمت یہ ادا کرنا پڑے گی کہ پاکستان میں اپنے آر ڈی ایف ٹھکانوں پر امریکہ موجود رہے گا۔ ایک بار امریکہ کو کسی ملک میں ٹھکانہ مل گیا تو پھر اس کو جانے پر آمادہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر یہ مسئلہ اس وقت پیدا ہوگا جب امریکہ اپنی آر ڈی ایف فورس کو بالفرض ایران یا کسی خلیجی ملک بھیجنا چاہئے اس صورت میں پاکستان کو شاید اپنی فوج اور نیم فوجی فورس کو عرب ملکوں کے تحفظ کیلئے نہیں بلکہ امریکی مفادوں کو آگے بڑھانے کے لیے استعمال کرنا پڑے۔ اب اگر پاکستان امریکی امداد کی پیش کش کو رد کرتا ہے تو اس کا نتیجہ سب سے پہلے ذاتی طور پر ضیاء کے لیے تباہ کن ہوگا۔ پاکستان میں نہ صرف امریکہ بلکہ چین کے مفادات کو نظر میں رکھتے ہوئے پاکستان کے لیے روس کے قریب جانے کا درحقیقت کوئی راستہ نہیں ہے۔ چین اگر سوچ سمجھ کر ایسے اقدام کر رہا ہے تاکہ وہ دونوں بڑی طاقتوں سے برابر کا فاصلہ قائم رکھ سکے مگر یہ امکان نہیں کہ وہ پاکستان اور روس کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم ہونے دے کیونکہ اس سے پاکستان پر اس کی اپنی طاقت کم ہو جاتی ہے۔

اس لیے جس زاویۂ نگاہ سے بھی موجودہ فضا کو دیکھا جائے، امکان یہی نظر آتا ہے کہ امریکہ اور پاکستان کے موجودہ تعلقات جاری رہیں گے۔ پاکستان کے لیے امریکہ کی فوجی اور اقتصادی امداد بڑھ جانے کا اندازہ ہے اور وہاں امریکہ کے آر ڈی ایف فورس کے لیے ایک محفوظ اڈہ مہیا ہو جائے گا۔ امریکہ کی موجودگی سے پاکستان کو نیوکلیائی تجربے میں ممانعت ہوگی مگر وہ ایسے ہتھیار جمع کرتا جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے خلائی تحقیقی یونٹوں کو میزائیل ٹیکنالوجی تیار کرنے کے لیے استعمال کرے گا۔

ہندوستان ۔ آئندہ کیا کرنا ہے

ان باتوں کو ہندوستان کے لیے باعث تشویش نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ پاکستان کی طرف سے نیوکلیائی خطرہ کے امکانات اس حد تک زیادہ نہیں ہیں۔ لیکن ہندوستان کے سامنے دوسرے خطرے ہیں جن پر ہم یہاں بات کریں گے۔ یہ تو پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ ایٹمی پروگرام کو چھپائے رکھنے سے پاکستان کو فوری فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے یہ امکانات کم ہو جاتے ہیں کہ وہ ہندوستان کو نیوکلیائی خطرے کی دھمکی دے۔ مگر اس کے باوجود ہندوستان کو اپنی بقا کے لیے نیوکلیائی حفاظت کی ضرورت ہے۔ ماضی میں ہندوستان نے دوسرے کے خلاف جارحانہ کارروائیاں نہیں کی ہیں بلکہ وہ خود ہی آزادی کے بعد بھی جارحیت کا شکار رہا ہے۔ اس کو اب بھی کسی ملک کے خلاف جارحانہ ارادے نہیں ہیں اور نہ مستقبل میں وہ کسی پر جارحانہ حملہ کرنے جا رہا ہے۔ مگر نیوکلیائی حفاظت کے بغیر اس کو دھمکایا ڈرایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان سے کئی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ پہلی غلطی یہ کہ ۱۹۷۴ء میں جو اس نے زیر زمین ایٹمی دھماکہ کیا اس کی تشہیر کی نہ تو ضرورت تھی اور نہ ایسا کیا جانا چاہیئے تھا۔ اس سے بھی بڑی غلطی یہ ہوگئی کہ ایٹمی تجربہ عمل میں لانے کے مرحلہ تک نیوکلیائی ٹیکنالوجی کے نازک اور پیچیدہ شعبوں میں خود اعتمادی اور خود کفالت حاصل نہیں کی گئی۔ تیسری غلطی یہ کہ تجربہ کرنے کے بعد ہم اتنی ہمت پیدا نہیں کر سکے کہ ہم اس پروگرام کو جاری رکھنے کے فیصلہ کا مظاہرہ کر پاتے۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس ابھی بھی ایسے سائنسداں اور انجنیئر ہیں جو اشارہ پاتے ہی بڑی خوبی سے اپنی ذمہ داری کا حق ادا کر سکیں گے۔ کسی کو ہمیں ڈرانے دھمکانے یا ہم پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کے لیے کم سے کم قوت حاصل کی جا سکتی ہے اور کی جانی چاہیئے۔ اس سلسلے میں کسی طرح کی پس و پیش سے ہمیں شاید بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ اس 'کم سے کم قوت' کے ساتھ ساتھ روایتی ہتھیاروں اور طریقوں کے لحاظ سے بھی فوج کو طاقتور بنایا جانا چاہیئے تاکہ جارحیت پسند ہمسایہ ملک ہمارے خلاف کسی قسم کی فوجی مہم جوئی سے باز رہیں۔

نیوکلیائی خطرے کے علاوہ ملک کو اور بھی دوسرے خطروں کا سامنا ہے۔ یہ خطرے ہیں۔ ملک میں بد نظمی بلکہ کسی حد تک بغاوت کا مسئلہ، مرکز اور ریاستوں کے درمیان اچھے تعلقات اور رابطوں کی کمی کا مسئلہ، اور معاشی ترقی میں سست رفتاری کا مسئلہ۔

یہ مسئلے بہت اہم اور تشویشناک ہیں۔ اگر ملک کی اندرونی بد نظمی پر قابو نہیں پایا گیا ہمارے دروازے کسی بھی دشمن کے، بغیر رکاوٹ، اندر آنے کے لیے کھلے رہیں گے۔ پچھلے دو سال کے المناک واقعات سے، جن میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کی المناک موت کا واقعہ شامل ہے، عام لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ

اپنے ہی ملک کے عوام کا ایک حصّہ کس حد تک ملک میں کھلبلی پیدا کر سکتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت وقت سے زور پکڑ رہا تھا۔ یہ ہماری غلطی ہے کہ ہمیں اس کی خبر نہ رہی یا اگر کبھی کوئی اشارہ ملا بھی تو اس کو نظر انداز کیا۔ جموں و کشمیر اور مشرقی ریاستوں میں بھی کچھ وقت سے تنازعے برپا ہو رہے ہیں۔ اور ان علاقوں میں حالات نے کہیں زیادہ اور کہیں کم، سنگین صورت اختیار کی ہے کیونکہ اس کے لیے باہر سے تحریک اور حمایت حاصل ہو رہی ہے۔ اس سے پھر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہم قومی یک جہتی کا احساس پیدا کرانے میں اور باہر سے عدم استحکام پیدا کرنے والی قوتوں کو ملک میں داخل ہونے سے روکنے میں ناکام رہے ہیں۔

ان تنازعوں پر اگر قابو نہیں پایا گیا تو اس سے بے چینی پیدا ہوگی جو بغاوت اور علیحدگی کے مطالبوں کو جنم دے گی۔ ان حالات میں بیرونی قوتیں ہاتھ میں ہتھیار اٹھائے بغیر ہی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گی۔ جیسا کہ چیرمین ماؤ نے ایک بار کہا تھا کہ اگر کوئی دشمن خود اپنے مفادات کے خلاف کام کر رہا ہو تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جانا چاہیئے۔ ملک کے مختلف حصوں میں بے چینی کی واضح علامتوں کے باعث دشمن کو اپنی تلوار دکھانے کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر اس نے ایسا کیا تو تنازعے اور اختلافات ختم ہو جائیں گے اور بیرونی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک متحد ہو جائے گا۔

یہی وہ وجہ ہے کہ پاکستان یا چین کو اس وقت ہمیں طاقت کے استعمال کی دھمکی دینے کی ضرورت نہیں۔ اس کے باوجود چین نے تبت میں اپنی فوج کی تعداد بڑھا دی ہے۔ اور تبت کے اندر مواصلاتی نظام مضبوط کیا ہے۔ اس کے فوجی یونٹوں کو فوری طور پر ہماری سرحدوں کے پاس لایا جا سکتا ہے۔ اس نے تبت میں درمیانی دوری تک مار کرنے والے ہتھیار بھی نصب کیے ہیں جن کا نشانہ یا تو ہندوستان ہو سکتا ہے ورنہ ویت نام۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہ بھی ہر صورت حال کے لیے تیار رہے۔ ان کے تجربہ کار ماہروں نے یہ بات ذہن نشین کر لی ہے کہ ان کے نیوکلیائی ہتھیاروں کے لیے نشانوں کا بہت ہی احتیاط سے انتخاب کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر ان کا کہنا ہے کہ یہ نشانے پاکستان کی سرحد سے پچاس میل کے کم فاصلہ پر نہ ہوں کیونکہ اس سے بذات خود پاکستانی علاقوں کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔ دوم یہ کہ کشمیر میں مسلمانوں کی زیادہ آبادی ہونے کی وجہ سے وہاں کسی ٹھکانے کو نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح ہندوستان میں ان علاقوں کو نشانہ نہیں بنایا جائے گا جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ تیسرا یہ کہ اس علاقہ کو بھی نشانہ نہیں بنایا جائے گا جس پر پاکستان کو قبضہ کرنے کا ارادہ ہو۔ اس طرح سے جو نشانے باقی رہ جاتے ہیں وہ ہیں بمبئی کی ساحل سے دور سمندر میں تیل کے کنوئیں، مغربی ہندوستان میں نیوکلیائی تنصیبات، دلّی کا سیاسی مرکز، اور وہ علاقے جہاں بڑے فوجی ٹھکانے ہوں۔ نشانوں کے بارے میں

پاکستانی ماہرین نے جو یہ مکمل تجزیہ پیش کیا ہے اس سے ہندوستان اور باقی ملکوں میں ان لوگوں کو، جو پہلے اس بات پر شکوک ظاہر کرتے تھے، یقین ہونا چاہیئے کہ پاکستان نے بیشک نیوکلیائی ہتھیار جمع کیے ہیں اور وہ ان کو استعمال کرنے کی دھمکی بھی دے گا اور اس صورت میں استعمال بھی کرے گا اگر خالص نفع ونقصان کی بنیاد پر اسے فائدوں کے مقابلے میں نقصانات کم اٹھانے پڑیں گے اور فائدے زیادہ حاصل ہوں گے۔

ہندوستان کو ملک میں موجود نفاق اور تنازعوں کو قومی اتحاد میں بدلنے کے ساتھ ساتھ اقتصادی ترقی کی رفتار بھی تیز کرنا ہو گی اور اس سلسلے میں اس بات پر مکمل زور دینا ہو گا کہ معاشی ترقی کے فائدے ان طبقوں کو اور ان علاقوں کو حاصل ہو جائیں جن کی طرف ابھی تک کم توجہ دی گئی ہے۔

پس ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمیں اپنی بقا کے لیے نیوکلیائی اور روایتی دفاع کو مضبوط کرنا ہوگا ملک میں موجود نفاق کو قومی اتحاد میں بدلنا ہوگا اور اقتصادی ترقی کے کام کو تیز تر کرنا ہوگا۔ کسی ایک محاذ پر ناکامی، باقی دو محاذوں پر ہماری ترقی میں رُکاوٹ ثابت ہو گی۔

۴۔ پاکستان کی فوجی حکومت اور اس کے خطے کی سلامتی

کلیم بہادر

پاکستان کو، جنرل ضیاءالحق کی فوجی حکومت کے تحت، جنوب اور جنوب مغربی ایشیا میں امریکہ کی سامراجی حکمت عملی کے سلسلے میں بہت اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس حکمت عملی کا دارومدار پاکستان پر ہے تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ جنوبی ایشیا میں یہ ایک واحد ملک ہے جو ایک معاہدے کے تحت، فوجی اعتبار سے امریکہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس معاہدہ پر ۱۹۵۹ء میں دستخط ہوئے تھے اور اسّی کی دہائی کے آغاز میں امریکہ اور پاکستان کے درمیان رابطوں کی بحالی صرف ۱۹۵۹ء کے سلامتی سے متعلق معاہدہ کی تجدید تھی۔ امریکہ کے ساتھ پاکستان کا قریبی فوجی اتحاد بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس اتحاد کی بنیاد محمد علی جناح نے ڈال دی تھی، مگر اس کو پچاس کی دہائی کی ابتدا میں فوجی لیڈروں نے قانونی شکل دی۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کی تقسیم کے بعد، پاکستان وجود میں آیا، اس وقت امریکہ نے اس نئے ملک کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، کیوں کہ امریکہ کے صاحب اختیار لوگوں کے لیے برصغیر ہند بنیادی طور پر برطانیہ کے اثر و رسوخ کے دائرہ میں آتا تھا اور ان دو خود مختار ملکوں سے متعلق معاملوں میں وہ برطانیہ ہی سے صلاح لیتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ، یورپ کی معیشت بحال کرنے، مارشل پلان اور روس کی توسیع پسندی جیسے معاملوں کے ساتھ الجھا رہا۔ جہاں تک ہندوستان اور پاکستان کا تعلق ہے تو زیادہ توجہ ہندوستان کو ملتی تھی، کیوں کہ یہ ملک اور اس ملک کے نئے لیڈر جانے پہچانے تھے۔ اس لیے بھی کہ یہ ملک بڑا تھا، رقبے کے لحاظ سے بھی اور آبادی کے لحاظ سے بھی۔

پاکستان کے لیڈروں نے ملک کی تقسیم کا مطالبہ اس بنیاد پر کیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک علاحدہ "قوم" ہیں اس لیے انھیں خود ارادیت کا حق حاصل ہے۔ مسلم لیگ لیڈروں نے ملک

کی تقسیم کے مطالبے کی حمایت میں مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے اسلام کو استعمال کیا۔ لیکن جہاں تک قومی تعمیر کے لیے کسی لائحۂ عمل کا تعلق ہے تو انھوں نے اس سلسلے میں کچھ عام قسم اور مبہم بیانات دینے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ مسلم لیگ لیڈروں کو خارجہ پالیسی کی کوئی بصیرت حاصل نہیں تھی۔ انھوں نے کبھی بھی عالمی معاملوں میں کسی دل چسپی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی ان مختلف قوتوں کی آگاہی کا مظاہرہ جو عالمی سطح پر کام کر رہی تھیں۔ فلسطینی عربوں کا کاذوہ واحد مسئلہ تھا جس میں انھوں نے کچھ دل چسپی کا اظہار کیا۔ ترُکی کی خلافت کے مسئلے نے بھی ہندوستان کے مسلمانوں کو پریشان کر دیا لیکن اس معاملہ میں تاریخ ان کے ساتھ نہیں تھی اور نتیجہ یہ نکلا کہ پورے مسلم فرقہ کو احساس شکست نے گھیر لیا۔

پاکستان وجود میں آیا، تو چوں کہ پاکستان کے لیڈروں کے پاس خارجہ پالیسی کا کوئی ڈھانچہ نہیں تھا اس لیے انھوں نے، آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کے درمیان تقسیم کے پہلے کے ٹکراؤ اور ناچاقی کو دو ملکوں کے درمیان تعلقات میں جاری رکھا۔ اور یہی ٹکراؤ اور ناچاقی ہندوستان کے تئیں پاکستان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد بن گئے۔ اس ٹکراؤ میں ان تنازعوں سے اضافہ ہوا جو برطانوی حکمرانوں کی طرف سے تقسیم کے کام پر عمل درآمد کے طریقوں کے نتیجہ میں پیدا ہوئے۔ برصغیر میں ہندو اور مسلمان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہتے چلے آئے تھے۔ اس لیے اس کی تقسیم کا کام ایک بہت ہی پیچیدہ کام تھا۔ اس سے عداوت اور تلخی کو جنم ملنا ایک قدرتی امر تھا۔ یہ حقیقت کہ دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے مذاہب کے لاکھوں لوگ موجود تھے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ملک کی تقسیم کی سکیم بیہودہ اور بے معنی تھی۔ اس سے فرقہ پرستی کا مسئلہ حل نہیں ہوا بلکہ اور زیادہ شدید ہو گیا۔ کشمیر کا نام نہاد مسئلہ، دو ملکوں میں اثاثوں کی تقسیم، اور مذہبی اقلیتوں کا مسئلہ ایسے تنازعے تھے، جو تقسیم کی سکیم کو عملی صورت دینے کے طریقہ سے پیدا ہوئے۔

ہندوستان کے انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈروں نے قومی تحریک کے دوران میں، ایک طویل مدت میں، ایک ایسی ملی جلی قومیت کے نظریہ کو فروغ دیا تھا جس کی بنیاد سیکولرازم تھی۔ کانگریس کے سیکولر پلیٹ فارم کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کا دل جیتنا نہیں تھا اور نہ یہ کسی قسم کی چال تھی بلکہ یہ ایک مجبوری تھی جس کو ہندوستان کی گوناگوں سماجی زندگی نے جنم دیا تھا۔ اس کی تصدیق اس حقیقت سے ہو جاتی ہے کہ مسلم لیگ کے فرقہ پرست نظریے کی بنیاد پر پاکستان کے وجود میں آنے کے باوجود سیکولرازم کو ہندوستان کے آئین میں جمہوریہ ہندوستان کے ایک بنیادی اصول کے طور پر شامل کیا گیا۔ ہندوستان کے لیڈر ملک کی تقسیم پر اس لیے بالآخر راضی نہیں ہوئے کہ اُنھیں مسلم لیگ کے دو قومی نظریہ پر یقین آیا بلکہ اس لیے کہ یہ ایک ناگزیر اور ناخوشگوار مجبوری تھی جس کا اگر کوئی چارہ تھا تو یہ کہ بدیشی حکمران ملک

میں موجود نہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی لیڈروں کا یہ خیال تھا کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد مسلم لیگ لیڈر پاکستان کے لوگوں کی سماجی واقتصادی اور سیاسی تمناؤں کو مدنظر رکھ کر ہندوستان کے ساتھ اگر اتحاد نہیں تو قریبی دوستانہ تعلقات قائم کرنے پر ضرور مجبور ہو جائیں گے۔ مگر یہ ہندوستانی لیڈروں کی سادہ دلی اور بھول تھی۔

چوں کہ پاکستان کے لیڈروں کے پاس قومی تعمیر کے لیے کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اس لیے وہ ایسی کوئی خارجہ پالیسی بھی وضع نہیں کر سکے جو ان کے قومی تعمیر نو کے پروگرام سے مطابقت رکھتی۔ اس کا ثبوت اس بات سے مل جاتا ہے کہ پاکستان کا حکمراں طبقہ اپنے ملک میں ایسے سیاسی ادارے اور کوئی ایسا نظام حکومت قائم کرنے میں ناکام رہا ہے جس میں زندہ رہنے کی قوت ہوتی۔ پاکستان جن علاقوں پر مشتمل ہے۔ ان علاقوں میں تحریک پاکستان کی مخالفت ہوئی تھی خاص طور پر مغربی پاکستان میں، جہاں جاگیردارانہ طبقے کا غلبہ تھا چنانچہ ابتدائی برسوں میں پاکستان پر ان لوگوں کی حکومت رہی جو ہندوستان سے چلے گئے تھے اور جن کا تعلق دولت مند اور بیوروکریسی طبقے کے ساتھ تھا۔

پاکستان کے اس حکمراں طبقے کی ملک میں کوئی بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے پاس قومی تعمیر نو اور قومی اتحاد کے لیے ایک ہی طریقہ تھا، وہ تھا مذہب کا استعمال اور ملک کے وجود کے لیے ہندوستان کی طرف سے نام نہاد خطرے کا نعرہ۔ پاکستان کے لیڈروں کو پہلے ہی دن سے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ سرحدی سالمیت کے خلاف خیالی خطرے کا مقابلہ صرف کسی بیرونی طاقت کی مدد سے ہی کر سکتے ہیں۔ جنگ کے بعد کے دور کے آغاز میں برطانیہ کی طاقت ختم ہو گئی تھی اس لیے وہ ہندوستان کے ساتھ کسی تصادم میں پاکستان کی مدد کے قابل نہیں تھا۔ عرب ملک بھی ان دنوں تیل کی دولت سے مالا مال نہیں تھے اور ان کے بارے میں ایک پاکستانی لیڈر نے یہ صحیح کہا تھا کہ ان کی حیثیت "صفر جمع صفر" کے برابر ہے۔ ان حالات میں پاکستان امریکہ کے قریب آیا جو دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک عالمی طاقت کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آچکا تھا۔

امریکہ کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے پاکستانی لیڈروں نے اس بات پر بہت زور دیا کہ وہ کمیونسٹ مخالف اور روس مخالف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُن برسوں میں یہ لیڈر امریکیوں سے بھی زیادہ کمیونسٹ مخالف تھے۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں نے جب ۱۹۵۰ء میں واشنگٹن کا دورہ کیا تو انھوں نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ پاکستان کو جمہوریت پر غیر متزلزل یقین ہے اور نجی صنعت کاری اور نجی کارخانہ داری کے حقوق کا پورا احترام۔ انھوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ اسلام اور کمیونزم ایک دوسرے کے سخت مخالف ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے پاکستان کی جغرافیائی اور فوجی لحاظ سے اہم پوزیشن

کی طرف بھی توجہ دلائی۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی جغرافیائی پوزیشن کو پاکستان کے تمام حکمرانوں نے وقت وقت پر اپنی دلیل کی بنیاد بنایا۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے اپنے دورِ اقتدار میں اعلان کیا تھا کہ اگر پاکستان نہیں ہو، تو امریکہ کو ایشیا میں استادہ رہنے کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں ملے گی۔ انھوں نے ہی پاکستان کو امریکہ کا قریب ترین اتحادی بنادیا۔ ۱۹۷۷ء میں اقتدار میں آنے کے بعد سے جنرل ضیا بھی یہی کچھ امریکہ کے صاحب اختیار لوگوں سے کہتے آئے ہیں۔ پاکستان نے کوریا کی جنگ "امن کے لیے متحد ہو جانے" اور جاپان کے امن معاہدے کے سلسلے میں امریکہ کی جو حمایت کی اس کے نتیجے میں دو ملک ایک دوسرے کے اور نزدیک آگئے۔ امریکہ میں رفتہ رفتہ یہ احساس بڑھنے لگا کہ روس کے خلاف کشمکش میں ان علاقوں کو کافی اہمیت حاصل ہے جو پاکستان میں ہیں۔ کہا یہ گیا" ایشیا یا مشرق قریب میں کسی بھی جگہ کے مقابلہ میں، کراچی، راولپنڈی اور لاہور جیسی جگہوں کے ہوائی ٹھکانے روس کے علاقوں کے زیادہ نزدیک ہیں۔ جن میں اورلز کا مشرقی صنعتی علاقہ شامل ہے۔"

پاکستان امریکہ کی طرف سے قائم کیے گئے فوجی اتحادوں سیٹو اور سینٹو میں پچاس کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں شامل ہو گیا۔ یہ دونوں اتحاد اس وقت وجود میں آئے جب سرد جنگ عروج پر تھی۔ سیٹو تو عوامی جمہوریہ چین کے خلاف قائم کیا گیا تھا اور جہاں تک سینٹو کا تعلق ہے تو اس کے مقاصد کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ سینٹو سے پہلے بغداد پیکٹ اتحاد قائم ہوا تھا جو امریکہ کی اس عالمی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا جس کا مقصد روس کے اردگرد فوجی ٹھکانے قائم کر کے اس کو گھیرنا تھا۔ مگر یہ پیکٹ عرب ملکوں کی قوم پرست قوتوں کے خلاف بھی تھا۔ بغداد پیکٹ کے لیے ترکی، ایران، پاکستان اور عراق کی مغرب نواز حکومتوں نے پہل کی تھی۔ لیکن عراق کی شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد بغداد پیکٹ کا زور ختم ہوا۔ اس لیے کچھ عرصہ بعد اس کے بدلے سینٹو اتحاد قائم کیا گیا۔ اس پیکٹ کے ساتھ پاکستان کی وابستگی سے عرب ملکوں کے قوم پرست پاکستان کے خلاف ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ناصر کے دور میں مصر نے پاکستان کے قریب آنے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کے خلاف صدر ناصر کے شکوک اس وقت پیدا ہو گئے جب مصر پر برطانیہ اور فرانس کی جارحیت کے دوران پاکستان نے مشتبہ کردار ادا کیا۔ سعودی عرب اور دوسرے خلیجی ملکوں کی شاہی اور رجعت پسند حکومتوں کو بھی سینٹو میں شامل ہونے کی جرأت نہیں ہوئی کیونکہ ان کو اندیشہ تھا کہ اس سے ان کے ملکوں میں لوگوں کے جذبات مشتعل ہونگے۔

یہ اتحاد امریکہ کی اس عالمی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ روس اور دوسری ترقی پسند قوتوں کے خلاف لڑائی میں امریکہ کے مفاد پورے ہو جائیں۔ اس بڑے کھیل میں پاکستان جیسے چھوٹے ملکوں

کی حیثیت مہروں کی جیسی تھی۔ اتحادوں کا مقصد "کمیونسٹ جارحیت" کے خلاف دفاع منظم کرنا تھا اور یہ فیصلہ کرنے کا حق کہ کس نوعیت کی کارروائی کو جارحیت کہا جائے اور کس کو نہیں صرف امریکہ کو حاصل تھا۔ پاکستان کے لیڈروں اور دوسروں نے یہ دعوا ضرور کیا کہ یہ اتحاد کسی بھی قسم کی جارحیت کے خلاف ہیں لیکن امریکہ نے کبھی بھی سینٹو اور سیٹو کے مقاصد کا دائرہ اس قدر بڑا ہونے کے دعوا کی تصدیق نہیں کی۔ اور چوں کہ ان اتحادوں کی کم و بیش پوری فوجی طاقت امریکہ کی طرف سے مہیا کی جارہی تھی اس لیے اتحادوں کے مقاصد کی تشریح وہی صحیح مانی جاسکتی تھی جو امریکہ کی طرف سے پیش ہوتی۔ سینٹو معاہدہ پر تو اس نے دستخط بھی نہیں کیے تھے کیوں کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسرائیل اس پر اس بات کے لیے دباؤ ڈالے کہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ایک معاہدہ کیا جائے ایسی کارروائی سے عرب دنیا میں اور زیادہ ناراضگی پیدا ہوجاتی۔ اسرائیل کو تو کسی معاہدہ کے بغیر بھی امریکہ سے ہر قسم کی فوجی اور سیاسی مدد حاصل ہو رہی تھی۔

اگرچہ سینٹو میں شامل سبھی ملک روس کی جنوبی سرحدوں پر واقع تھے۔ لیکن اس اتحاد کو صرف روس کے خلاف ہی استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے پاکستان کی مشرقی سرحدوں کی طرف سے ہندوستان کو بھی خطرہ تھا اور خلیج فارس کے علاقہ میں بھی اس اتحاد کو استعمال کیا جاسکتا تھا۔

مگر رفتہ رفتہ ستر کی دہائی میں ان اتحادوں کی افادیت ختم ہوگئی۔ روس اور چین میں کشیدگی بڑھنے سے، ماؤ کی رہنمائی میں، چین امریکہ کے نزدیک آیا اور نتیجہ کے طور پر سیٹو کی کوئی اہمیت نہیں رہی کیونکہ اس کو چین ہی کے خلاف قائم کیا گیا تھا۔ جہاں تک سینٹو کا تعلق ہے تو پاکستان میں بھٹو کے اقتدار سنبھالنے کے بعد اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہی کیونکہ بھٹو امریکہ سے اس بات پر نالاں ہوگئے تھے کہ اس نے بنگلہ دیش کے مسئلہ پر ہندوستان کے ساتھ جنگ میں پاکستان کی مدد نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ مصر کے صدر سادات کی طرف سے کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے پر دستخط کرنے سے عربوں کے سامراج مخالف محاذ میں نفاق پیدا ہوگیا تھا۔

مگر امریکہ کے ساتھ پاکستان کے "حفاظتی تعلقات" میں کوئی فرق نہیں آیا کیونکہ، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، اس نے ۵ مارچ ۱۹۵۹ء کو امریکہ کے ساتھ باہمی تعاون کے ایک سمجھوتہ پر دستخط کیے تھے اور اس کے تحت امریکہ کی فوجی اور اقتصادی امداد یقینی بن جاتی تھی اور یہ وعدہ بھی برقرار رہتا تھا کہ جارحیت کی صورت میں، امریکہ اپنی ہتھیار بند فوج کو استعمال کرے گا۔ یہ صحیح ہے کہ جارحیت کی بات اس لیے مبہم تھی کہ اس میں اس ملک سے جارحیت کے خطرے کا ذکر تھا جس پر "بین الاقوامی کمیونزم" کا کنٹرول ہو لیکن مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ امریکہ کے پاس "بین الاقوامی کمیونزم" کی تشریح کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان بھی ہمیشہ اس بات پر زور دیتا آیا ہے کہ ان سمجھوتوں کے تحت ہندوستان کے ساتھ جنگ

کی صورت میں پاکستان کو امریکی امداد کی ضمانت حاصل ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات میں نشیب و فراز کے باوجود سلامتی سے متعلق ۱۹۵۹ء کے اس معاہدہ کو منسوخ نہیں کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد بھی نہیں، جس میں امریکہ نے پاکستان کے فوجی جنرلوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور جس میں پاکستان کی فوج کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۹۶۵ء کی ہند، پاک جنگ کے بعد جب امریکہ نے پاکستان کے لیے اپنی اقتصادی اور فوجی امداد میں بہت کمی کی تو پاکستان کے حکمرانوں پر امریکہ کے ساتھ اتحاد کے جادو کا اثر ختم ہوگیا۔ انھوں نے امریکہ پر اپنا انحصار کم کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ خارجہ پالیسی کے بنیادی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی۔ لیکن رفتہ رفتہ پاکستان چین کے قریب ہوتا چلا گیا۔ چین نے اس نقصان کا ایک بڑا حصہ پورا کردیا جو ہندوستان کے ساتھ جنگ میں پاکستان کو اٹھانا پڑا تھا۔ ان ہی دنوں پاکستان نے پشاور کے نزدیک بیڑا بار کے جاسوسی اڈہ سے متعلق دس سال کا سمجھوتہ منسوخ کردیا۔ مگر ان واقعات کے باوجود پاکستان اور امریکہ نے اپنے قریبی سیاسی اور اقتصادی تعلقات جاری رکھے۔ امریکہ کی طرف سے خاصی تعداد میں پاکستان کو ہتھیار بھی مہیا ہوتے رہے۔ ۱۹۷۱ء کی بنگلا دیش جنگ کے دوران صدر نکسن نے یحییٰ خان کو سیاسی طور پر پوری مدد دی۔ بلکہ وہ خلیج بنگال میں اپنا ساتواں فلیٹ بھیجنے کی حد تک بھی گئے۔

سنتر کی دہائی کے اوائل میں، ایک طرف، ذوالفقار علی بھٹو نے امریکہ کے کہنے پر پوری طرح سے عمل نہیں کیا اور دوسری طرف سے امریکہ کا خارجہ دفتر بھی ان پر پوری طرح بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ بھٹو، امریکہ کی زبردست مخالفت کے باوجود فرانسیسی نیوکلیرری پروسیسنگ پلانٹ کے سودا کے سلسلے میں آگے بڑھے۔ انھوں نے ہندوستان کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کا عمل بھی شروع کیا۔ یہ تعلقات ۱۹۷۱ء کی جنگ سے بہت خراب ہوگئے تھے۔

سنتر کی دہائی میں جنوب اور جنوب مغربی ایشیا میں بھی حالات بدل گئے۔ امریکہ اب دکھاوا نہیں کرسکا کہ جنوبی ایشیا کو اس کی ترجیحات میں بہت اونچا مقام نہیں ہے۔ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ سے جنوب مغربی ایشیا کے حالات میں زبردست تبدیلی آگئی۔ خلیجی علاقہ میں ایران کے شاہ امریکی پالیسی کے ایک بہت بڑے ستون تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ملک کے اقتدار کی باگ ڈور بڑے مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہیں کہ اچانک حالات کا رخ بدل گیا اور ۱۹۷۹ء میں اقتدار ان سے چھین لیا گیا۔ مصر کے صدر سادات نے عربوں کے قومی کاز سے غداری کی اور اسرائیل کے ساتھ کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ پر دستخط کیے اور اس طرح سے امریکہ کی مغربی ایشیا کی پالیسی کے دوسرے بڑے ستون بن گئے۔ ایران کے انقلاب کے بعد ان کو کچھ مذہبی کٹر پسندوں نے قتل کیا۔ سعودی عرب کی جیسی مضبوط شاہی حکومت میں بھی کمزوریوں

کے علامات نظر آنے لگے۔ نومبر ۱۹۷۹ء میں سیاسی اور مذہبی مخالفوں کے ایک گروپ نے اپنی مخالفت کا علامتی مظاہرہ کرنے کے لیے مکہ میں کعبہ پر قبضہ کیا۔ انھوں نے یہ قبضہ اس وقت کیا جب پوری دنیا سے مسلمان فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے وہاں جمع ہوئے تھے۔ پاکستان کی ہمسائیگی میں ۱۹۷۸ء میں افغانستان میں داؤد کو ہٹا کر ایک انقلابی حکومت نے اقتدار سنبھالا۔ ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ کو جنوب مغربی ایشیا میں ایک کے بعد ایک رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا اور اس کی پالیسی کی بنیادیں ایک ایک کر کے گرنے لگیں۔

پاکستان میں جولائی ۱۹۷۷ء میں فوج کی طرف سے تختہ الٹ دیے جانے کی کارروائی کو اسی پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔ اس کارروائی میں پاکستان کی پہلی منتخب حکومت کو ہٹا دیا گیا اور اقتدار پھر سے فوج کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس پر واشنگٹن میں اطمینان کی سانس لی گئی۔ جنرل ضیا نے پہلے ہی دن سے واشنگٹن اور ریاض سے اپنے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش شروع کی۔ ان کو علم تھا کہ پاکستان کے لوگوں کی امنگوں کے خلاف کام کرنے کے بعد وہ صرف امریکہ کی مدد سے اقتدار پر قائم رہ سکتے ہیں۔ وہ بار بار امریکہ کا دھیان اس طرف دلاتے رہے کہ فوجی حکمت عملی میں جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کو ایک اہم پوزیشن حاصل ہے۔

"اگر آپ اس خطہ کے نقشہ کا جائزہ لیں گے، اور ہتھوڑے اور درانتی کو افغانستان کے اوپر سے لے جائیں گے۔ پھر آپ دیکھیے کہ کون کون سے علاقے ہیں جو کمیونزم کے دائرہ میں آسکتے ہیں۔ ایران کہاں ہے، خلیج کہاں ہے اور سعودی عرب کہاں ہے اور باقی مسلم دنیا۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر روس کی مداخلت سے افغانستان کے حالیہ واقعات نے ماحول میں تبدیلی لائی ہے تو پاکستان توجہ کا مستحق ہے۔"

پاکستان کی فوجی اعتبار کی اہمیت سے امریکہ، دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں روس کی مداخلت سے پہلے ہی واقف تھا۔ بہت سے لوگ، غلط فہمی کے تحت، یہ دلیل پیش کرتے رہے ہیں کہ امریکہ نے افغانستان میں روسی کارروائی کے بعد ہی، پاکستان کو بھاری پیمانہ پر اقتصادی اور فوجی امداد دینے کا فیصلہ کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ امداد ان واقعات کی بنا پر دی گئی جو اس خطہ میں ایران کے شاہ کا اقتدار ختم ہونے سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ بات ضرور ہے کہ افغانستان میں روسی کارروائی سے یہ امداد دینے کے عمل میں تیزی آئی ہے۔

یہ عمل امریکہ اور پاکستان کے درمیان فوجی حکمت عملی میں اتفاق رائے حاصل ہونے کے ساتھ اپنے عروج پر پہنچا۔ اس اتفاق رائے میں پاکستان کو یہ رول دیا گیا کہ وہ جنوب مغربی ایشیا میں امریکہ کے مفادات پر نظر رکھے۔ یہ رول پہلے خلیج میں ایران کے شاہ اور مغربی ایشیا میں اسرائیل انجام دے

رہا تھا۔ یہ تو پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ مصر کے سادات بھی اس سلسلے کی ایک کڑی بن گئے تھے۔ امریکی رابطے بحال کرنے کا پہلا اور سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان باہمی سلامتی کے ۱۹۵۹ء کے سمجھوتہ میں نئی روح ڈالی جائے جس کو پاکستان نے سیٹو اور سینٹو اتحادوں میں سے نکلنے کے بعد بھی منسوخ نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ء کے وسط میں امریکہ نے پاکستان کو نئے سرے سے ہتھیاروں کی سپلائی کا فیصلہ کیا۔

بہت سے مبصروں کا خیال یہ ہے کہ جنوب مغربی ایشیا میں پاکستان کی وابستگی ۱۹۷۱ء کی ہند - پاک جنگ کے بعد' اسلامی اتحاد کی طرف اس کے جھکاؤ' کا نتیجہ ہے۔ پاکستان کے وجود کے ابتدائی برسوں میں پاکستان کے لیڈروں نے اسلامی یک جہتی کے بارے میں بہت شور و غل مچا دیا تھا۔ حالاں کہ یہ بات کسی سے چھپی نہیں رہی کہ وہ مسلم ممالک کی قیادت سنبھالنا چاہتے تھے اور اس بات کو اسلامی دنیا میں پسند نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد پاکستان بغداد پیکٹ میں شامل ہو گیا' اس سے عرب ملکوں میں پاکستان کے لیے مخالفت کے احساسات پیدا ہو گئے۔ پاکستان کے لیڈروں نے مغرب نواز عرب ملکوں کے ساتھ قریبی تعلقات قائم رکھے۔ ستر کی دہائی کے دوران پاکستان اسلامی کانفرنسوں کو استعمال کر کے' سعودی عرب کے نزدیک آیا۔ ان دنوں سعودی عرب اپنے تیل کی دولت اور امریکہ کے ساتھ تعلقات کی بنا پر مغرب نواز مسلم ممالک کی لیڈر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا تھا۔ شاہ فیصل نے اس وجہ سے بھی اسلامی دنیا کی رہنمائی کا دعوا کیا کہ مکہ اور مدینہ سعودی عرب میں واقع ہیں۔ اسلامی دنیا میں پاکستان کی اہمیت صرف اس وجہ سے ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی میں اس نے مقابلتاً زیادہ ترقی کی ہے اور اس کے پاس تربیت یافتہ افرادی قوت ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے پاس تربیت یافتہ فوجی عملہ بھی ہے اور اس نے بیشتر عرب سلطنتوں کو بھاری پیمانے پر اپنے فوجی یونٹ بھیج دیے ہیں۔ اس سے جنوب مغربی ایشیا میں پاکستان کے رول کا ایک اور پہلو سامنے آجاتا ہے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء میں اردن میں پاکستان کے فوجی یونٹوں نے جنرل ضیاء الحق کی کمانڈ میں شاہ حسین کو فلسطینی تنظیم آزادی کو ختم کرنے میں مدد دی تھی۔ سعودی عرب میں پاکستانی فوج کے دو ڈویژن (دو ہزار چھ سو آدمی) موجود ہیں اور ان میں بکتر بند بریگیڈ بھی شامل ہے۔ اس طرح متحدہ عرب امارات، کویت اور عمان جیسے خلیجی ملکوں کے ساتھ بھی پاکستان کے فوجی تعلقات ہیں۔ پاکستان ان کو اپنا فوجی عملہ یا تو ڈیپوٹیشن پر یا کنٹریکٹ پر مہیا کرتا ہے اور اس کے علاوہ اپنی فوجی برادری میں ان ملکوں کا فوجی عملہ کو تربیتی سہولیات مہیا کرتا ہے۔ پاکستان یہ سب کچھ یونہی نہیں کرتا ان

خدمات کا اس کو صلہ بھی مل جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں سعودی عرب نے اعلان کیا تھا کہ اس کی نظر میں سعودی عرب کی سلامتی، پاکستان کی سلامتی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور پاکستان کے اندرونی معاملوں میں کسی قسم کی مداخلت کو سعودی عرب کے خلاف دشمنانہ کارروائی تصور کیا جائے گا۔ سعودی عرب اور پاکستان میں یہ رشتہ اتحاد امریکہ کے لیے ایک اچھی بات تھی۔ اس کے علاوہ سعودی عرب پاکستان کی طرف سے ایف - ۱۶ اور ہارپون میزائیل حاصل کرنے کے سلسلے میں قیمت کا ایک حصہ بھی ادا کرنے جا رہا تھا۔ برصغیر میں جنگ کی صورت میں پاکستان ان اسلحہ جات کو بھی استعمال کر سکتا جن کے خلیجی ملکوں نے بھاری ذخیرے کیے ہیں۔ سنہ ۱۹۷۱ء کی ہند۔ پاک جنگ میں بھی ہتھیاروں کی منتقلی کے بارے میں اطلاعات ملی تھیں۔

عربوں اور پاکستان کے درمیان اس فوجی رشتہ کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ ان بیشتر عرب ملکوں میں شخصی حکومتیں قائم ہیں جو کرپٹ ہیں اور جن کو لوگوں میں کوئی حمایت حاصل نہیں ہے۔ ان ملکوں میں بے چینی اور اختلاف بڑھنے کی اطلاعات ملتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مکہ شریف میں کعبہ پر کچھ مخالف عناصر کے قبضہ کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ خلیجی ملک پاکستان کے فوجی دستوں کو اپنے ملکوں میں عوامی تحریکوں اور بے چینی کو دبانے کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو اس کا مقصد ہے کہ وہ تیل کی دولت سے مالا مال ان عرب ملکوں کے ساتھ اپنے نزدیکی رابطوں سے حاصل کی گئی طاقت کو ہندوستان کے ساتھ ٹکراؤ میں استعمال کرے۔ آزادی کے بعد سے یہاں کے حکمرانوں نے اسلام کو ہندوستان کے خلاف کشمکش میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان ہر بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں کشمیر کا نام نہاد مسئلہ اٹھاتا ہے اور اپنے قومی مفاد کے لیے اسلامی ملکوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کئی بار تو پاکستان کے حکمراں اس حد تک بھی گئے کہ انھوں نے مسلم دنیا کے ضروری اور فوری نوعیت کے مسئلوں پر بات چیت کرنے کے لیے بلائی گئی بین الاقوامی کانفرنس میں ہندوستان کا ہوا کھڑا کر کے اس میں نفاق پیدا کرنے کا خطرہ بھی مول لیا۔ اس کے لیے رباط کانفرنس کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جس کو یہودیوں کی طرف سے مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کے معاملے پر غور کرنے کے لیے بلایا گیا تھا اور جس میں پاکستان کے ان دنوں کے صدر یحییٰ خاں نے بہت حد تک نفاق پیدا کیا تھا۔ جنرل یحییٰ خاں نے کانفرنس میں ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادوں کا معاملہ اٹھایا تھا جس کے نتیجہ میں کانفرنس میں غیر ضروری طور پر ناچاقی پیدا ہوئی اور الاقصیٰ مسجد کا مسئلہ غیر اہم بن کے رہ گیا۔

پچھلے کئی برسوں کے دوران میں عرب ملکوں کی شاہی حکومتیں، خاص طور پر سعودی عرب، ضیا کی حکومت کو افغانستان کے ساتھ اس کی جنگ میں مدد کرتا رہا ہے۔ پاکستان اور سعودی عرب کی پہل پر ہی مئی

اور جون ۱۹۸۰ء میں افغانستان کی صورت حال پر بات چیت کرنے کے لیے اسلامی ممالک کے خارجہ وزیروں کی کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ اگرچہ بہت سی اسلامی حکومتوں نے افغانستان کے خلاف جنگ میں امریکہ، پاکستان اور سعودی عرب کا ساتھ دینے سے انکار کیا مگر پاکستان ان سے یہ وعدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ افغانستان میں مداخلت کے لیے وہ اس کو مادی اور سیاسی مدد فراہم کریں گے۔ اس بات سے ہر کوئی واقف ہے کہ افغان باغیوں کو، جو پاکستان کے علاقوں سے کارروائی کرتے ہیں، ملنے والی مالی امداد کا ایک بڑا حصہ سعودی عرب سے فراہم ہوتا ہے۔ افغانستان کے ان رفیوجیوں کی امداد کے لیے بھی سعودی عرب سے بھاری پیمانہ پر رقومات مہیا ہو رہی ہیں۔ یہ روپیہ پرائیویٹ ایجنسیوں کے ذریعہ فراہم کیا جاتا ہے جن میں جماعت اسلامی جیسی مذہبی و سیاسی تنظیمیں شامل ہیں۔ پچھلے سال جماعت اسلامی کو اپنی تنظیم کا کوئٹہ کا سارا یونٹ پارٹی سے خارج کرنا پڑا۔ ان پر مالی بے ضابطگی کا الزام تھا۔

افغانستان میں جو امریکہ کی پشت پناہی سے مداخلت ہو رہی ہے اس میں پاکستان بہت گہرے طور پر ملوث ہو گیا ہے۔ امریکہ میں اس سال ان افغان باغیوں کے لیے ہتھیاروں کی سپلائی کی خاطر پانچ سو ملین ڈالر کی رقم مخصوص کرنے کی تجویز ہے۔ اس کے علاوہ دو ملین ڈالر کی رقم عرب ملکوں سے فراہم کی جائے گی۔ اتنی بڑی رقم کی مالیت کے ہتھیاروں کی سپلائی سے افغانستان اور پاکستان کی سرحد پر تصادم بڑھ جائے گا۔ اسی لیے روسی لیڈر مائیکل گورباچوف نے جنرل ضیاء الحق کو اس وقت وارننگ بھی دی جب وہ چرنینکو کے جنازے میں شرکت کرنے کے لیے اس سال مارچ میں ماسکو گئے تھے۔ مگر جنرل ضیاء نے ڈھٹائی سے کام لے کر کرمل سرکار کو اس بنا پر تسلیم کرنے سے انکار کیا کہ ان کی سرکار ایک نمائندہ سرکار نہیں ہے۔ وہ یہ بھول گئے کہ خود ان کی اپنی حکومت بھی نمائندہ حکومت نہیں ہے۔ وہ تو ان مذاکرات میں بھی سنجیدہ نہیں ہیں جو اس مسئلہ کا بات چیت کے ذریعہ کوئی حل ڈھونڈ نکالنے کے لیے جنیوا میں اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے اہتمام سے ہو رہے ہیں۔

افغانستان میں ضیاء کی مداخلت پسند پالیسی اس خطہ میں تناؤ کا ایک بڑا سبب ہے۔ اس بات سے ہر کوئی واقف ہے کہ مارشل لا حکومت نے ایک سپیشل فورس منظم کیا ہے جس کو امریکہ، مصر اور عرب ملکوں سے حاصل کیے گئے ہتھیار افغانستان کے باغی گروپوں تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی ہے۔ پاکستان میں افغان گوریلاؤں کو تربیت دینے کے اسی مرکز قائم ہیں۔ اور ان میں امریکی ماہروں کو تربیتی کام پر مامور کیا گیا ہے جب روسی اور افغان فوج ان باغیوں کا پیچھا کرتے ہیں تو وہ پاکستانی علاقوں میں پناہ لیتے ہیں۔ افغان باغیوں کی طرف سے جو روسی اور افغان فوجی پکڑے جاتے ہیں ان کو پاکستان لایا جاتا ہے اور وہاں پھانسی دی جاتی ہے۔ حال ہی میں بارہ ۱۲ روسی اور کچھ افغان انقلابی فوجیوں کو پاکستانی

علاقہ میں ایک مرکز پر امریکی ماہرین کی موجودگی میں پھانسی دی گئی۔

پاکستان کی طرف سے جنوبی اور جنوب مغربی ایشیا میں امریکی پالیسی کے آلۂ کار اور شریک کار کا رول ادا کرنے سے ہندوستان کو تشویش لاحق ہوتی ہے۔ امریکی حکمت عملی میں ایک شریک کار ہونے کے ناطے پاکستان کو سینٹرل کمانڈ سسٹم میں شامل کیا گیا ہے۔ راپڈ ڈپلائمنٹ فورس اس سسٹم کے تابع ہے۔ حال کے مہینوں میں امریکہ پاکستان میں معمول سے زیادہ دلچسپی لیتا رہا ہے۔ پچھلے کچھ مہینوں میں امریکہ کے اعلا پایہ کے کچھ حکام نے ملک کا دورہ کیا۔ ان میں امریکہ کے خارجہ وزیر جارج شلز، وزیر دفاع کاسپر واین برگر، نائب صدر جارج بش اور بحریہ کے سکریٹری جان لیہ مین شامل ہیں۔ کچھ ماہ پہلے امریکی مسلح افواج کے جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے چیرمین وسیی بھی اسلام آباد آئے تھے۔

اس بارے میں برابر اطلاعات آ رہی ہیں کہ جنرل ضیا نے پاکستان میں امریکی اڈے قائم کرنے کی بات مان لی ہے۔ یہ اڈے ان اڈوں سے مختلف ہوں گے جو پچاس کی دہائی میں قائم کیے گئے تھے۔ اس وقت تو پاکستان صرف ایمرجنسی کی صورت میں امریکہ کو بحری اور ہوائی اڈے اور دوسری سہولیات کا استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ امریکہ ان اڈوں کی تعمیر، ان کی توسیع اور ان کو جدید بنانے میں مدد کرتا ہے۔ بلوچ لیڈر اب برسوں سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ بلوچستان کے ریگستانی خطہ اور بحیرۂ عرب کے ساحل پر فوجی اڈے تعمیر ہو رہے ہیں۔ پشاور، سرگودھا، کراچی اور گوادر کے اڈوں تک پہلے ہی امریکہ کو رسائی حاصل ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بحر ہند میں ڈیگو گارشیا میں بھی امریکہ کا ایک فوجی اڈہ موجود ہے۔ یہ اڈہ راپڈ ڈپلائمنٹ فورس کا ایک مرکز بھی ہے۔

حال کی اطلاعات کے مطابق واشنگٹن نے جنوب مغربی ایشیا میں اپنے جارحانہ منصوبوں میں پاکستان کو اور زیادہ ملوث کیا ہے۔ پاکستان نے آر۔ ڈی۔ فورس کے نمونے پر بیس ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک ڈویژن قائم کرنے کی بات مان لی ہے جس کو ضرورت پڑنے پر صرف چند گھنٹوں کے اندر اندر ہوائی جہازوں کے ذریعہ خلیجی علاقوں سمیت اس خطہ میں موجود کسی بھی جگہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی مسلح فوج امریکہ کے ساتھ مشترکہ فوجی مشقوں میں بھی حصہ لیتی رہی ہے۔ ان مشقوں کے دوران نئے ہتھیاروں کا بھی تجربہ کیا گیا۔ اسی طرح انٹیلی جنس (جاسوسی) سے حاصل کی گئی اطلاعات بھی اس کو مہیا کی جا رہی ہیں جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ دونوں ملکوں کی فوج کس حد تک ایک دوسرے کے ساتھ قریبی تعاون کر رہی ہے۔

قدرتی طور پر ہندوستان ان واقعات کے دائرہ اثر سے باہر نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کو پچھلے تیس برسوں کا یہ تجربہ حاصل ہے کہ جب بھی امریکہ نے پاکستان کو نام نہاد "کمیونسٹ جارحیت" کے مقابلہ کا بہانہ بنا کر فوجی مدد دی، تو اس کا شکار صرف ہندوستان رہا۔ پاکستان میں اقتدار جس کے ہاتھ بھی رہا

اس کی پالیسی کے بنیادی ڈھانچہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اور یہ بنیاد یہ ہے کہ فوجی طاقت میں پاکستان ہندوستان کے برابر ہو، بلکہ اس سے بھی برتر۔ پہلے تو فوجی حکمران ہندوستان کے تئیں دشمنی کا رویہ اختیار کرتے تھے۔ انھوں نے جنگ کی تیاریاں بھی کیں اور جنگیں لڑیں بھی۔ مگر اب کی بار فوجی حکومت نے ہندوستان کے تئیں اپنے رویہ میں ظاہرا طور پر خوبصورتی لائی ہے۔ جنرل ضیا ہندوستان کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کے لیے ایک ان تھک مہم چلا رہے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی فوج کو تازہ ترین ہتھیاروں سے لیس بھی کرتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان کے تئیں امن کی ان باتوں کی خاص طور پر دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ پاکستان امریکی کانگریس کے ان حلقوں کو خوش کرنا چاہتا ہے جو ہندوستان کے ساتھ تعلقات معمول پر نہ لانے کی صورت میں، امریکہ کی طرف سے پاکستان کو ہتھیاروں کی سپلائی میں روڑے اٹکائیں گے۔ یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۸۱ء میں جنرل ضیا نے جو ہندوستان کو نا جنگ معاہدہ کی پیش کش کی وہ پاکستان کے لیے تین عشاریہ دو بلین ڈالر کی مالیت کی فوجی اور اقتصادی امداد کے سلسلے میں امریکہ اور پاکستان کے درمیان ہوئے سمجھوتے کی ایک شرط تھی۔ ورنہ پاکستان کو ہندوستان کے ساتھ اپنے مجموعی تعلقات نارمل بنانے کا کوئی ارادہ نہیں اور اس کا ثبوت ان کے اس ردعمل سے مل جاتا ہے جو انھوں نے ہندوستان کی اس تجویز کے جواب میں ظاہر کیا کہ دو ملکوں میں امن اور دوستی کا ایک مفصل معاہدہ کیا جائے۔ مزید ثبوت حال کے اس تجربہ سے بھی ملتا ہے کہ جب بھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات بہتر بنانے کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے تو اس کے فوراً بعد پاکستان کی طرف سے کوئی ایسی اشتعال انگیز کارروائی کی جاتی ہے جس سے حالات پھر سے خراب ہو جاتے ہیں۔ ایسا اس وقت ہوا جب کچھ سال پہلے آغا ہلالی نے انسانی حقوق سے متعلق کمیشن کی میٹنگ میں کشمیر کا مسئلہ اٹھایا اور ابھی سنہ ۱۹۸۴ء میں اس وقت ہوا جب پاکستانی حکام نے اکالی انتہا پسندوں کی حوصلہ افزائی کی جو ہندوستان اور بیرونی ممالک میں ہندوستان دشمن کارروائیوں میں سرگرم تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان امریکہ کی فوجی حکمت عملی کے منصوبوں کے ساتھ اس حد تک وابستہ ہو گیا ہے کہ اس کی خارجہ پالیسی انہی منصوبوں کے مطابق ترتیب دی جا رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایران۔عراق جنگ میں، پاکستان کو، امریکہ کے کہنے پر، عراق کی طرف سے مداخلت کرنا پڑے۔ یا افغانستان اور پاکستان کی سرحد پر تصادم سنگین صورت اختیار کرے۔ ان حالات میں پاکستان کو دو محاذوں پر لڑنا پڑے گا، مشرقی محاذ پر ہندوستان کے اور مغربی محاذ پر افغانستان کے ساتھ۔ پاکستان ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ امن کی باتیں کر رہا ہے۔ ورنہ پاکستان کے صاحب اقتدار لوگوں کے لیے ہندوستان کی

صورت وہی ہے، جس صورت میں انھوں نے آج تک اس کو دیکھنا پسند کیا۔ اس لیے افغانستان کے بارے میں اتنے شور و غل کے باوجود پاکستانی فوج کا بہت بڑا حصہ ہند۔ پاک سرحد پر تعینات ہے۔

جدید ترین ہتھیار حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان اب بہت تیزی کے ساتھ نیوکلیائی صلاحیت حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے جیسا کہ مصدقہ پریس رپورٹروں اور پاکستان کے سائنسداں عبدالقادر کے دعوا سے ظاہر ہوتا ہے۔ ستر کی دہائی کے آغاز میں امریکہ اس بات کے خلاف تھا کہ پاکستان نیوکلیائی بم حاصل کرلے۔ مگر اسی دہائی کے اختتام پر امریکہ کے ساتھ پاکستان کے رابطوں کی بحالی کے بعد امریکہ پاکستان کی نیوکلیائی ارادوں کا رازداں بنا ہے۔ اس کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ امریکہ نے سیمنگ ٹن ترمیم کو پاکستان کے معاملہ میں لاگو نہیں کیا۔ اس کے تحت وہ ملک امریکی اقتصادی امداد حاصل نہیں کرسکتے جو نیوکلیائی بم بنانے کی کوشش میں لگے ہوں۔ جنرل ضیا کی اس بات پر کوئی یقین نہیں کرتا کہ نیوکلیائی توانائی پرامن مقاصد کے استعمال کے لیے ہے۔ جس انداز سے پاکستان نے اپنے نیوکلیائی پروگرام پر عمل کیا ہے، اس کو نظر میں رکھ کر کوئی بھی پرامن مقاصد کی ان باتوں پر یقین نہیں کرسکتا۔ پاکستان نے اسرائیل کے طریقہ پر عمل کیا اور نیوکلیائی سہولیات کا بنیادی ڈھانچہ تیار کرنے کے لیے درکار تمام لوازمات خفیہ طور پر حاصل کیے۔ بہت سے پاکستانیوں پر مغربی ملکوں میں اس الزام پر مقدمہ چلائے گئے کہ وہ پاکستان میں نیوکلیائی سہولیات قائم کرنے کے لیے غیر قانونی طور پر مشینیں اور دوسرا سازوسامان فراہم کررہے تھے۔ اپنے اس پروگرام پر پردہ ڈالنے کے لیے پاکستان اس تجویز کی حمایت کرتا آیا ہے کہ جنوبی ایشیا کو نیوکلیائی ہتھیاروں سے آزاد علاقہ بنایا جائے۔ اس کو پوری طرح معلوم ہے کہ جب تک چین اس تجویز کو قبول نہیں کرتا، یہ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر ہندوستان کی پریشانی حق بجانب ہے۔ پاکستان کے پاس ایف۔ ۱۶ ہوائی جہاز ہیں جن میں نیوکلیائی ہتھیار لے جانے کی صلاحیت ہے۔ اس وجہ سے ہندوستان کے لیے نیوکلیائی خطرہ ایک سنگین صورت اختیار کرتا ہے۔ نیوکلیائی بم صرف ہندوستان ہی کو بلیک میل اور ڈرانے دھمکانے کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا بلکہ دوسرے ہمسایہ ملکوں کو بھی پاکستان کی فوجی حکومت کی غیر مقبولیت دیکھ کر ایسے امکان کو خارج از بحث قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ہندوستان کی طرف سے خیالی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے بیرونی ملکوں کی مدد پر پاکستان کا انحصار پچھلے تیس برسوں کے دوران میں اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ اب مکمل طور پر امریکہ کی اس خطہ کی فوجی حکمت عملی کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے آغاز میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے امریکہ پر پاکستان کے اس مکمل انحصار کے رجحان کو بدلنے کی اور چین کے ساتھ ناطہ جوڑنے کی کوشش کی تھی ۔ چین بھی اس کے لیے پوری طرح سے رضامند تھا اس لیے دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے اور چین نے پاکستان کو ہندوستان کے

خلاف سیاسی اور فوجی امداد دی۔ بعد میں جنرل یحییٰ خاں نے ۱۹۷۰ء میں امریکہ اور چین کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آنے کے عمل میں مدد کی۔ اس طرح سے امریکہ، چین اور پاکستان کے اتحاد کی بنیاد پڑی جو صرف روس کے خلاف نہیں تھا بلکہ ہندوستان کے بھی۔ اس کا اظہار ۱۹۷۱ء کی ہند۔ پاک جنگ کے دوران ہوا۔ لیکن چین کے ساتھ دوستی کا جو مقصد تھا، یعنی امریکہ پر انحصار کم ہو، وہ پورا نہیں ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چین اور امریکہ عالمی معاملوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر روس اور دوسری ترقی پسند قوتوں کے خلاف کام کر رہے تھے۔ اس لیے پاکستان کے لیے بھی ان کا ساتھ دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ اس کے علاوہ بھٹو کے جانے اور ضیاء کے آنے کے بعد پاکستان میں متبادل راہیں تلاش کرنے کی نہ تو خواہش رہی اور نہ اس کی کوشش کی گئی۔ یہ بات شک آور ہے کہ جنرل ضیا کو خارجہ پالیسی میں کوئی خود مختاری حاصل ہے۔ اور اس سے جنوب اور جنوب مغربی ایشیا میں امن اور سلامتی کے لیے خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔

دوسرا حصّہ

پاکستان اسٹیٹ کی ہیئت

۵۔ پاکستان کی مملکت کا کردار اور اقتدار کے لیے جدوجہد

فیروز احمد

(۱)

پاکستان میں بار بار فوج کی طرف سے تختہ الٹ دیئے جانے کے بعد اقتدار پر قبضہ کرنے کے واقعات اور موجودہ فوجی حکومت کے اتنی طویل مدت تک قائم رہنے کی وجہ سے اس بات پر سنجیدہ غور و فکر ہوا ہے اور ہو بھی رہا ہے کہ اس ملک میں جمہوری ادارے استحکام حاصل کرنے میں ناکام کیوں رہے اور جمہوری قوتیں ضیاالحق کی حکومت کو ہٹانے میں کامیاب کیوں نہ ہوئیں؟ اسی غور و فکر کے ایک حصّہ کے طور پر میں نے اور میرے ساتھیوں نے ان فوری اسباب کا جائزہ لینے کی کوشش کی جن کی بنیاد پر پاکستان کی موجودہ فوجی حکومت اتنی دیر تک قائم رہ سکی ہے۔ ہم نے فوج کی طاقت و مضبوطی، اقتصادی پہلو اور بیرونی حمایت جیسے خارجی عناصر کا بھی جائزہ لیا اور حزب اختلاف اور سماجی اداروں کی کمزوریوں جیسے داخلی عناصر کا بھی۔ مگر اس تجزیہ میں اس سوال کو زیر غور نہیں لایا گیا جس کو بنیادی سیاسی ڈھانچہ کہا جاتا ہے یعنی پاکستان کا نظام سیاست اور طبقاتی ساخت کی وہ خصوصیات جن کی وجہ سے فوج اور بیوروکریسی سیاسی اقتدار کو غصب کر سکے۔

پاکستان کی نہ صرف موجودہ سیاسی صورت حال بلکہ تمام سماجی اور سیاسی عوامل کا جائزہ لینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہاں کے طبقاتی ڈھانچہ اور نظام سیاست کے کردار کو سمجھا جائے۔ اس مقالہ میں ہم اپنی گفتگو پاکستان کے طرز نظام کی خصوصیت تک محدود کریں گے جس کا تعلق اقتدار کی موجودہ جدوجہد سے ہے۔

پاکستان کے طرز حکومت کے بارے میں تجزیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ پاکستان کی سیاسی تبدیلیوں کا مشاہدہ کرنے والے مبصروں نے بہت پہلے یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ فوج اور بیوروکریسی کو اتنے زیادہ اختیارات حاصل ہیں کہ انہیں محض صاحب جائیداد طبقوں کے اقتدار کا تحفظ کرنے کا آلۂ جبر و انتظام نہیں مانا جا سکتا۔ پاکستان کی بائیں بازو کی پارٹیاں تو اس بحث و مباحثہ میں الجھی رہیں کہ پاکستان کی سماجی حیثیت جاگیردارانہ ہے،

نیم جاگیر دارانہ یا سرمایہ دارانہ، لیکن علوی نے حکومت سے متعلق مارکسی نقطہ نظر کی روشنی میں فوج اور بیوروکریسی کا نظریاتی طور پر جائزہ لینے کی پہلی سنجیدہ کوشش کی۔ پاکستانی پیپلز پارٹی (پی پی پی) نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے سلسلہ میں ضیاء منشور میں نوآبادیاتی دور سے ورثہ میں حاصل ہوئے نظام کو "جاگیردارانہ، فوجی اور بیوروکریٹک" قرار دیا اور اس نظام کی بعد کی ترقی یافتہ شکل کو جدید نوآبادیاتی تسلط کے پس منظر میں "ماتحت سرمایہ دارانہ" قرار دیا۔ فوج کی طرف سے اقتدار پر قبضہ کرنے کے واقعات اور غیر فوجی بیوروکریسی کے ہاتھوں مسلسل طور حد سے زیادہ طاقت اور اختیارات ہونے کی وجہ سے سرگرم سیاسی کارکن اور عالم دونوں طبقاتی حکومت کے تصور اور فوج اور بیوروکریسی کے تسلط کے درمیان رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے چنانچہ پاکستان کے نظام سیاست کے بارے میں ایک جامع نظریہ ابھر کر سامنے آیا ہے اور علمی اور سیاسی دونوں حلقوں میں یہ مقبول ہوا ہے۔ ضرورت سے زیادہ تسہیل کے اندیشہ کے باوجود اس نظریہ کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے: برطانیہ کی نوآبادیاتی حکومت نے برصغیر کے دیسی طبقوں کو برطانوی بورژوا مفادات کے تابع کر دیا۔ اس لئے فوج، بیوروکریسی اور حکومت کے دوسرے آلے اس طرح کام کرنے لگے، جیسا کہ مارکس نے ایک ادارہ کی حیثیت سے مملکت کے بارے میں اپنی تھیوری میں کہا تھا۔ انہوں نے حکومت کو ایک طبقہ کی طرف سے دوسرے طبقہ پر برتری حاصل کرنے کا ایک انتظام قرار دیا تھا۔ اس لئے فوج اور بیوروکریسی وغیرہ نے برطانوی بورژوا مفادات کی حفاظت کے لئے ایک انتظامی کمیٹی کا رول ادا کیا۔ لیکن جب نوآبادیاتی حکمرانی ختم ہوئی تو فوج کے پاس بے پناہ طاقت تھی یا یوں کہ پاکستان میں صاحب جائداد طبقوں کے مقابلہ میں وہ "زیادہ ترقی یافتہ" تھے۔ فوج کی اس ابتدائی برتری میں، پاکستان کے حکمران طبقہ کی طرف سے امریکہ کی رہنمائی میں جدید نوآبادیاتی نظام پر مسلسل انحصار سے اضافہ ہوا اور ان کو حکومت پر اپنا تسلط قائم کرنے میں مدد ملی بلکہ یہ حکومت صرف ایک طبقہ کی نمائندہ نہیں ہے۔

بورژوا اور زمینداری دونوں طبقوں کو ان پیداواری رشتوں کی تعداد بڑھانے میں فوج اور بیوروکریسی پر انحصار کرنا پڑتا ہے جن سے ان کے طبقاتی مفاد محفوظ رہتے ہیں۔ اِن بااثر طبقوں کے درمیان تنازعوں میں مصالحت کے لیے بھی فوج اور بیوروکریسی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ خود فوج اور بیوروکریسی اگرچہ ان طبقوں سے آزاد یا علیحدہ نہیں مگر چونکہ حکومت کو ان طبقوں سے جن کی وہ نمائندگی کرتی ہو، بالاتر ہو کر ایک خود مختار طاقت کے طور پر کام کرنا پڑتا ہے، اس لیے کبھی کبھی فوج اور بیوروکریسی ایسے بھی عمل کرتی ہے جو ان غالب طبقوں کی مرضی سے مختلف ہوتا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں سرمایہ دارانہ طبقہ کی مرضی کے خلاف فوجی کارروائی اس ضمن کی ایک اچھی مثال ہے۔ حالانکہ سول بیوروکریسی کی مدد سے فوج نے سیاسی پارٹیوں کو تباہ کرنے کی باقاعدہ کوشش کی ہے تاکہ سماج کا وہ طبقہ جنہیں تمام رعائتیں حاصل ہیں، اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے مکمل طور پر ان پر انحصار کریں مگر حکومت کے ڈھانچہ کے اندر اور ان اعلیٰ طبقوں اور عوام الناس کے

درمیان تضادات برقرار رہیں جس سے ایک نمائندہ غیر فوجی سرکار قائم کرنے کی تحریک کے لیے وسائل حاصل ہوتے رہے۔

پاکستان کی طرزِ حکومت کے بارے میں اوپر بیان کئے گئے اس نظریہ یا اس کی جداگانہ صورتوں سے اگرچہ مفلوج نظریئے ختم کرتے ہیں مدد ملی ہے جو طبقوں اور معاشرے کے غلط اور ناپختہ تجزیوں سے سامنے آئے تھے مگر یہ پاکستان کے سیاسی نظام کے موجودہ بحران کو سمجھنے کے لیے ناکافی ہے۔ بڑے بڑے اقتصادی، سماجی اور سیاسی واقعات کی تو خبر بات ہی نہیں۔ اس نظریہ میں جو، ہماری رائے میں، بڑی خامیاں ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ اس میں طبقات کو پیداواری رشتوں کی صورت میں دیکھا گیا ہے یا زیادہ سے زیادہ اجناس کی گردش کو بھی زیرِ غور لایا گیا۔

۲۔ اس میں مختلف طبقوں کے درمیان اور حکومت اور طبقوں کے درمیان رشتوں کو جامد مان لیا گیا ہے۔

۳۔ داخلی عناصر کو نظر انداز کیا گیا ہے، خاص طور پر حکومت کے کردار کی تشکیل میں اور سیاسی نظام کی صورت گری میں جدید نوآبادیت کی سرگرم مداخلت کو۔

۴۔ علاقائی مسئلوں کے بارے میں کہیں کہیں اشاروں اور کنایوں کے باوجود اس میں پاکستان کی حکومت اور معاشرہ کو نسلی اعتبار سے یکساں مان لیا گیا ہے۔

اس مقالہ میں ہم پاکستان کے سیاسی نظام سے متعلق ٹھوس حقائق اور واقعات کا حوالہ دے کر یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ جدید نوآبادیاتی حکومتوں کے نظریہ میں ان چار پہلوؤں، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، کی کتنی اہمیت ہے۔

سروس بورژوازی

طبقہ کی تعریف سے تعلق بحث و مباحثہ شاید کبھی ختم نہ ہوگا۔ لیکن سماجیات کے عالموں اور سیاسی تجزیہ کرنے والوں کو سماج اور سیاست کا تجزیہ کرنے کا کام باقاعدگی سے جاری رکھنا چاہیے اور ان تمام نزاکتوں کا خیال رکھنا چاہیے جو پیچیدہ انسانی سماج کو سمجھنے کے علوم کے مطابق ہوں حالانکہ ان علوم میں کوئی بات مطلق طریقہ سے نہیں کہی جا سکتی کیوں کہ انسانی سماج کی ساخت نہایت پیچیدہ ہے اور ہم اس کے بارے میں ہر بات پوری قطعیت سے نہیں کہہ سکتے۔ اگر کسی مفروضہ پر چوکھٹا زیادہ موزوں ہے جس میں کچھ خصوصیات کا تجزیہ زیادہ قابلِ فہم طریقہ سے کیا جا سکتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ہم تصورات کی تشکیل کرنے والوں اور نظریہ قائم کرنے والوں کی دوسری باتوں سے بھی چمٹے رہیں اور ان کو نئے سرے سے تشکیل دینے یا دوسرے نظریوں سے کچھ اصول ادھار لینے کو غلط مان لیں۔ اس وقت ہمارے ذہن میں طبقہ کا مارکسی تصور ہے جس کو عام طور پر پیداواری رشتوں میں ایک امتیازی نظریہ تصور کیا جاتا ہے۔ مارکس نے جو تاریخ کی مادی توضیح کی ہے اس میں ذرائع پیداوار کے مالکوں اور ان کے ماتحت براہ راست پیداوار پر دسترس رکھنے والوں کے درمیان ہر عہد میں کشمکش کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن خود مارکس نے ہر تاریخی دور میں دوسرے طبقوں کے رول کے وجود سے انکار نہیں کیا۔ مارکس کے مطابق جاگیردارانہ نظام ٹوٹنے کی بنیادی وجہ زمینداروں اور کسانوں کے درمیان کشمکش سے زیادہ مقتدر جاگیردارانہ طبقہ اور بورژوازی جو جاگیردارانہ نظام کے بطن ہی سے پیدا ہوئے تھے کے درمیان کشمکش ہے۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں سیاسی سماجیات کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے بار بار دوسرے طبقوں کی نشاندہی کا مسئلہ آیا ہے اپنی معنوی

ہیں جن میں یہ طبقے مارکسی تواریخ اور انیسویں صدی کی یورپی سرمایہ داری کے مارکسی تجزیہ میں ظاہر ہوئے ہیں۔ بہت سے افریقی ممالک میں سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقوں کی غیر موجودگی اور حکومت، بیوروکریسی کا تسلط جدید مارکسی عالموں کیلئے ایک بڑا مسئلہ بنا رہا ہے۔ لیکن کسی ایک خاص نظریہ پر دارومدار کرنیوالے اور "عالمی نظام" سکول سے تعلق رکھنے والوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کا ایک آسان طریقہ ڈھونڈ لیا۔ وہ یہ کہ "مرکز" کے بورژوازی کو مرکز کے ارد گرد "علاقوں" کا بھی حکمران طبقہ مان لیا اور تیسری دنیا کے حکمران طبقوں اور مقتدر لوگوں کو ایک انضمامی اور طفیلی رول دیا۔ مگر ہم مانتے ہیں کہ کم از کم پاکستان کے سلسلہ میں یہ بات درست نہیں ہے۔ اس لیے یہ نظریے اور ان کے اصول ہمیں وہ ٹھوس مسئلے سمجھنے میں بھی مدد نہیں دیتے جن کا ہمیں سامنا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم اپنی تفتیش و تلاش میں نظریاتی اور مجرد خیالات کا سہارا تو لیں لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم ٹھوس حقائق اور عملی واقعات کو سامنے رکھ کر زیادہ بامعنی اصول اور نظریات وضع کریں جو ایک مخصوص سماج یا سماجوں کے ایک ہم قسم گروپ کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کریں۔

آیئے اب ہم ٹھوس حقائق کی طرف واپس آئیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سروس سیکٹر پاکستان کی جی، ڈی، پی یعنی مجموعی ملکی پیداوار (گراس ڈومسٹک پروڈکٹ) کے سب سے بڑے حصہ پر مشتمل ہے اور اس حصہ میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے یہاں تک کہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں یہ ۴۶ فی صدی ہو گیا۔ اس کا ایک بڑا حصہ سرکاری خدمات اور ٹھیکوں پر مشتمل ہے اور باقی جو رہتا ہے اس کے بیشتر حصے کا انحصار سرکاری پرمٹوں اور ضابطوں پر ہے جس کو بھی حکومت پر کنٹرول ہے یا حکومت تک رسائی ہے وہ سروس سیکٹر سے بے پناہ منافع حاصل کر سکتا ہے۔

اس رسمی سروس سیکٹر کے علاوہ ایک بہت بڑی خفیہ معیشت بھی موجود ہے جسے چلانے والوں کو نہ صرف نچلی سطح کے بدعنوان سرکاری کارندوں کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے بلکہ اونچی سطح تک رسائی کی بھی تاکہ وہ محفوظ بھی رہیں اور پھلیں پھولیں بھی۔ سماج کے ایک بڑے طبقہ کا دارومدار انہی سیکٹروں پر ہے اور بہت سے امیر ترین اور طاقت ور افراد اور گروپ ایسے ہیں جو معیشت کے اجناس کے سیکٹروں میں کبھی کسی چیز کے مالک نہیں رہے ہیں۔ ہم یہاں روایتی تاجرانہ بورژوازی کی بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ سرکاری سروس، مختلف قسم کے ٹھیکیداروں اور سپلائیر، زمین کا کاروبار کرنے والوں، دلال اور سٹہ بازوں، ہزاروں قسم کے کمیشن ایجنٹوں، انٹرنیشنل سلسلہ کے فائیو سٹار اور فور سٹار ہوٹلوں کے ملکی مختاروں، ٹریول ایجنٹوں، باہر کے ملکوں کو افرادی قوت سپلائی کرنے والوں، ان لوگوں کی جن کو سرکار کی طرف سے زمینیں الاٹ ہوتی ہیں اور تجارتی اور صنعتی لائسنیں حاصل ہوتی ہیں اور جو ان پرمٹوں کو بیچ کر منافع کماتے ہیں، فرضی مشاورتی فرمیں چلانے والوں، بڑے بڑے شہروں کے ٹرانسپورٹروں کی، جو ہر قانون توڑتے ہیں اور ٹیکس نہیں دیتے، سمگلروں کی، اونچی سطح کی رنڈی بازی اور جعلی پاسپورٹ تیار کرنے والوں کی بات کر رہے ہیں۔ جدید نو آبادیاتی معیشت میں ایسی سروسز کی بے جا فراوانی ہوتی ہے جن کا پیداواری قوتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور جو [illegible] ہونے کی بات

منڈی کے قوانین کے تحت نہیں آتی۔ ان کاموں میں بہت دولت ہے۔ دولت سے اثر ورسوخ بڑھ جاتا ہے اور اثر ورسوخ سے مزید دولت۔ اور یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ اگر موجودہ نظام زندہ رہنا ہے تو حکومت کو کاروبار کے ان سماجی رشتوں کی بھی حفاظت کرنا ہوگی۔

شاید اس طبقہ کا بھی کوئی نام ہونا چاہیے۔ ایک نیا نام گھڑ دینے کے بدلے ہم اس طبقہ کو "سروس بورژوازی" کہنے کو ترجیح دیں گے۔ یہ اصطلاح فرانتس فانان نے وضع کی ہے۔ فوج اور بیوروکریسی کے اعلیٰ افسروں کو اس طبقہ میں اونچا مقام حاصل ہے اور بہت سے ریٹائرڈ فوجی افسر اور موجودہ افسروں کے رشتہ دار اس طبقہ کے سرکردہ ممبر ہیں۔ اس طرح سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ فوج اور بیوروکریسی صرف "زیادہ ترقی یافتہ" نہیں ہیں اور نہ وہ صرف مملکت کے نسبتاً خود مختار انتظامی اور جابرانہ آلے ہیں جو ملکی اور صاحب جائداد طبقوں کے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کے درمیان تنازعوں کو نمٹانے کے لیے مصالحتی رول انجام دیتے ہیں۔ بلکہ وہ اس طبقہ کے لیڈر ہیں اور وہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اپنے طبقاتی مفادوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ جدید نوآبادیت کے ساتھ اتحاد بھی انہوں نے سوچ سمجھ کر کیا ہے تاکہ ان کے طبقاتی مفاد پورے ہو جائیں۔ بہرحال حکومت میں ان کے کام کاج اور اقتدار اعلیٰ کی وجہ سے ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ خاص قسم کے تجزیوں کے لیے ان کو اپنے طبقہ سے الگ کیا جائے۔ اسی طرح مخصوص تجزیوں کے لئے اس طبقہ کے اندر موجود کچھ حصوں یا گروپوں کو بھی علیٰحدہ کیا جانا چاہیے جن میں پیشہ ورانہ کام کرنے والا متوسط طبقہ اور کاروباری بورژوا شامل ہیں۔ اگرچہ متوسط طبقہ، ادنیٰ بورژوازی اور کمپراڈور بورژوازی کے ہم معنی نہیں۔ سروس بورژوازی ادنیٰ بھی ہو سکتا ہے اور بڑا بھی کمپراڈور تو یہ ہر حال میں ہے ہی۔ لیکن اس کی صرف یہی خصوصیات ہیں۔ سروس بورژوازی کا بڑا رول جدید نوآبادیاتی تسلط کو ملک میں عیاں صورت دے کر ظاہر کرنا اور ملکی پیداواری قوتوں کو ختم کرنا ہے۔

طبقاتی یک جہتی اور حکومت اور طبقوں کے درمیان رشتہ

سروس بورژوازی طبقہ کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ یہ طبقہ بالکل الگ تھلگ اور اس حد تک جداگانہ نہیں ہے کہ کوئی اور طبقہ اس کی حدبندیوں کے اندر نہیں جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طبقہ کے لوگ بھی اس سیکٹر کی طرف کھنچتے چلے آرہے ہیں جو روایتی طور پر پیداواری ذرائع کے مالک رہے ہیں۔ اس کی وجہ جدید نوآبادیاتی نظام کی وہ خصوصیت ہے کہ پیداواری سرگرمیوں کو ختم کر کے غیر پیداواری اور طفیلی سرگرمیوں کو فروغ ملے۔ دوسری وجہ سروس سیکٹر کا بے پناہ منافع ہے۔ یہ بات کسی سے چھپی نہیں کہ

کے صنعتی سرمایہ دار طبقہ نے بھی اس سیکٹر کو ترجیح دی ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں روایتی زمیندار طبقہ کے افراد نے بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس سیکٹر میں سرگرم حصہ لینا شروع کیا اور ستر کی دہائی کے وسط تک اس سیکٹر میں ان کے مفادات بہت حد تک بڑھ گئے۔ ہم یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کر رہے ہیں کہ بہت فوجی اور غیر فوجی افسروں کا تعلق پنجاب اور شمالی مغربی سرحدی صوبے کے زمیندار طبقہ سے رہا ہے بلکہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تمام چار صوبوں کے زمیندار خاندان بہت بڑے پیمانہ پر اس سیکٹر کے ساتھ وابستہ رہے ہیں جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ روایتی بڑے زمینداروں میں سے مشکل سے ہی کوئی ایسا ہوگا جس کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ سرکاری سروس کاروبار، حتیٰ کہ سرکاری صنعتوں سے حاصل نہ ہوتا ہو۔ با اثر طبقوں، گروپوں کے سروس سیکٹر کی طرف جھکاؤ کے علاوہ ایک طرف سروس بورژوا طبقہ کے عروج اور دوسری طرف صنعتی سرمایہ دار طبقہ کے زوال سے سروس بورژوا طبقہ کے مفادات کو ان بنیادی مفادوں کی صورت حاصل ہوگئی جن کو پورا کرنا حکومت کے لیے ضروری ہو گیا۔ پاکستان کا جیسا طرز نظام صرف پیداوار کے موجودہ سماجی رشتوں کی حفاظت ہی نہیں کرتا اور مختلف با اثر طبقوں اور ان طبقوں کے گروپوں کے درمیان مصالحتی کام ہی انجام نہیں دیتا بلکہ معاشی ترقی میں اپنے رہنمایانہ رول، زمین اور دوسرے پیداواری ذرائع کے ایک بڑے حصہ پر اپنی ملکیت اور اپنی خود مختار طاقت کی وجہ سے یہ نظام با اثر طبقوں کی کایا پلٹ کرنے اور ان میں یک جہتی پیدا کرنے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ یہ تو ہم نے پہلے ہی واضح کر دیا کہ صنعتی سرمایہ دار طبقہ، زمیندار طبقہ اور سروس بورژوازی کا جھکاؤ سروس سیکٹر کی طرف رہا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ زمینیں مہیا کر کے اور ان کو کسی قیمت کے بغیر ترقی دے کر فوجی اور سول افسر زمیندار بن گئے۔ کچھ صنعت کاروں نے بھی ٹیکسوں سے بچنے کے لیے زرعی زمینیں خریدی تھیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے ان زمینوں کو ترقی دے کر ان کو میوہ باغوں، ڈیری فارموں اور مویشیوں کے فارموں میں تبدیل کر دیا ہے۔ زمین کی ملکیت حاصل ہونے کے بعد زمین کے مالکوں کو ذرائع آبپاشی اور پانی کی تقسیم، دریاؤں کے نزدیک سرکاری زمین کے مفت یا تقریباً مفت استعمال، زرعی مشینری اور دوسرا ساز و سامان خریدنے کے لیے پرمٹ اور قرضوں، سرکاری ٹریکٹروں، بل ڈوزروں اور ٹیوب ویلوں کے ناجائز استعمال اور ان مختلف پالیسیوں کے لیے سرکار پر انحصار کرنا پڑتا ہے جن سے زرعی ساز و سامان اور زرعی پیداوار کی قیمتیں متاثر ہوں یا جن کا تعلق ٹیکسوں، محصول اور شرح تبادلہ سے ہو۔

فوجی افسر، بیوروکریٹ اور روایتی غیر زمیندار طبقوں کے دوسرے لوگ اگر ایک طرف زمینوں کے مالک بننے جا رہے ہیں تو دوسری طرف روایتی زمیندار طبقہ بھی زرعی پیداوار کے رشتوں میں جامد نہیں رہا ہے۔ اس بات پر بہت بحث و مباحثہ ہوتا رہا ہے کہ پاکستان کا زراعتی نظام جاگیردارانہ ہے، نیم جاگیردارانہ یا سرمایہ دارانہ؟۔ حقیقی معنوں میں جاگیردارانہ نظام کو صرف سندھ میں ترقی حاصل ہوئی اور شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب کے

کچھ حصوں میں اس کی ابتدا۔ جہاں تک زرعی نظام کا تعلق ہے تو اس کو نوآبادیاتی سرمایہ دارانہ نظام کے تسلط اور مداخلت کا سامنا رہا جس سے پیداوار کے رشتوں کی مخصوص صورتیں پیدا ہوئیں اور زمین اور کاشتکاروں پر زمینداروں کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ سرمایہ دارانہ طریقہ سے زرعی ترقی کی ابتدا ساٹھ کی دہائی کے وسط میں ہوئی مگر پیداواری رشتے رفتہ رفتہ بدل گئے۔ اوران کے بدلنے کا عمل مخصوص اور پیچیدہ رہا اور ہر علاقہ میں اس کی نوعیت مختلف رہی۔ کاشتکاروں اور غریب کسانوں کے حالات تو بدلے نہیں مگر زمینداروں نے بے شک زمینوں میں بنیادی سرمایہ لگایا اور وہ منڈی کی بات سامنے رکھ کر سوچنے لگے۔ زراعت کے جدید طریقوں سے جوں جوں نفع میں اضافہ ہوتا جائے گا، نئے اور پرانے دونوں طرح کے زمینداروں کی حکومت کی امداد و حمایت کی ضرورت بھی بڑھتی جائے گی۔ زرعی پیداوار میں زمیندار طبقہ کے بدلتے ہوئے رول اور سروس سیکٹر کے ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی وابستگی، دونوں سے، حکومت کے ساتھ اس طبقہ کا رشتہ اب صرف اس بات پر قائم نہیں کہ کسانوں کے مقابلہ میں اس کے طبقاتی غلبہ کی حفاظت کی جائے۔ وہ غلبہ تو مقامی نوعیت کا ہے۔ لیکن اس طبقہ کے جو نئے مفادات پیدا ہوئے ہیں وہ اس کو حقیقی سیاسی اقتدار میں ایک اہم حصہ حاصل کرنے کی تحریک دے رہے ہیں۔

جہاں تک صنعتی شعبہ کا تعلق ہے۔ یہ واحد شعبہ ہے جس کے ساتھ نہ صرف زمیندار اور سروس بورژوا دونوں نے وابستہ ہونے سے پس وپیش کیا ہے بلکہ خود کارخانہ داروں نے اپنے رول کو محدود کیا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کی پبلک (سرکاری) سیکٹر کے شعبہ کی حوصلہ شکنی کی پالیسی کے باوجود اور صنعتوں میں نجی سرمایہ کاری کے لیے ترغیبات مہیا کرنے کے باوجود ردعمل مایوس کن رہا ہے۔ پاکستان کے سابق بائیس بڑے سرمایہ دار خاندان سرمایہ لگانے اور اپنی انتظامی مہارت کے استعمال کے لیے بیرونی ملکوں کو ترجیح دیتے ہیں یا ملک میں ضروری استعمال کی چیزیں تیار کرنا پسند کرتے ہیں جن سے زیادہ نفع حاصل ہوتا ہے۔ ان کو ایک ایسی صنعتی بنیاد قائم کرنے میں دلچسپی نہیں جس سے حقیقی ترقی کی داغ بیل پڑ جائے اور معاشی آزادی حاصل ہو جائے۔ اگرچہ یہ طبقہ حکومت کی طرف سے بھاری صنعتوں کو ترقی دینے کی مخالفت کرنے کے اپنے نظریہ پر قائم ہے مگر طاقت کے توازن میں اس طبقہ کی حیثیت کمزور ہے اس لیے امکان یہ ہے کہ حکومت جو بھی حکمت عملی اپنائے گی یہ اس کا ساتھ دیں گے۔

اس تھیسز کے حق میں دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں کہ پاکستان کے بااثر طبقے ایک واحد حکمران طبقہ کی صورت اختیار کرنے کے عمل میں ہیں۔ مگر یہ عمل بہت طویل اور پیچیدہ ہوگا۔ یک جہتی اور اتحاد پر زور دینے سے شدید مقابلہ آرائی، رقابت اور تنازعوں کو جنم ملتا ہے۔ اس مسئلہ پر ہم اس وقت پھر بات کریں گے جب سیاسی اقتدار کے لیے جدوجہد کے ٹھوس سوال کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ حکومت کو صرف اس مسئلہ کا سامنا نہیں کہ الگ الگ اور جداگانہ طبقوں کے درمیان توازن قائم کرے اور ان کے درمیان

مصالحتی کردار انجام دے۔ بلکہ اسے ہمیشہ نئی ترتیب پاتے ہوئے اور ایک دوسرے سے خلط ملط ہوتے ہوئے طبقوں یا طبقوں کے حصوں کے درمیان اہل متحرک توازن قائم رکھنا پڑتا ہے۔

داخلی عناصر کا رول

حکومت کے نظام کے بارے میں جو تجزیئے کئے گئے ہیں ان میں بیشتر اس نظریہ کے مطابق ہیں جس میں اوپری ڈھانچہ سمجھنے کے لیے اقتصادی بنیاد کو اہمیت دی جاتی ہے اور ان میں داخلی عناصر کو بھی اور بنیاد اوپری ڈھانچہ کے درمیان تفاعلی رشتہ کو بھی نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جہاں تک پاکستان کے طرز نظام کے تجزیہ کا تعلق ہے ایسا لگتا ہے کہ فوج اور بیوروکریسی کے اتحاد کی حکومت کو اس صورت حال کا لازمی نتیجہ قرار دیا گیا ہے جس میں نوآبادیاتی اور جدید نوآبادیاتی طاقتیں سیاسی نظام پر چھائی ہوں، ملکی بورژوازی کمزور ہوں، اور بیوروکریسی اور فوج "زیادہ ترقی یافتہ" اور ملکی صاحب جائیداد طبقہ سے مقابلتاً خود مختار ہوں۔

مگر ہمارا خیال ہے کہ پاکستانی فوج کے اقتدار اعلیٰ کے لیے صرف یہ خارجی حالت ذمہ دار نہیں کہ مرکز اور علاقوں کے ڈھانچہ کے رشتوں میں پاکستان کے مقتدر طبقوں نے جدید نوآبادیت کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں، جس پر سامراجیت کا غلبہ ہے۔ اگر پاکستان کی اقتصادی حالت وہی ہوتی جو تھی اور ملکی صاحب جائیداد طبقوں اور فوج اور بیوروکریسی کی طاقت اور کمزوریاں بھی وہی ہوتیں جو تھیں تو ایک مختلف قسم کے سیاسی نظام کی تشکیل ہوتی ہوتی اگر امریکہ نے پاکستان کی طرز حکومت کے کردار اور طاقت کے توازن کی تشکیل میں جان بوجھ کر مداخلت نہیں کی ہوتی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ نے، جو اپنے با اثر جدید نوآبادیاتی رول سے واقف تھا، باقاعدہ طور پر ایک خاص سماجی اور سیاسی منصوبہ کے تحت اس بات کی کوشش کی اور اس کے لیے مدد بھی فراہم کی کہ تیسری دنیا کے ملکوں کی فوج اور بیوروکریسی کے ایسے مفادات پیدا ہوں جن سے جدید نوآبادیاتی نظام کا تحفظ یقینی بنے۔ امریکی خارجہ دفتر نے سماجیات کے عالموں کی خدمات حاصل کیں تاکہ وہ "قومی تعمیر" میں فوج اور بیوروکریسی کے رول پر تحقیق کا کام انجام دیں۔ پاکستان میں امریکہ کو یہ خاص دلچسپی تھی کہ فوجی حکمت عملی میں پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن بہت اہم ہے اس لیے امریکہ نے نہ صرف پاکستان کے حکمراں طبقہ کے ساتھ دوستی قائم کی بلکہ اس نے پاکستان کی فوج کو ملک میں سیاسی استحکام پیدا کرنے کے لیے سب سے بڑی طاقت کے روپ میں دیکھا۔ اور اس نے فوج کی بالادستی کے لیے باقاعدہ طور پر کام شروع کیا۔ آج بھی ضیاء کی فوجی ڈکٹیٹر شپ کی مضبوطی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ امریکہ براہ راست طور پر مداخلت کر رہا ہے اور مخالف سیاسی پارٹیوں کو یہ مشورہ دے رہا ہے کہ وہ کوئی ایسا حل تلاش کریں جس کے تحت وہ بھی فوج

کے ساتھ اقتدار میں شامل ہو جائیں۔ فوج کو سیاسی لحاظ سے کمزور کرنے کے لیے جو بھی امکانات پاکستان کے سیاسی اقتدار کے ڈھانچے کے موجود ہیں ان کو بہت حد تک امریکہ کی براہ راست مداخلت سے ختم کیا جاتا ہے۔

دوسرا "داخلی عنصر" جس نے پاکستان کے طرز نظام کے کردار کا تعین کرنے میں، خاص طور پر فوج کی طرف سے اقتدار حاصل کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے، وہ ہے ہندوستان کے ساتھ تعلقات میں پاکستان کا دشمنانہ رویہ۔ پاکستان کے وجود اور دو ملکوں کے درمیان جھگڑوں کی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ پاکستان کی تاریخ، ہندوستان سے خوف کے وہم کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ ہے ان کوششوں کی جو پاکستان نے اپنی مملکت، اپنے معاشرہ، اپنے تمدن اور نظریات کو ہندوستان سے الگ بلکہ ضد کے طور پر ظاہر کرنے کے لیے کی ہیں۔ اس طرح کے ردعمل اور نظریات نے معاشرہ کو فوجی رنگ دینے کے لیے اور امریکہ کے ساتھ اتحاد کے لیے ایک مقصد کا کام دیا۔ اگر پاکستان کا طبقاتی ڈھانچہ وہی ہوتا جو ہے، عالمی معیشت اور فوجی اعتبار کی عالمی حکمت عملی میں وہی پوزیشن ہوتی جو ہے، مگر ہندوستان کے ساتھ دائمی دشمنی کا رویہ نہیں رہا ہوتا تو شاید آج پاکستان میں فوج اور غیر فوجی معاشرہ کے درمیان مختلف قسم کا تعلق ہوتا۔

ایک اور "داخلی عنصر" جس کا پاکستان میں فوجی اور بیوروکریسی کی حکمرانی کو مضبوط بنانے میں دخل رہا ہے، رفیوجی آبادی کا ہے۔ تقسیم کے بعد جو سرمایہ دار طبقہ ابھر کر سامنے آیا اور جو ایوب خاں کی مطلق العنانیت کے دور میں خوب پھل پھول گیا، وہ فوج اور بیوروکریسی کے مقابلہ میں کمزور تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کی تعداد کم تھی اور نہ اس لیے کہ ان کا تجربہ مقابلتاً کم تھا بلکہ اس لیے کہ یہ گجراتی بولنے والے مہاجرین پر مشتمل تھا۔ یا اس میں وہ پنجابی شامل تھے جن کا کاروبار تقسیم سے پہلے پنجاب کے باہر رہا تھا۔ ان سرمایہ داروں کی چونکہ پاکستان میں کوئی بنیاد موجود نہیں تھی اس لیے انھوں نے سیاسی نظام کے ذریعہ کام کرنے کے بدلے اور ایک نمائندہ سیاسی پارٹی قائم کرنے کے بدلے بیوروکریسی اور فوج پر دارومدار کرنا پسند کیا۔ اسی طرح مسلم لیگ کے بہت سے لیڈر ایسے تھے جنہوں نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی تھی مگر جن کی پاکستان میں کوئی بنیاد موجود نہیں تھی۔ اس لیے وہ بھی سیاسی طور پر زندہ رہنے کے لیے بیوروکریسی پر انحصار کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان کے علاوہ اردو بولنے والے رفیوجی تھے۔ انھیں اپنے بارے میں عجیب و غریب قسم کے خیالات تھے ان کا خیال تھا کہ وہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے پاکستان بنایا گیا ہے جبکہ پاکستان کے وجود کے ابتدائی برسوں میں اردو بولنے والے بیوروکریٹ بااثر عہدوں پہ فائز تھے اس لیے ان کو سندھ کی مقامی آبادی کے مفادات کی قیمت پر بہت سی رعائتیں حاصل تھیں اور یہ لوگ تب تک غیر جمہوری انتظام سے مطمئن تھے جب تک ایوب خاں نے ان کے مفادات پہ ایک کاری ضرب لگا دی۔ انہوں نے

ایوب کی شدید مخالفت کی۔ لیکن جب ذو الفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کی عوام پسند سیاست نے اپنے قدم جما دیے، اردو بولنے والی آبادی ایک دم سے گھبرا گئی۔ اور انہوں نے دائیں بازو کی اسلامی پارٹیوں کی حمایت کی جب کہ پاکستان کے باقی لوگوں نے ان پارٹیوں کی حمایت کی جو سوشلزم اور سیکولرازم پر زور دے رہی تھیں یعنی مشرقی بنگال میں نیشنل عوامی لیگ، پنجاب اور سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی، اور شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی۔ ایک سندھی وزیراعظم اور سندھ میں سندھی اکثریت کی صوبائی حکومت کا خیال ہی اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے قابل نفرت تھا۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں اردو بولنے والے اس پارٹی کے مخالف رہے اور انہوں نے اردو پریس اور اردو بولنے والے بیورو کریٹوں کی مدد سے پیپلز پارٹی کی حکومت میں عدم استحکام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۷۷ء کے چناؤ میں سندھ کی ان تمام انتخابی حلقوں میں پی پی پی کے امیدواروں نے چناؤ ہارا جہاں اردو بولنے والوں کی اکثریت تھی۔ اردو بولنے والوں کے رہنماؤں نے فوج اور دوسرے بھٹو مخالف عناصر کے ساتھ ساز باز کر کے تشدد آمیز ایجی ٹیشن کے ذریعہ بھٹو کی حکومت کو ہٹا دیا جس کے بعد فوج نے اقتدار سنبھالا۔ چونکہ ان لوگوں کی آبادی صرف سات فیصد تھی اس لیے ایک جمہوری طرز نظام میں، ملکی سیاست پر ان کے غلبہ کی امید ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے انھوں نے اس مقصد کے لیے فوجی ڈکٹیٹر شپ کے ساتھ ساز باز کیا۔ لیکن انہیں حاصل کچھ نہ ہوا۔ اس گروپ کا ایک حصہ اگرچہ ابھی بھی جمہوریت سے خوفزدہ ہے اور فوجی حکومت کو ترجیح دیتا ہے مگر ایک حصہ جس کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ ان کی تقدیر سندھ اور سندھ کے لوگوں کے ساتھ تعاون میں ہے۔ کیونکہ یہ سندھی ہی تھے جنہوں نے انہیں رہنے کے لیے جگہ مہیا کی تھی۔ مگر ان واقعات کے باوجود اور اس برادری میں اختلاف رائے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اس گروپ نے پاکستان میں جمہوریت کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کے لیے شعوری طور پر کام کیا۔

مملکت اور قومیتیں

پاکستان صرف مختلف قوموں، نسلوں پر مشتمل ملک ہی نہیں۔ بلکہ ان قوموں کی اپنی اپنی الگ تاریخ ہے۔ ان کی اپنی اپنی الگ ریاستیں تھیں۔ اب ان میں مختلف طبقاتی ڈھانچے ہیں اور اقتدار تک غیر مساوی رسائی۔ اس لیے پاکستان کی سماجی ساخت اور طبقاتی بنیاد کے بارے میں جو عمومیت سے کام کیا گیا ہے اس سے بڑے بڑے سیاسی واقعات اور سیاسی سٹیج پر بڑے بڑے کرداروں کے رویہ کی تشریح اور توضیح نہیں ہو پاتی ہے۔ جب ہم فوج اور بیورو کریسی کے گٹھ جوڑ کی حکومت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مطلب پاکستان کی کوئی ہم نوع فوج نہیں ہوتا بلکہ وہ فوج اور بیورو کریسی جس پر پنجابیوں کا غلبہ ہے۔

جب ہم صنعتی اور تجارتی سرمایہ دار طبقہ یا سروس بورژوازی کا بھی ذکر کرتے ہیں تو مطلب پنجابی اور مہاجر (اردو اور گجراتی بولنے والے ریفوجی) بورژوازی ہوتا ہے۔ اب اگر ہم اس پر مختلف انداز سے نظر ڈالیں اور طبقوں کے بدلے قومیت کو دھیان میں رکھیں ہمیں معلوم ہوگا کہ بلوچوں کو فوج، بیورو کریسی، بورژوازی بلکہ جاگیردارانہ انداز کے زمیندار طبقہ میں بھی نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ سندھی فوج میں ہیں ہی نہیں اور بیورو کریسی اور بورژوازی خواہ وسروس بورژوازی ہو یا صنعتی دونوں میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ مگر ان میں ایک مضبوط زمیندار طبقہ موجود ہے۔ پنجابیوں کو ان چاروں با اثر طبقوں پر غلبہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ پنجابیوں میں ان کسانوں کا ایک بڑا طبقہ موجود ہے جو اپنی زمینوں کے خود مالک ہیں اور جو مقابلتاً خوشحال ہیں۔ پختونوں کو فوج، بیورو کریسی اور بورژوازی گروپ میں اچھی نمائندگی حاصل ہے اور ان کا ایک طاقتور زمیندار طبقہ بھی ہے۔ اردو بولنے والا گروپ شہروں میں آباد ہے۔ کہیں کہیں پیداواری زرعی زمینوں کے مالک ہونے کے باوجود دیہاتی علاقہ میں ان کی کوئی سماجی طاقت نہیں ہے۔ فوج اور بیورو کریسی میں ان کو کافی نمائندگی حاصل ہے۔ اگرچہ بیورو کریسی پر اب ان کو غلبہ حاصل نہیں رہا ہے مگر سروس سیکٹر میں ان کی پیش رفت نمایاں ہے۔ ان کی سیاست پر سروس بورژوا کے مفادات خاص طور پر نام نہاد تعلیم یافتہ متوسط طبقہ حاوی ہے۔

اگر ہمیں ہر قوم میں سب سے زیادہ با اثر طبقہ کی نشاندہی کرنا پڑے گی تو پنجاب میں یہ طبقہ فوج کا ہوگا، سندھ میں زمیندار طبقہ، بلوچستان میں قبائلی سرداروں کا طبقہ اور شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں پختون جنرلوں، زمینداروں، ٹرانسپورٹروں اور سمگلروں کا ایک باہم مربوط ملغوبہ۔

اب اگر ان طبقوں پر نظر ڈالی جائے جن پر غلبہ قائم ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ قومی پیمانہ پر کوئی کارکن طبقہ موجود ہی نہیں اور نہ ہی کسانوں کا۔ مگر ان طبقوں کی صورت حال مختلف قومیتوں میں مختلف ہے۔ اس سلسلے میں پہلے یہ بات کہنا ضروری ہے کہ پاکستان میں کارکن طبقہ ابھی بھی بہت چھوٹا ہے۔ پاکستان کی جی ڈی پی یعنی مجموعی ملکی پیداوار میں کارخانوں کا حصہ ۱۵ فی صد ہے اور کان کنی کا ایک فی صد۔ کارکنوں کی ایک بھاری اکثریت سروس سیکٹر میں ہے یا چھوٹے صنعتی یونٹوں میں کام کرتے ہیں یا وقتی کارکن ہیں۔ پنجاب میں کارکن طبقہ تقریباً مکمل طور پر پنجابی ہے۔ صرف کچھ سیکٹروں میں بہت کم تعداد میں پختون کام کرتے ہیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں اگرچہ کارکن طبقہ چھوٹا ہے مگر یہ پورا پختونوں پر مشتمل ہے۔ سندھ تمام صوبوں میں صنعتی لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ یہاں کا کارکن طبقہ پنجابیوں اور پختونوں پر مشتمل ہے۔ سندھیوں کی اس میں بہت کم نمائندگی ہے اور جہاں تک اردو بولنے والے کارکن طبقہ کا تعلق ہے تو وہ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں ہے یا غیر صنعتی پیشوں سے وابستہ

ہے ۔ بلوچستان میں کارخانہ داری کا کام بہت چھوٹی نوعیت کا ہے، اور یہاں کا بلوچ کارکن طبقہ نہایت چھوٹا اور بکھرا ہوا ہے۔ یہ تقریباً پورے کا پورا غیر صنعتی کارکن طبقہ ہے اور غیر منظم بھی۔ کارخانوں، کان کنی، ریلوے اور تعمیرات وغیرہ میں جو کارکن طبقہ ہے اس میں بھاری اکثریت پختونوں اور پنجابیوں کی ہے ۔ بلوچ سماج ابھی بھی بنیادی طور پر قبائلی اور خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش ہے قبیلوں کی زمینوں پر قبائلی سرداروں کی طرف سے بڑے پیمانہ پر قبضہ کرنے کی کارروائیوں کے باوجود بلوچ معاشرہ کے اندر طبقاتی کشمکش قومیت کی کشمکش کے مقابلہ میں بہت کم اور ابتدائی نوعیت کی ہے۔

اب اگر ہم طبقوں کی ساخت اور قومیت کو پہلو بہ پہلو رکھ کر پاکستان کے نظام سیاست کا جائزہ لیں گے، جس میں فوج اور بیوروکریسی کے گٹھ جوڑ کا غلبہ ہے اور جو ملکی بورژوازی، خواہ وہ زمیندار طبقہ ہو یا شہری بورژوازی کے مفادات کی حفاظت کر رہا ہے تو آسانی کے ساتھ یہ پتہ چلے گا کہ ایسے طرز نظام میں بلوچ اور سندھی کی حیثیت بہت کمزور ہے ۔ حقیقت میں سیاست اور اقتصادی سرگرمیوں میں ان کا حصہ اور بھی کم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ معیشت میں سروس سیکٹر کا غلبہ ہے اور سیاسی اقتدار فوج کے ہاتھ میں ہے اور پاکستان کے طرز نظام کا جائزہ لینے کے لیے انہیں دو عناصر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

پاکستان میں قومیت کے سوال کا تسلی بخش جائزہ لینے کے لیے تو پوری تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے ۔ لیکن یہاں ہم اس معاملہ کا صرف اس لیے ذکر کر رہے ہیں تاکہ پاکستان میں حکومت کے نظام کی خصوصیات کا جائزہ لینے اور اقتدار کی جدوجہد کی نوعیت واضح کرنے میں مدد ملے۔ حکومت کسی اور ادارہ کی طرح، اتحاد کی یکسانیت لانے کی کوشش کرتی ہے ۔ مگر سیاسی اقتدار کے ڈھانچہ پر جس قومیت کا غلبہ ہو وہ اپنی برتری برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے ۔ اور اس مقصد کو سامنے رکھ کر وہ ان قومیتوں میں سے، جن پر وہ حاوی ہو، شریک کار چنتی ہے تاکہ ان قومیتوں کی مخالفت میں نرمی آ جائے اور سیاسی استحکام اور معاشی ترقی یقینی بنے۔

حکومت، طبقہ اور قومیت کے درمیان اس پیچیدہ رشتہ میں یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ مختلف طبقے اپنی قومیتوں کی حدیں پار کر کے یکساں طریقہ پر سوچیں اور عمل کریں ۔ ہر قومیت میں بااثر طبقہ کو ایسا رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس سے نہ صرف اس کی اپنی قومیت اور اپنے علاقہ کے اندر برتر حیثیت قائم رہے بلکہ قومی اقتدار اور قومی معیشت میں بھی اسے مناسب حصہ ملے۔ اب جبکہ معاشرہ مختلف النوع ہو اور ملک مختلف قومیتوں پر مشتمل، ایک پاکستانی قومی طرز نظام موجود ہے اور پاکستان کی قومی معیشت علاقائی

اور مقامی سیکٹروں کو اپنے تحت لاتی جا رہی ہے اور اس عمل میں پورے ملک میں اپنے نئے شرکاء سمیت اس قوم کے غالب طبقہ کی معاشی بالادستی قائم ہونے کے لیے راستے صاف ہو جاتے ہیں جس کا اقتدار پر غلبہ ہو۔ مگر علاقائی برتر طبقوں کے لیے اپنی معیشت اور سیاست کو مقامی رنگ دینے کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ حکومت کی مرکزیت کے کنٹرول کو ارد گرد کے علاقوں تک پھیلانے اور "قومی" معیشت کو وسعت دینے سے نہ صرف علاقائی برتر طبقوں کی برتری ختم ہو جانے بلکہ پوری قومیت کے کمزور ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے خواہ ترقیاتی منصوبوں کا سوال ہو یا سیاسی نظام کی ہیئت کا، طبقاتی مفادات قومیت کے مسئلے کے ساتھ مل کر ہی حاوی ہو جاتے ہیں۔

(۲)

حکومت اور اقتدار کے لیے جدوجہد

سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد کا مقصد اگر نظام حکومت کی بنیادوں میں انقلابی تبدیلی لانا نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلبہ حاصل کرنے یا طاقتور حیثیت حاصل کرنے کے لیے طبقوں کے درمیان، یا طبقوں میں موجود گروہوں کے درمیان مقابلہ آرائی شروع ہو جاتی ہے اور اپنے اقتصادی اور دوسرے مفاد پورا کرنے کے لیے یہ نئے نئے اتحاد قائم کر لیتے ہیں۔

پاکستان میں نظام حکومت، معیشت اور طبقاتی ساخت کو نظر میں رکھ کر ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ مختلف طبقوں کے ٹھوس مفادات کیا ہیں، یہ مفادات ایک دوسرے سے کیسے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور ٹکراؤ کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اور یہ طبقے اپنے مفادات کے فروغ کے لیے کس طرح کام کرتے ہیں؟ ایسا کرنے کے بعد ہم پاکستان میں ڈکٹیٹرشپ اور جمہوریت کا سوال اٹھائیں گے اور وہ وجوہات معلوم کرنے کی کوشش کریں گے جن کا لازمی نتیجہ فوجی حکمرانی ہے، جمہوری (فوج کو ہٹانا اور غیر مرکزیت) تحریک کے تغیر و تبدل کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور جمہوریت کے

امکانات اور کوتاہیوں کا جائزہ لے کر پاکستان کے نظام کے بارے میں پیش گوئی کرنے کا جوکھم مول لیں گے۔

طبقاتی مفاد

یہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ حکومت صرف موجودہ طبقاتی رشتوں کی ہی حفاظت نہیں کرتی بلکہ نئے رشتے پیدا کرنے میں بھی مدد کرتی ہے۔ فوج اور بیوروکریسی کے عروج سے ایک ایسی معاشی ترقی عمل میں آئی جس سے صنعتوں کو فروغ ملا، سروس سیکٹر کو وسعت ملی اور کسی حد تک زراعت میں جدید طریقوں کا استعمال ہونے لگا۔ اس عمل سے بااثر طبقوں اور قوموں، نسلوں کو فائدہ ہوا جب کہ اس کی قیمت مغلوب طبقوں اور مغلوب قوموں، نسلوں نے ادا کی۔ صنعتی بورژوازی طبقہ کی اقتصادی طاقت میں اضافہ ہونے سے نہ صرف کارکن طبقہ کے ساتھ جد وجہد میں شدت آگئی ہے بلکہ صنعتی بورژوازی کی مخصوص نسلی قومیت کو مد نظر رکھ کر، اس سے مغلوب طبقوں اور مغلوب قومیتوں کے مقابلہ میں پنجابی اور "مہاجر" بورژوازی کی طاقت بڑھ گئی۔

صنعتی ترقی سے زیادہ سروس سیکٹر کا پھیلاؤ دور رس نتائج کا حامل رہا ہے صرف اس لیے نہیں کہ یہ سب سے بڑا اور بہت تیزی سے ترقی کرنے والا سیکٹر ہے اور فوج اور بیوروکریسی کے ساتھ اس کا قریبی ناطہ ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں نقصان کا کوئی خطرہ نہیں، اس لیے اس میں مقابلہ آرائی شدید ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر سرکاری اور پرائیوٹ کام، ٹھیکے، پرمٹ، ایجنسیاں، اثر ورسوخ استعمال کر کے کام کرانے میں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ تعلیم کے پھیلاؤ سے نابرابریوں اور امتیازی سلوک کے باوجود ہر قومیت کے امیدوار میدان میں آجاتے ہیں۔ سروس بورژوازی کے برتر لوگوں، خاص طور پر فوج اور بیوروکریسی کی مخصوص نسلی قومیت کی وجہ سے پنجابیوں اور مہاجروں کو زبردست فائدہ حاصل ہوا اور جہاں تک مغلوب قومیتوں کا تعلق ہے تو نہ صرف ان کے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے امیدواروں نے بلکہ ان قومیتوں کے اونچے طبقوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ ان کو اپنے حق سے محروم کر دیا گیا ہے اور ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حال ہی میں پختونوں نے فوج، بیوروکریسی، ٹرانسپورٹ، نشہ آور دوا لانے لے جانے اور اسمگلنگ میں طاقتور اور بااثر حیثیتیں حاصل کی ہیں اور نتیجہ یہ کہ اس قوم کے بااثر طبقہ کے مفادات پورے ہونے لگے ہیں۔

ان باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ سروس سیکٹر ہی مختلف قومیتوں کی جد وجہد کا ایک بڑا اکھاڑا بنا رہا ہے۔ مگر یہ لڑائی محض سرکاری فائدوں یا سروس سیکٹر میں مناسب حصہ کے لیے ہی نہیں بلکہ یہ جد وجہد ایک ایسے سیاسی ڈھانچہ کے لیے ہو رہی ہے جس میں بااثر قوموں کے بااثر طبقے اپنے اپنے

علاقوں میں اقتصادی ترقی کے عمل پر کنٹرول حاصل کر سکیں۔ کیونکہ ان کو ڈر ہے کہ تعداد کے لحاظ سے کم ہونے اور سماجی اعتبار سے پسماندہ ہونے کے سبب انہیں، اس کنٹرول کے بغیر، اگر پورا ختم نہیں تو کمزور ضرور کیا جائے گا۔ یہ بات خاص طور پر ان بلوچ سرداروں کے سلسلے میں بالکل صحیح ہے جنہوں نے حاوی قومیت کے دست نگر ہونے کا انفعالی رول قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

زراعت کو جدید ڈھنگ پہ لانے کا عمل، جو ساٹھ کی دہائی کے وسط میں شروع ہوا، ابتدائی طور پر پنجاب تک اور سندھ میں پنجابی زمینداروں تک محدود رہا۔ اس لیے اس سے نہ صرف دیہات میں طبقاتی تفریق میں زور آیا بلکہ زمیندار طبقہ میں بین قومیتی نابرابریاں بھی وسیع ہو گئیں۔ پنجابی فوج اور بیوروکریسی کے ہاتھ سیاسی اقتدار آنے سے دوسری قومیتوں کے زمینداروں کے مقابلہ میں پنجابی زمیندار طبقہ کو زیادہ فائدہ حاصل ہوا۔ مگر جب پیپلز پارٹی کی منتخب سرکار قائم ہوئی تو سندھ کے زمیندار سیاسی طاقت کو اپنے فائدہ کے لیے استعمال کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر فوج اور بیوروکریسی کی طاقت اتنی ہے کہ ایک غیر فوجی منتخب سرکار کے تحت بھی فوجی اور بیوروکریٹ زمینداروں کو زمینیں منظور نہ کرنا اور انہیں دوسری ترجیحات نہ دینا ممکن نہ ہوا۔ فوج اور بیوروکریسی کی طرف سے سیاسی طاقت کو استعمال کر کے سندھ اور بلوچستان میں زمینوں پر، آبپاشی کے پانی پر اور دوسری زرعی سہولیات پر قبضہ کرنے سے نہ صرف ان صوبوں کی مقامی آبادی ان کے خلاف ہو گئی بلکہ مقامی زمیندار اور قبائلی سردار بھی۔ اس لیے حکومت کی طرف سے ان سماجی رشتوں کی حفاظت کے باوجود جو زمینداروں کے حق میں ہیں، پاکستان کی زرعی ترقی میں موجود قومیتی پہلو کی وجہ سے پنجابی حکمران طبقہ اور مغلوب قومیتوں کے بااثر طبقوں کے درمیان تنازعے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے مغلوب قومیتوں کے ان برتر طبقوں کے لیے یہ ضروری بن جاتا ہے کہ وہ اپنی قومیتوں کو بااثر قوم کے خلاف منظم کرنے کی کوشش کریں۔

سیاسی طاقت کی مرکزیت، جو فوجی حکومت میں اپنے عروج کو پہنچتی ہے، سے غالب قومیت کے بااثر طبقے کو پورے ملک میں وسیلے اکٹھا کرنے اور ان کو تقسیم کرنے کا کنٹرول حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ وسیلے علاقائی بنیادوں پر مساوی طور پر بھی تقسیم کیے جائیں تب بھی مغلوب قومیتوں کی سماجی ساخت کی پسماندگی کی وجہ سے ان کے لیے ان وسیلوں سے اس طرح کی ترقی حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے جس کو پاکستان میں فروغ دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ قومیت کے حقوق کو تسلیم نہ کرنے سے بااثر قومیت کے بااثر طبقوں کے افراد کے لیے یہ آسان بن جاتا ہے کہ مغلوب علاقوں کے اقتصادی کام وہ اپنے قبضے میں لیں۔ اس طرح سے مرکزیت کے تحت ترقیات سے نہ صرف اقتصادی ترقی کے سارے کام برسراقتدار طبقہ کے اختیار میں آ جاتے ہیں بلکہ مقامی اختیارات بھی مقتدر طبقوں اور ان لیڈروں کے ہاتھوں میں آ جاتے ہیں اور وہ قومیتوں پر حاوی

ہو جاتے ہیں۔

جمہوریت کے لیے جدوجہد

اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان میں ڈکٹیٹر شپ کے خلاف جدوجہد کے ساتھ ایک اور جدوجہد ہوتی رہی ہے اور وہ ہے مرکزیت کے خلاف اور قومیت کے حقوق کے لیے جدوجہد مطلق العنانیت کی مزاحمت دو گروپوں کی طرف سے ہوئی ہے مغلوب قومیتیں اور مغلوب طبقے۔ حالانکہ ایسا کرنے کے لیے دونوں کی وجوہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مغلوب قومیتوں کے مقتدر طبقوں کا خیال ہے کہ وفاقی پارلیمانی نظام جس میں صوبوں کو بہت حد تک خود مختاری حاصل ہوگی۔ ان کے مفادات کی حفاظت کے لیے لازمی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جمہوری آزادی کی کمی ان کی 'مقاصد حاصل کرنے کی' راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ لیکن اگر ان کے یہ مقاصد کسی اور طریقہ سے پورے ہو جاتے ہیں تو ان کے طبقہ یا ان کی قومیت میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں جو انہیں ایسے ہی غیر جمہوری طریقے اپنانے سے باز رکھ سکے گی جن کی وہ اس وقت مزاحمت کر رہے ہیں۔ اس بات کو قومیتی رویہ کی تین حالیہ مثالیں دے کر واضح کیا جا سکتا ہے۔

متحدہ پاکستان میں بنگالیوں کو ملک کی جمہوری تحریک کا لیڈر تصور کیا جاتا تھا۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کی کثرت آبادی اور جغرافیائی علیحدگی کو پاکستانی حکومت کی طرف سے مرکزیت اور یکسانیت پیدا کرنے کے رجحانات کے خلاف ایک طاقتور آلہ کے طور پر استعمال کیا۔ اپنی اس جدوجہد میں ان کو مغربی پاکستان میں مغلوب قومیتوں اور پنجابیوں اور "مہاجروں" میں موجود جمہوریت پسند عناصر کی حمایت حاصل رہی۔ خیال یہ کیا جا رہا تھا کہ چونکہ بنگال کی سیاست پر متوسط طبقہ کا غلبہ ہے اور مشرقی بنگال میں کوئی "جاگیردار طبقہ" نہیں ہے اس لیے بنگلہ دیش میں جمہوری ادارے محفوظ رہیں گے۔ لیکن جونہی بنگلہ دیش کے سروس بورژوازی نے ملک کا اقتدار حاصل کیا اس نے وہی جابرانہ اقدامات اپنائے جو ایک دفعہ پاکستان کی حکومت نے اپنائے تھے۔

پختون قوم پرستوں کے لیڈر پاکستان میں جمہوریت کی جدوجہد میں سب سے آگے رہے تھے اور انہوں نے جمہوریت کے کاز کے لیے بے پناہ قربانیاں دیں۔ مگر بنگلہ دیش کے علیحدہ ہو جانے اور سروس بورژوازی کا زور بڑھنے کی وجہ سے پختونوں کو حکومت کے ڈھانچہ میں طاقتور اور بااختیار منصب حاصل ہوتے جنرل ضیاء کی فوجی حکومت نے پاکستان کے حکمران طبقہ میں جونیئر شریکوں کے طور پر پختونوں کی حیثیت مستحکم کر دی۔ اس سے ولی خان کے لیے ایک بحران پیدا ہو گیا اور انہوں نے وزیراعظم بھٹو کو ایذا دینے کی کارروائیوں میں نہ صرف فوجی حکومت کا ساتھ دیا بلکہ صوبائی خود اختیاری اور قومیت کے حقوق کے معاملوں میں بھی انہوں نے مبہم اور غیر یقینی

موقف اپنایا۔ ولی خان جو کبھی بائیں بازو کی نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر تھے اب اعتدال پسند دائیں بازو کی نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہ ہیں اور مزید برآں یہ کہ وہ پختون حکمران طبقہ کے لیے صرف دوسری پسندیدہ شخصیت ہیں۔ وہ بھی نمائندہ حکومت بحال ہونے کی صورت میں۔ کیونکہ پختون حکمران طبقہ فوجی حکومت کو ترجیح دیتا ہے اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے انتہا پسند دائیں بازو کے فوجی گورنر جنرل فضلِ الٰہی کو اپنا حقیقی لیڈر تصور کرتا ہے۔

سندھی زمیندار سیاست دانوں کا رول بھی توضیحی رہا ہے۔ پی پی پی کے غیر فوجی دور حکومت میں سندھ کے زمیندار طبقہ کو بہت اثر ورسوخ حاصل رہا اور انہوں نے اس اثر ورسوخ کو زراعت جدید ڈھنگ پر لانے کی خاطر سہولیات بہم کرانے کے لیے استعمال کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے حکومت سے اور بھی بے پناہ فائدے حاصل کئے۔ اس طبقہ کو امید تھی کہ اسے پاکستان کے حکمران طبقہ میں جونیئر شریک کا درجہ حاصل ہو جائے گا اس لیے انہوں نے بلوچ لوگوں پر ظلم وجبر کی کارروائیوں میں حکومت کی حمایت کی لیکن ۱۹۷۷ء میں حکومت کا تختہ الٹا دیئے جانے کی کارروائی سے ان کا یہ خواب چکنا چور ہو گیا۔ اب اس حقیقت کے باوجود کہ فوجی حکومت نے پوری قوت کے ساتھ، عام کسانوں کے خلاف زمینداروں کے مفادوں کی مدافعت کی اور کسانوں کو پہلے سے زیادہ وحشیانہ انداز میں دبایا۔ سندھ کا زمیندار طبقہ فوجی حکومت کے خلاف رہا ہے اور ان میں سے بیشتر زیادہ خود اختیاری کی یا کنفیڈریشن کی باتیں کرتے ہیں اور بلوچ قوم پرستوں کے ساتھ رابطہ قائم کر رہے ہیں۔ موجودہ حالات میں، فوجی حکومت سے ان کے مفاد پورے نہیں ہوتے، جبکہ پارلیمانی جمہوریت سے ان کو اپنی سماجی طاقت اور اثر ورسوخ کو استعمال کر کے حقیقی اقتدار میں اپنا حصہ حاصل کرنے کا موقع مہیا ہوتا ہے۔ لیکن اگر جمہوری آزادی کی بحالی اور عوام پسند سیاست سے عام کسانوں پر ان کی گرفت خطرے میں پڑ جاتی ہے تب وہ بنگلہ دیش کے حکمرانوں سے ہٹ کر اور کوئی راستہ نہیں اپنائیں گے۔

اب رہے بلوچستان کے قوم پرست لیڈر اور ان کے جمہوری رول کا منطق۔ جہاں تک سماجی ساخت کا تعلق ہے تو بلوچ معاشرہ کو نئے جمہوری اداروں کی کوئی پرواہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بلوچستان کے قوم پرست لیڈروں نے پاکستان کی مرکزی حکومت کی مطلق العنانیت کے خلاف مسلسل طور پر سب سے زیادہ مزاحمت پیش کی ہے۔ یہ تو پہلے ہی واضح کیا گیا ہے کہ بلوچ پاکستان کی سیاسی مساوات میں اپنے لیے کوئی جگہ نہیں پاتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کی کل آبادی میں ان کی آبادی کا تناسب بہت کم ہے اس لیے اگر وہ حکومت کے نظام میں شریک ہو بھی جائیں، ان کی یہ شرکت تب تک موثر ثابت نہیں ہو سکتی اور ان کے مفادات کی حفاظت تب تک ممکن نہیں جب تک سیاسی طور پر کوئی ایسا انتظام عمل میں نہیں لایا جائے جس میں قومیتوں کو برابر کا درجہ دینے کے اصول کو مدنظر رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ

بڑے بڑے بلوچ قوم پرست لیڈر اب جمہوریت کی بحالی کی باتیں نہیں کرتے بلکہ قومی حقوق پر زور دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں بلوچستان کی آزادی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ زیادہ دیانتدارانہ موقف ہے کیونکہ وہ جمہوریت کے بدلے قومی ظلم و جبر سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدر طبقوں اور مغلوب قومیتوں کے برتر طبقوں کی طرف سے پاکستانی حکومت کے مطلق العنان رجحانات کی مخالفت کا قومیت کے مسئلہ کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور جب تک یہ تعلق قائم رہ جاتا ہے اور جب تک پنجاب کا حکمران طبقہ چھوٹی قومیتوں کے بااثر طبقوں کو اقتدار میں شریک بنانے میں ناکام رہتا ہے قومی حقوق حاصل کرنے کی تحریک اور جمہوریت بحال کرنے کی تحریک دونوں ایک ساتھ چلتی رہیں گی۔ اور یہ بدستور ایک دوسرے کو تقویت دینے کا کام کرتی رہیں گی۔ ایک طرف پاکستانی حکومت اور دوسری طرف بلوچ اور سندھی قومیتوں کے درمیان آویزش دور کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ فوج اور بیوروکریسی میں تمام قومیتوں کو برابری کی بنیاد پر نمائندگی حاصل ہو۔ یا دوسری صورت میں پاکستانی فوج کے پر کاٹ دیئے جائیں اور اس کو سیاسی اقتدار سے محروم کیا جائے۔ لیکن اگر ایسا کیا جائے تو جمہوریت کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مقتدر طبقوں اور مغلوب قومیتوں کے برتر طبقوں میں جمہوریت کی اہمیت اور ضرورت گھٹ جائے گی اور وہ اپنے آپکو اپنی ہی قومیتوں کے عوام الناس کے نرغے میں پائیں گے۔ اور ان کا عوام الناس کے ساتھ براہ راست تصادم ہوگا۔

اب جہاں تک ان طبقوں کا تعلق ہے جن پر غلبہ قائم رہے تو ان کی جمہوری آزادی کی خواہش ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے اور یہ خواہش پائدار بھی ہے۔ فوجی حکومت سے ان کی اقتدار میں ظاہری شرکت بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آزادی کی عدم موجودگی سے اقتصادی بھلائی اور باعزت زندگی گزارنے کے لیے ان کی جدوجہد پر ناکارہ اثر پڑتا ہے۔ بھٹو کے دور حکومت میں مشکلات کا سامنا کرنے اور موجودہ حکومت کے تحت اقتصادی حالات میں بہتری آنے کے باوجود یہ طبقے فوجی آمریت کے مقابلہ میں جمہوری حکومت کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر ان حقائق کے باوجود تحریک بحالی جمہوریت ایم۔آر۔ڈی۔ کی کوششوں کے سلسلہ میں عوام کے مختلف حصوں میں مختلف ردعمل کا اظہار ہوا۔ سندھ کے کسانوں نے دوسرے طبقوں کے ساتھ ساتھ ضیاء کی حکومت کے خلاف بڑی بہادری کے ساتھ لڑا۔ کیونکہ موجودہ حکومت کے تحت ان پر بڑا ظلم و جبر ہوا۔ بلوچستان کے لوگوں میں ایجی ٹیشنوں کی سیاست کی روایت بھی نہیں ہے اور ان کو اپنے قوم پرست رہنما وں نے ایم۔آر۔ڈی کی ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں منظم بھی نہیں کیا کیونکہ موجودہ حکومت کے تحت بلوچوں پر ظلم و جبر میں کمی آگئی اور بہت سے بلوچ لیڈروں اور قبائلی سرداروں نے حکومت کے ساتھ صلح کی ہے۔ پختونوں کو منظم کرنا آسان نہیں تھا کیوں کہ ایک تو ان کے قوم پرست لیڈروں نے بے دلی سے اس

کی کوشش کی اور دوم یہ کہ پختون کارکنوں کو ملک میں اور ملک سے باہر روزگار کے وافر مواقع حاصل ہیں۔ ان میں بلوچستان میں رہنے والے پختون شامل نہیں لیکن اگر حزب اختلاف کے سیاست دانوں کے درمیان ان کے ساتھ قومی حقوق اور تحریک کی قیادت کے بارے میں مفاہمت ہو جاتی ہے تو شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان دونوں علاقوں کے عام لوگوں کو جمہوریت کے لیے جدوجہد میں موثر طور پر شریک ہونے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد اب پنجاب کی جمہوری قوتوں کا معاملہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ پنجاب میں تو قومیت کا کوئی مسئلہ نہیں اس لیے جمہوریت کے لیے تحریک چلانے میں ان قوتوں پر انحصار کرنا پڑے گا جن کی طرف فوجی حکومت نے دھیان نہیں دیا ہے یا وہ جو نظریاتی طور پر مطلق العنانیت کے خلاف ہیں۔ پچھلے ساڑھے سات سال کے تجربوں سے پنجاب کی جمہوری قوتوں کی کمزوریاں اور کوتاہیاں کسی سے چھپی نہیں رہیں — جب تک فوج اور بیوروکریسی ملک پر حکومت کر رہے ہیں پنجاب کے سروس بورژوازی اور صنعتی بورژوازی یہ انتظام اپنے مفادات کے لیے موافق پا رہے ہیں بلکہ وہ اس کو جمہوری طرز پر ترجیح بھی دیتے ہیں کیونکہ جمہوری نظام میں انہیں دوسری قوموں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ چھوڑنا پڑے گا۔ رہی کسانوں کی بات تو ان کے ایک بڑے حصہ کے پاس اپنی زمینیں ہیں اور وہ خوش حال ہیں۔ خاص طور پر وسطی پنجاب میں۔ ان کسانوں کی اکثریت پی پی پی کی حمایت تو کرتی ہے مگر حکومت سے ٹکراؤ کے لیے آمادہ نہیں۔ وہ بس جلسے جلوسوں میں شرکت کے لیے نعرے لگانے کے لیے اور ووٹ دینے کے لیے تیار ہیں۔ شمالی پنجاب کے بیشتر کسان بھی اپنی زمینوں کے خود مالک ہیں اور ان کی فوج میں ملازمت کرنے کی ایک بہت پرانی روایت ہے۔ مغربی جنوبی پنجاب اور دوسرے علاقوں کے کسان ظلم و جبر کے شکار تو ہیں۔ مگر وہ اتنے کمزور اور غیر منظم ہیں کہ ان میں اس مرحلہ پر اپنے طور پر ایک زبردست طاقت بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس طرح اب صرف کارکن طبقہ باقی رہ جاتا ہے۔ لیکن مجموعی صورت حال میں اس کی تعداد بہت کم ہے اور اس کا کوئی موثر اور سرگرم اتحاد بھی نہیں ہے ماسوائے وکیلوں اور سروس بورژوازی کے اس حصہ کے جو پیشہ ورانہ کام کرتا ہے اور جو جمہوریت پسند ہے۔ لیکن جمہوریت کی یہ چھوٹی سی سماجی بنیاد بھی اس وقت ہلنے لگتی ہے جب مغلوب قومیتیں ایک جمہوری سرکار قائم کرنے کے مطالبہ کے ساتھ یہ مطالبہ بھی کرتی ہیں کہ ایک ایسا وفاقی ڈھانچہ قائم کیا جائے جس کی بنیاد مساوات پر ہو۔

جہاں تک سندھ میں اردو بولنے والے (مہاجرین) گروپ کا تعلق ہے تو ان میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ چونکہ ان کی تعداد کم ہے اور ان کا کوئی علاقہ نہیں ہے اس لیے جمہوری نظام کے تحت سندھ میں سندھی اکثریت کی حکومت قائم ہو جانے سے ان کے مراعات خطرے میں پڑ جائیں گے۔ مگر اس کے باوجود اس گروپ نے جمہوریت کی جدوجہد کے لیے ایسے مجاہد بھی پیدا کیے جن کے قدم ڈگمگاتے نہیں۔ اس کے علاوہ وقت گزرنے

کے ساتھ اس گروپ کا پنجاب کے سروس بورژوازی کے ساتھ ٹکراؤ بھی ہونے لگا ہے۔ اور اس گروپ کا ایک حصہ پہلی بار اپنی شناخت کو سندھی قومیت کے ساتھ ملانے لگا ہے اور سندھ میں ملازمتوں اور کاروبار پر پنجابیوں کے قبضہ کے خلاف سندھیوں کے شانہ بشانہ لڑنے لگا ہے۔

اس بحث سے ہم اس نتیجہ پہونچتے ہیں کہ پاکستان میں جمہوری نظام کے لیے سماجی بنیاد بہت کمزور رہے، اور یہ کہ فوجی آمریت کی مخالفت لازمی طور جمہوری اقدار پر یقین کو ظاہر نہیں کرتی اور یہ کہ پاکستان کی جمہوریت کی تحریک، طبقاتی اور قومیتوں کی کشمکش کا نتیجہ ہے اور اس کشمکش میں ایک طرف وہ طبقے اور قومیتیں ہیں جو آسودہ حال ہیں اور دوسری طرف وہ طبقے اور قومیتیں ہیں جو غریب ہیں۔ اس کشمکش اور ٹکراؤ میں شدت فوج اور بیوروکریسی کی حکومت سے اور معیشت پر سروس سیکٹر کے غلبہ سے پیدا ہو جاتی ہے اور ان دونوں کے لیے نوآبادیاتی ماضی اور جدید نوآبادیاتی حال ذمہ دار ہے۔

آئیڈیولوجی اور سیاسی جدوجہد

موجودہ فوجی حکومت کی طرف سے معاشرہ کو اسلامی رنگ دینا، مملکت اور اس کے حکمراں طبقہ کے لیے نظریاتی جواز پیش کرنے کے اس عمل کے عروج کی نمائندگی کرتا ہے جو "مسلم قوم" کے تصور سے شروع ہوا اور "اسلام خطرے میں" "اسلامی جمہوریہ" "اسلامی سوشلزم" اور "اسلامی آئیڈیولوجی" وغیرہ جیسے نعروں سے ہوتا ہوا نکلا۔ "پاکستان آئیڈیولوجی" جو موجودہ حکومت کی کل کائنات بن گئی ہے۔ بنیادی طور پر فاشسٹ جماعت اسلامی کی پیدا وار ہے۔ یہ حقیقت کہ پاکستان کے حکمران طبقہ کو یہ بے مطلب اور غیر حقیقی آئیڈیولوجی اس گروپ سے ادھار لینا پڑی جو پاکستان کے وجود کے خلاف تھا۔ اس کے ذہنی دیوالیہ پن کی نشاندہی کرتا ہے۔ مگر اس طبقہ کو ایک نظریاتی آلہ کی ضرورت ہے جس سے وہ اپنے مخالفین کو پسپا کر سکے۔ اس کے لیے اسلام کے نام سے زیادہ کوئی اور آسان اور کارآمد آلہ کیا ہو سکتا ہے۔ بعد میں اس نام کو پاکستان کے نام کا ہم معنی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ آئیڈیولوجی کی ایک خصوصیت ہے کہ ایک بار کسی نظریاتی تصور کو کسی مخصوص قسم کے سیاسی اور اقتصادی رشتوں کو جائز ٹھہرانے کے لیے استعمال کیا جائے پھر اس نظریاتی تصور میں کسی خارجی مدد کے بغیر ہی بذات خود ان رشتوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پاکستان کی مغلوب قومیتیں اس بات سے پوری طرح واقف ہیں کیونکہ ان کی قومی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کو ہمیشہ پاکستان کے وجود کی بنیادوں کے خلاف اور اس کی موجودہ آئیڈیولوجی کے خلاف قرار دے کر اس کی تضحیک اڑا دی گئی۔ یہ تمام تحریکیں سیکولر رہی ہیں۔ اس لیے سرکار "اسلام" اور سرکار کے مخالفین کے سیکولرازم کے درمیان کشمکش، اس کشمکش کی نظریاتی سطح کی نمائندگی کرتی ہے جس میں ایک طرف غالب طبقے اور

غالب قومیتیں ہیں اور دوسری طرف مغلوب طبقے اور مغلوب قومیتیں ہیں۔ اگرچہ پاکستان کے حکمران طبقہ نے اس آلہ کو سیکولرازم کے سلسلہ کی کشمکش میں اپنے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے چنا ہے مگر اس ہوا کو نظریاتی سطح تک لانے سے اتنی غلط بیانی ہوئی ہے جس کو مادی اور خارجی اصطلاحوں میں واضح کرنا مشکل ہے۔ لوگوں کو ایسے نظریات ذہن نشین کرانے کا ایک نتیجہ انتہائی بے رحمی اور سنگ دلی کا وہ سلوک ہے جو ایک پنجابی فوجی اس وقت دوسری قومیتوں کے لوگوں کے ساتھ روا رکھتا ہے جب ان کو ان کے خلاف کارروائی کا حکم دیا جاتا ہے۔ (بنگال ۱۹۷۱ء، بلوچستان ۱۹۴۸ء، ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۷ء یا ۱۹۷۳ء، سندھ ۱۹۸۳ء سے لے کر آج تک) ان کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ قومیتیں سچے مسلمان نہیں ہیں بلکہ مسلمان کے بھیس میں ہندو ہیں اور ہندو ہندوستان کے ایجنٹ ہیں۔ ہندو ہندوستان کے ساتھ دشمنی نہ صرف فوجیوں کے جذبات ابھارنے کا سبب مہیا کرتی ہے بلکہ یہ "پاکستان آئیڈیولوجی" کی ایک اہم بنیاد بھی ہے جس کا مقصد پاکستان کے حکمرانوں کے طبقاتی اور نسلی مفادوں کو پورا کرنا ہے۔ یہ ایک جنگجویانہ وطن پرستی کی آئیڈیولوجی ہے اور اس میں مہم پسندی کی کافی گنجائش موجود رہے۔ مغلوب قومیتوں کی قومی تحریکوں اور کارکن طبقہ کی پارٹیوں کو چھوڑ کر باقی تمام مخالف پارٹیاں ان مخصوص نظریاتی نعروں کی مخالفت تو کرتے ہیں جو فوج کی طرف سے استعمال کیے جاتے ہیں مگر اس خطرناک آئیڈیولوجی کا جو لب لباب ہے اس کی تائید کرتی ہیں۔

سامراج مخالفت

امریکہ مخالفت، جس کو اکثر سامراج مخالفت کا نام دیا جاتا ہے، آج کل پاکستان میں بہت مقبول ہے۔ موجودہ سیاسی کشمکش میں اس کی ماہیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اگرچہ پاکستان کی تاریخ اور جدید نوآبادیت سے اس کی موجودہ وابستگی میں ایک طاقتور اور مقبول سامراج مخالف رجحان کے لیے ایک واضح بنیاد موجود ہے مگر موجودہ امریکہ مخالفت لازمی طور پر سامراج مخالفت نہیں ہے اس مخالفت کا زیادہ تر حصہ، جنرل ضیا کی حکومت کو امریکی حمایت کے خلاف احتجاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ مغلوب قومیتوں کے بااثر گروپوں کی امریکہ مخالفت، جو بہت پہلے سے چلی آ رہی ہے، کی بنیاد بھی اس حقیقت پر ہے کہ امریکہ نے پاکستان کی فوج اور بیوروکریسی کو حوصلہ دیا اور آمرانہ حکومتیں قائم کرنے میں مدد دی اور ان حکومتوں نے ان کے قومی حقوق سلب کر دیئے۔ ان بااثر طبقوں کی امریکہ مخالفت سے اگرچہ عام لوگ سامراج مخالف بن گئے مگر ان بااثر طبقوں کے مفادوں اور امریکی مفادوں کے درمیان کہیں کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے۔ بنگالی قومی تحریک خاص طور پر عوامی لیگ، پچاس کی دہائی کے ابتدائی دور کی امریکہ مخالفت کے بعد، اس وقت امریکہ نواز بنتی گئی جب امریکہ نے

ان کے مطالبوں کے تئیں اپنی حمایت کا اظہار کیا۔ ولی خان نے پختون قوم پرستی کے تئیں اپنا موقف نرم کرنے سے پہلے ہی امریکہ۔ مخالفت سے منہ موڑ لیا۔ بلوچ قوم پرست بلوچستان کے ساحلی علاقوں پر امریکی اڈے قائم کرنے کی زبردست مخالفت کرتے رہے ہیں۔ مگر ان کی اس مخالفت کو اس وقت سخت آزمائشی دور سے گزرنا پڑے گا جب امریکہ آزاد بلوچستان کی حمایت کرے گا جس کا کوئی امکان نہیں۔ سندھی قومی تحریک نے، طالب علموں کے، بائیں بازو کے گروپوں اور کسانوں کو چھوڑ کر کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ سامراجیت کے خلاف ہے۔ غالب طبقوں کے درمیان بنیادی لڑائی تو یہ ہے کہ ان کو جدید نوآبادیاتی ترقیات کے فائدوں کے حصے نہیں ملتے اس لیے ظاہر ہے کہ سامراج مخالفت کی کوئی حقیقی بنیاد موجود نہیں۔

لیکن عام لوگوں میں امریکہ کے خلاف اس لیے شدید جذبات پائے جاتے ہیں کہ اس نے پاکستان میں آمریت کو قائم کرنے میں مدد دی تاکہ پاکستان کی خودمختاری کی بنیادوں کو کھوکھلا کیا جائے اور اس کو ایک محاذی ملک کے طور پر استعمال کیا جائے۔ امریکی رول کے بارے میں نظریات کا یہ اختلاف، پاکستان کے عوام اور جمہوری اور قومی لیڈروں کے درمیان، جن کا تعلق حاوی طبقوں سے ہے، جھگڑے کا باعث بن کر رہے گا۔

موجودہ ٹکراؤ کو دور کرنا

اگرچہ ہمارے اس تجزیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں جمہوری اداروں کے قیام کے لیے سماجی بنیادیں کمزور ہیں، لیکن اس سے وہ تضادات بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں جن میں، محدود حمایت پر قائم فوجی حکومت شدت پیدا کر رہی ہے۔ ضیاء سرکار ملک کی اہم اور بڑی بڑی سیاسی قوتوں کا اتحاد قائم کرنے کی کوشش کے بدلے میں، جس سے سیاسی استحکام پیدا ہو جاتا، وسیع پیمانے کی سماجی قوتوں کی صفوں کے خلاف کمربستہ ہو گئی ہے۔ ان قوتوں کے لیے اس کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ ایک ایسا نظام قائم کرنے کی کوشش کریں جس کی بنیاد نمائندہ حکومت پر قائم ہو اور جس میں وہ اپنے باہمی جھگڑوں کو طے کرانے اور اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کے قابل ہو جائیں۔ یہ بات فوج، اس کے اتحادیوں اور اس کے عالمی سرپرستوں سے چھپی نہیں۔ اسی لیے انہوں نے ریفرنڈم کا ناٹک کھیل کرا اور اسمبلی انتخابات میں دھاندلیاں کر کے ضیاء سرکار کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ اس سے فائدہ ہونے کے بدلے الٹا نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریفرنڈم کے لیے دس فیصد سے بھی کم لوگوں نے اپنے ووٹ کا استعمال کیا۔ اور جہاں تک قومی اسمبلی کے انتخابات کا تعلق ہے تو بہت سخت سرکاری کنٹرول کے باوجود اور گیارہ پارٹیوں کے اتحاد ایم آر ڈی اور جمعیۃ العلماء پاکستان کی طرف سے بائیکاٹ کے باوجود ان میں ضیاء کے اہم حمایتیوں

کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسی شکست کے پیش نظر جنرل ضیاء نے اسمبلی کے اجلاس سے پہلے ہی آئین میں زبردست تبدیلیاں کیں کیونکہ اسمبلی میں ان اہم اور بڑی تبدیلیوں کے لیے دو تہائی اکثریت کی ضرورت تھی۔

چونکہ ضیاء یہ دعوی کر رہے ہیں کہ انھیں آئندہ پانچ برسوں کے لیے بحیثیت صدر حکومت کرنے کا اختیار عوام سے حاصل ہوگیا اور انھوں نے ملک میں جمہوریت بحال کی ہے۔ اس لیے مارشل لا کو جاری رکھنے کے سلسلے میں ان کی دلیل بہت کمزور ہوگئی ہے۔ مگر اس کے باوجود مارشل لا اٹھانے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں اس لیے کہ انھیں ڈر ہے کہ مارشل لا عدالتوں اور مارشل لا ضابطوں کا خوف ختم ہونے سے وہ زیادہ دنوں تک اقتدار میں نہیں رہ پائیں گے۔ نیشنل سیکورٹی کونسل، جس پر فوج کا غلبہ ہے اور جسے ملک میں ہنگامی حالات کے اعلان کا حق حاصل ہے، قائم ہونے کے علاوہ صدر کے ہاتھ میں وسیع اختیارات دینے سے غیر فوجی کابینہ اور قومی اسمبلی کے عملی اختیارات بالکل صفر کے برابر رہ گئے ہیں۔

بااثر طبقوں اور مفاد پرست گروپوں کے درمیان ایک مستحکم اتحاد قائم کرنے کے بدلے جو اقدامات فوجی حکومت کی طرف سے کیے جا رہے ہیں ان سے چھوٹی قومیتیں اس حکومت سے اور زیادہ ناراض اور نالاں ہو جائیں گی اور مختلف بااثر طبقوں یا گروپوں میں مصالحت میں رکاوٹ آئے گی۔ ضیاء اور حزب اختلاف میں ٹکراؤ بڑھنے کا امکان ہے اور اس کے نتیجہ میں شاید مارشل لا ختم کیا جائے جو ضیاء کے اقتدار سے دستبردار ہونے یا اس کو ہٹائے جانے کا پیش خیمہ ہوگا۔ اگر وہ مارشل لا ہٹائے جانے کے مطالبہ کے باوجود، جو بہت زور حاصل کرتا جا رہا ہے، مارشل لا ہٹانے سے انکار کریں تو امکان یہ ہے کہ مسلح فوج کے اندر اختلافات پیدا ہوں اور وہ ضیاء سے الگ ہو جائے اور اپنے آپ کو ملک کی سلامتی اور استحکام کے بے لوث محافظ کی صورت میں پیش کرے اور سیاستدانوں سے کسی سمجھوتے کی فارمولا کے بارے میں سودا طے کرے۔

تحریک بحالیٔ جمہوریت (ایم آر ڈی) اگرچہ اس عرصہ کے دوران بنیادی آئینی مسئلوں کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہوئی ہے مگر وہ سنجیدگی کے ساتھ فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے یا تو رضامند نہیں یا اس میں اتنی اہلیت نہیں۔ اس لیے وہ بھی فوج کے ساتھ کسی قسم کا سودا طے کرنے کے لیے تیار ہوگی، جس کی بنیاد یہ ہو سکتی ہے کہ ۱۹۷۳ء کا آئین بحال کیا جائے اور اسی کے تحت انتخابات کروائے جائیں۔ فوج یہ چاہے گی کہ اس نے جو مارشل لا کے دوران کارروائیاں کی ہیں ان کے لیے قانونی جواز مہیا کیا جائے۔ اس کے علاوہ وہ معیشت میں زیادہ عمل دخل، زیادہ اقتصادی مراعات، حکومت کے انتظام میں، خاص طور پر خارجہ پالیسی میں، زیادہ اختیارات کا مطالبہ کریں۔ فوج اس بات پر اتفاق نہیں کرے گی کہ ان قومیتوں کو زیادہ حقوق دیئے جائیں جن پر اب تک غلبہ رہا ہے۔

اس قسم کا سمجھوتہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے قدامت پسندانہ ہوگا اور اس سے نہ تو وہ قومیتیں مطمئن ہوں گی جو مغلوب ہیں، نہ وہ لوگ جو ظلم و جبر کا شکار رہے ہیں اور نہ ہی سیاسی کارکن جنھوں نے مارشل کے خلاف

جدوجہد میں تکلیفیں اٹھائیں اور قربانیاں دیں۔ اس سمجھوتہ کے بعد، عوام کی طرف سے منتخب کی گئی حکومت کو، قومیتوں کے حقوق جیسے پیچیدہ اور نازک آئینی مسئلہ کو نمٹانا ہوگا، اور عام لوگوں کی آرزوؤں کو پورا کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے مختلف جماعتوں، طبقوں اور قوتوں کو اکٹھا ہونا پڑے گا اور اس اتحاد کی بنیاد اُس اتحاد سے جو بھٹو نے ۱۹۷۰ء میں قائم کیا تھا، زیادہ وسیع اور مختلف النوع ہونی چاہئے۔ بھٹو نے زمیندار اور متوسط طبقہ کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کیا اور کارکنوں، کسانوں اور دوسرے پسماندہ اور غریب لوگوں کی تمناؤں کا خیال رکھا مگر قومیت کے سوال کی طرف دھیان دینے میں وہ ناکام رہے۔ قومیت کے اس جھگڑے میں اب اتنی شدت آگئی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ جمہوریت اور قومیت کی تحریکوں کی وجہ سے اگرچہ طبقاتی جھگڑوں کی طرف ہماری نظریں نہیں جاتیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں بھی، مسلسل جدید نوآبادیاتی ترقیات اور ضیا سرکار کی طرف سے مزدور طبقوں کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ سختی سے دبانے کی وجہ سے تیزی آگئی ہے۔ پیپلز پارٹی کے موجودہ موڑ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پارٹی میں بھٹو کی کسانوں اور کارکنوں کو اہمیت دینے کی بات کو بھولنے کا رجحان پیدا ہوگیا ہے۔ اس سے اس کی مقبولیت پر اثر پڑے گا۔ اگر مستقبل قریب میں پاکستان میں منصفانہ انتخابات عمل میں لائے جائیں تو پیپلز پارٹی کے یہ انتخابات جیتنے کے امکانات ابھی بھی اچھے ہیں مگر اس پارٹی کے پروگرام، طریقہ اور قیادت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ ان مسائل اور کام کو نمٹانے کے لیے تیار نہیں جس کا ایک منتخب سرکار کو سامنا ہوگا۔ وسیع پیمانہ کی حمایت، مضبوط لیڈرشپ اور موثر مقبول عام پالیسیوں کے بغیر نئی غیر فوجی سرکار کے سامنے دو راستے ہوں گے۔ ایک یہ کہ وہ فوج کی مدد لے کر زبردست ظالمانہ اور جابرانہ کارروائیاں شروع کرے ورنہ منتشر ہوکر ختم ہو جائے۔ منتخب سرکار کے خاتمہ سے فوج کی طرف سے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے شاید پھر حالات پیدا ہو جائیں اور ظلم و جبر اور اس کے خلاف مزاحمتی کارروائیوں کا چکر دوبارہ شروع ہو جائے۔ ایسا ہوا تو اب کی بار یہ چکر خونریز ہوگا اور اس میں کہیں کوئی استحکام نہیں ہوگا۔

۶۔ جنوبی ایشیا میں نوآبادیاتی دور کے بعد کا نظامِ سیاست اور پاکستان

حسن این۔ گردیزی

اب اس بات سے ہر کوئی واقف ہے کہ پاکستان اپنے قیام کی مختصر سی تاریخ میں ایسے سیاسی بحرانوں میں سے گزر گیا ہے جو اپنی تعداد، اپنے تنوع اور شدت کے لحاظ سے ایشیا کی جدید تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ مشرقی پاکستان کے علاحدہ ہونے کے بعد بھی پاکستان میں مرکزی حکومتیں اپنے ملک کے لیے وفاقی بنیادوں پر کوئی ڈھانچہ تعمیر کرنے میں کامیاب نہ ہوئیں۔ فوجی قوت اور مطلق العنان مذہبیت وہ دو بڑے آلے ہیں جن کے ذریعہ پاکستان کو ایک ایسا ملک بنایا گیا ہے جس میں مرکزیت اور وحدت پر زور ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر یہ شاید عجیب محسوس ہو کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد کی عام سیاسی اور اقتصادی نشو ونما پر غور کرنے کے لیے ہم پاکستان کی بات کریں۔ پھر بھی اگر ہم نکوس پاولنتاس کے اس خیال سے اتفاق کریں کہ نظامِ حکومت ایک پتھر کا ستون نہیں بلکہ ایک ایسا میدان ہے جس میں ترکیبوں اور تدبیروں کا مظاہرہ کیا جاتا ہے تو ہمیں پاکستان کی پُرآشوب تاریخ ایک ایسے اکھاڑے کی صورت میں نظر آئے گا جس میں اقتدار و اختیار پر قابض لوگوں اور اس پر قبضہ کرنے کے لیے جدو جہد کرنے والوں نے ہر طرح کے داؤ پیچ اور چالیں آزمالیں۔ اس ساری کش مکش میں شاید ہمیں نوآبادیت کے بعد کے نظامِ سیاست کے اور اس کی ساخت کے بارے میں کچھ اشارے موجود ہیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ پاکستان کے طرزِ نظام میں حکومت کو چوں کہ زبردست اختیارات حاصل رہے ہیں، قانونی بھی اور جابرانہ بھی، اسی لیے یہ زیادہ ترقی یافتہ ہے اور اس سے بدعنوانیوں اور کنبہ پروری کو رواج ملا ہے۔ اس تجزیہ کا سہرا حمزہ علی کے سر ہے، جن کے خیال میں پاکستان کے موجودہ نظام کی

تمام تر ذمہ داری اس کے نوآبادیاتی ماضی اور دورِ حاضرہ کے جدید نوآبادیاتی نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس تجربہ کے مطابق سابق نوآبادیوں میں جو سیاسی ڈھانچہ صورت پذیر ہوا وہ ملکی طریقۂ پیداوار کی دین نہیں تھی اور نہ ہی اس کے ارتقا سے ظہور پذیر ہوا تھا۔ بلکہ ادارے اور متعلقہ قانونی ضوابط نوآبادیاتی طاقتوں کے سرمایہ دار طبقہ یعنی میٹروپالیٹن بورژوازی نے اپنی نوآبادیوں پر مسلّط کیے تھے۔ نوآبادیات کی ان بورژوازی حکومتوں کو نہ صرف وہ کام انجام دینے تھے جو ان کے لیے میٹروپالیٹن ملکوں (نوآبادیاتی ملکوں) نے مخصوص کیے تھے۔ بلکہ اِن کاموں کے علاوہ ان کو جابرانہ نوعیت کا ایک وسیع انتظامی ڈھانچہ بھی تشکیل دینا تھا۔ جس کے ذریعہ نوآبادیوں میں روایتی اور ابھرتے ہوئے سماجی طبقوں کو دبایا جا سکے۔ اس لیے نوآبادیوں میں موجود ڈھانچہ کے مقابلہ میں ان کا یہ اوپر ڈھانچہ ابتدا ہی سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ کیوں کہ اس کو (اوپری ڈھانچہ) میٹروپالیٹن ملکوں کے ڈھانچہ کے مطابق تشکیل دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نوآبادیاتی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد اِن سابق نوآبادیوں میں جو سول سروس، پولیس اور فوج پر مشتمل انتظامی ڈھانچہ موجود تھا وہ وہی تھا جو نوآبادکاروں نے چھوڑا تھا اس لیے یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے جابرانہ تھا۔

آزادی کے وقت اس ڈھانچہ کی طاقت اور نوعیت کو بدلا جا سکتا تھا یا اس میں نرمی لائی جا سکتی تھی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کے برعکس بہت سے نوآزاد ملکوں نے، جن میں پاکستان شامل ہے، دباؤ اور جبر کے اِن آلوں کو اور وسیع کر دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اگر نقیبر ڈااسکوک پول کے نظریہ سے اتفاق کیا جائے تب تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نظم و نسق اور جبر و دباؤ کی تنظیمیں حکومت کی طاقت اور قوت کی اساس ہیں اور کوئی بھی حکومت ایسی تنظیموں کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے رسائل مہیا کرتی ہے۔ مگر ہماری رائے میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ مرحلہ سے پہلے کے طریقۂ پیداوار سے سرمایہ دارانہ دور تک کے طریقۂ پیداوار تک کا ارتقا اِن ملکوں میں نامکمل رہا۔

یہ بات اب کسی سے چھپی نہیں کہ نوآبادیاتی حکمرانی کے تحت تیسری دنیا کے کسی بھی ملک میں سرمایہ داری کا ایسا ڈھانچہ تیار نہیں ہوا جسے کسی پر انحصار نہ کرنا پڑے یعنی جو خود کفیل ہو۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ میٹروپالیٹن معاشروں میں، بورژوا جمہوری انقلاب سے جاگیردارانہ طریقۂ پیداوار بالکل نیست و نابود ہو گئے اور ایک ایسے واحد صاحب جائداد طبقہ کا جنم ہوا جو سیاسی نظام پر چھایا رہا۔ اگرچہ سرمایہ دارانہ جمہوریت خود مختاری کی دعوا دار ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عملی طور پر وہاں حکومت بورژوا طبقہ ہی کرتا ہے۔ دوسری طرف نوآزاد ملکوں کے نظام سیاست پر مختلف صاحب جائداد طبقے چھائے ہوئے ہیں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہاں جاگیردارانہ نظام کی ایک بدلی ہوئی صورت پر ایک ماتحت سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد رکھی گئی ہے اور اس پر جزئیات سے قطع نظر

تین طبقوں کا غلبہ ہے۔ یہ طبقے ہیں۔ زمیندار، بورژوا اور میٹرو پالیٹن بورژوا۔ ان میں سے کوئی ایک اپنے طور پر ملک کے سیاسی نظام پر مکمل اثر و رسوخ قائم نہیں کر سکا ہے۔ اس صورت حال سے ملک میں بیوروکریسی اور فوج کے گٹھ جوڑ کی طرف سے حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی بات ممکن ہو گئی۔ یہ گٹھ جوڑ اپنے قواعد و ضوابط اور اختیارات کو ان تین با اثر طبقوں کے باہمی جھگڑوں اور ٹکراؤ کو نمٹانے کے لیے مصالحتی کردار ادا کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ گٹھ جوڑ ان طبقوں کے مفادات کا دبے ہوئے اور غریب عوام کی طرف سے امکانی اور حقیقی خطروں سے تحفظ بھی کرتا ہے۔ اس بات کو سامنے رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کا نظام حکومت نہ صرف زیادہ ترقی یافتہ ہے بلکہ عوام سے بیگانہ اور الگ بھی اور سماج کے باقی حصوں پر اس کو ضرورت سے زیادہ طاقت اور اختیارات حاصل ہیں۔

مگر اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ میٹرو پالیٹن بورژوا طبقہ اگرچہ پاکستان کے تین با اثر طبقوں میں ایک ہے لیکن ملک کی سیاسی معیشت کو جدید نو آبادیاتی سرمایہ دارانہ ڈھانچہ کے اصولوں کے ساتھ مربوط کرنے کی وجہ سے ان تین طبقوں میں یہ طبقہ سب سے زیادہ طاقت ور طبقہ ہے۔ بہت سے ماہرین نے جدید نو آبادیاتی سرمایہ داری کے اس رول کی اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو اس نے نو آبادیت کے دور کے بعد کے نظام حکومت کے کردار کا تعین کرنے میں اور وہ طریقہ کار مقرر کرنے میں انجام دیا جو ملک کے اندر اپنے اختیارات کا استعمال کرنے کے لیے اسے اختیار کرنا تھا۔ علوی کا خیال ہے کہ جب نو آبادیاتی دور کے بعد کسی ملک کی معیشت کو جدید نو آبادیاتی سرمایہ داری کے ساتھ مربوط کیا جائے، اس سے اس ملک کی حکومت کے لیے یہ لازمی بن جاتا ہے کہ وہ عوامی پالیسیاں وضع کرتے وقت ان ہدایات پر عمل پیرا ہوں جو جدید نو آبادیاتی سرمایہ داری سے حاصل ہوں۔ لیکن جیمس پیٹرا اس کا خیال ہے کہ نو آبادیت سے آزاد ہوئے ملکوں میں آمریت اور جدید فسطائیت کے پھیلاؤ کا تعلق اُن کے اس بنیادی کام سے ہے کہ وہ اپنے اپنے ممالک میں سرمایہ دار ملکوں کی سرمایہ کاری کے لیے راستہ ہموار کریں۔

اب اس نظریاتی پس منظر میں ہم پاکستان کے حکومتی ڈھانچہ، اقتدار اعلا اور طبقاتی بنیاد کا جائزہ لیں گے۔ ہم اس عام مشاہدہ سے اپنی گفتگو کا آغاز کریں گے کہ پاکستان کی تاریخ کے بیشتر حصہ میں وہاں کا اقتدار و اختیار بیوروکریسی اور فوج کی ملی بھگت کے ہاتھوں رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی باگ ڈور مسلم لیگ کے ہاتھ آئی۔ جس نے برطانی سامراج سے حکومت حاصل کی۔ یہ وہی جماعت ہے جس نے ہند کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک حاصل کرنے کی تحریک کی رہنمائی کی تھی۔ پاکستان کے قیام کے بعد یہ جماعت اپنے نظریاتی اور طبقاتی تضادات کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئی۔ مسلم لیگ کے بانیوں کا تعلق ہندوستانی مسلمانوں کے اُس خصوصی طبقہ سے تھا، جنھوں نے مغرب کے جدید ماحول اور روشن خیالی کی روایتوں میں تعلیم حاصل کی

تھی یا اس سے متاثر ہوئے تھے۔ اُن کا مقصد تھا، ہندوستان میں اپنے ہم مذہبوں کی سماجی ترقی، سیاسی امور میں ان کی شمولیت اور ان کی اقتصادی خوشحالی کا حصول۔ جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ مقصد متحدہ آزاد ہندوستان کے ڈھانچہ میں مسلم اقلیت کے حقوق کے لیے آئینی تحفظات حاصل کرنے سے پورا نہیں ہو جائے گا تو ایک علاحدہ مسلم مملکت کا تصور سامنے رکھا گیا اور اس صدی کی تیسری دہائی میں مسلم لیگ نے اس مقصد کو پانے کے لیے ایک پرزور تحریک شروع کی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ مملکت کا تصور ۱۹۴۷ء میں حقیقت بن گیا۔ اس تصور سے دو اور نظریات بھی مشتق ہیں۔ یعنی "دو قومی نظریہ" اور "اسلامی مملکت"۔ انہی دو نظریوں نے وقت گزرنے کے ساتھ "تصور پاکستان" (پاکستان آئیڈیولوجی) کی صورت اختیار کی۔ دو قومی نظریہ کے مطابق ہندوستان میں رہنے والے ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں جن کی تاریخ، روایات اور تمدن ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اس نظریہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اسلام پر عقیدہ ایک ایسی شرط ہے جو پاکستان کی قومیت اور مذہبی بنیاد پر ایک اسلامی مملکت بننے کے لیے لازمی بھی ہے اور کافی بھی۔ لیکن "تصور پاکستان" کو اساس مانتے ہوئے جب یہ سوال پوچھا جائے کہ مشرقی پاکستان ایک مسلم علاقہ ہونے کے باوجود ۱۹۷۱ء میں اس نئی مملکت سے الگ کیوں ہوا؟ اور پاکستان کے باقی حصوں میں، مارشل لا حکومتوں کو قومی اتحاد کے نام پر لوگوں کو دبانے کے لیے فوجی طاقت کے ظالمانہ استعمال کی ضرورت کیوں پڑی؟ تو اس آئیڈیولوجی میں اس کی کہیں کوئی تاویل نہیں ملتی۔

بہر حال، تقسیم کے بعد، مسلم لیگ نے ملک کو انتشار سے بچانے کے لیے اس آئیڈیولوجی کو استعمال کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یہ پارٹی اب زمین مالکوں کی پارٹی بن کے رہ گئی تھی اور محنت کش عوام سے بیگانہ۔ اس لیے یہ پاکستان میں جمہوریت کی مخلوط جمہوری روایات کی نشو و نما کرنے میں ناکام رہی۔ "تصور پاکستان" کا واسطہ لوگوں کے روٹی روزی کے مسئلے حل نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اب جو اس تصور میں رجعت پسندانہ خاصیتیں ہیں ان کے بعد کے برسوں میں بنیاد پرست علما اور مطلق العنان فوجی حکمرانوں نے پوری طرح بروئے کار لایا۔ مسلم لیگ کی عوامی مقبولیت میں کمی اور اس کے دو بڑے رہنماؤں کی موت سے ایسے حالات پیدا ہو گئے جو بیوروکریسی کی طرف سے اقتدار پر غصب کرنے کے لیے سازگار تھے۔ وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد ۱۹۵۱ء میں ایک سینیر سرکاری عہدے دار غلام محمد کو پہلے ہی گورنر جنرل کے عہدے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں جب مسلم لیگ مشرقی پاکستان میں صوبائی انتخابات میں منہ کے بل گر گئی تو غلام محمد نے گورنر جنرل کے غیر معمولی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور پاکستان میں ہنگامی حالات نافذ کر دیے۔ انھوں نے آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا،

جس پر مسلم لیگ کا غلبہ تھا اور جو قیام پاکستان کے بعد لے دے کے ایک پارلیمنٹ کا بدل بھی تھی۔ اسلامی آئین تیار کرنے کی ذمہ داری اسی پر عائد تھی (چھ سال کی طویل مدت میں یہ اسمبلی اس اتفاق پر پہنچ گئی کہ پاکستان کی سرداری اللہ کا حق ہے)۔ مرکز میں جماعتی سرکار کے بدلے ایک مخلوط وزارت قائم کی گئی جس میں ہر "صلاحیت" کے لوگ شامل تھے۔ چنانچہ فوج کے سربراہ جنرل ایوب خاں اس وزارت میں وزیر دفاع مقرر ہوئے۔ اس طرح سے بیوروکریسی اور فوجی گٹھ جوڑ نے ملک کے انتظامیہ پر مکمل اور براہ راست کنٹرول حاصل کرلیا۔ اگلے چار سال کے دوران میں غلام محمد کو ہٹا کر ایک اور اعلا افسر سکندر مرزا کو گورنر جنرل کے عہدے پر بٹھا دیا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں نئی آئین ساز اسمبلی نے جمہوری طرز کا ایک آئینی ڈھانچہ پیش کیا جس میں پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ قرار پایا۔ قبل اس کے اس آئین کے تحت انتخابات عمل میں لائے جاتے۔ جنرل ایوب نے فوجی بغاوت کے ذریعہ حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اس طرح ۱۹۵۸ء میں جنرل (بعد میں فیلڈ مارشل) ایوب خاں کے دس سالہ دور اقتدار کا آغاز ہوا۔

اس مدت کے دوران مسلم لیگ کے زمینداروں نے دیہاتی علاقوں میں اپنے مقامی اثر و رسوخ پر اکتفا کیا اور سرکاری افسروں کی بدعنوانیوں اور رشوت ستانیوں سے اپنے مقاصد پورے کرتے رہے جب ایوب خاں نے اپنے ۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت ایک الیکٹورل کالج کے ذریعہ صدارتی انتخابات لڑے تو زمینداروں کے ایک بڑے حصہ کو اس کی پشت پناہی کے لیے منظم کیا گیا۔ اس طرح سے جب پاکستان کے بااثر طبقوں میں سے ایک یعنی زمیندار طبقہ اپنی جماعت کے ذریعہ حکومت کے اقتدار پر اپنا اختیار برقرار رکھنے میں ناکام ہوا تو اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس نے اپنی معاشی برتری کا استعمال کر کے حکومت کے کارندوں کو لالچ دیا اور موقع ملنے پر بیوروکریسی اور فوجی حکومتوں کی طرف سے قائم کی گئی کٹھ پتلی وزارتوں اور اسمبلیوں کا ممبر بن گیا اور اس طرح اپنے مفادات پورا کرتا رہا۔ ایسی اسمبلیوں کی پست ترین مثال جنرل ضیا کی مجلس شوریٰ ہے جس کو انھوں نے ۱۹۸۱ء تشکیل دیا۔

پاکستان کا دوسرا بااثر طبقہ ملکی بورژوازیوں کا ہے۔ یہ شہروں میں رہنے والے سرمایہ کاروں، تاجروں اور صنعت کاروں پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں ان کی تعداد بہت کم تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ معاشی طور پر ان کی طاقت میں اضافہ ہو گیا مگر تعداد کے لحاظ سے اس میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ تقسیم کے وقت پاکستان میں معدودے چند صنعتی ادارے تھے۔ یہ سب کے سب مغربی پاکستان میں تھے اور ان کے مالک وہ ہندو تھے جو ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے۔ تقسیم کے بعد بہت سے سرمایہ دار اور تاجر ہندوستان سے آکر پاکستان میں آباد ہوئے۔ پاکستان کا ابھرتا ہوا بورژوازی طبقہ ہندوستان سے آئے ان سرمایہ داروں اور پاکستان میں موجود کچھ تاجروں پر مشتمل تھا۔ جہاں تک ان کارخانہ داروں کے

سماجی پس منظر کا تعلق ہے۔ ان میں سے اکثر لوگوں کا تعلق ان نسلی گروپوں سے تھا جو اقلیت میں تھے۔ یہ عوامل ان کارخانہ داروں کی راہ میں حائل تھے اور وہ کسی ایسی جماعت کے ذریعہ، جو ان کی اپنی ہو یا پسند کی ہو، اپنا سیاسی اثر قائم کرنے میں ناکام رہے۔ حالاں کہ ان میں چند تاجر اور بینکوں کے مالک ابتدا ہی سے مسلم لیگ کے سرکردہ ممبر رہے تھے۔

پاکستان میں ملکی بورژوازی کے سیاسی رول کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ بیوروکریسی نے ملک کی صنعتی ترقی کے لیے کس رفتار سے کام کیا اور اس کے لیے کیا طریقۂ کار اختیار کیا۔ آزادی کے فوراً بعد سرکاری افسروں نے تیز تر صنعتی ترقی کو اپنا شعار بنایا کیوں کہ وہ ہندوستان کی صنعتی ترقی اور قوت کو پاکستان کے وجود کے لیے ایک زبردست خطرہ تصور کرتے تھے۔ اس لیے پرائیویٹ سیکٹر میں صنعتوں کو بڑھاوا دینے کے لیے بہت سے اقدامات کیے گئے۔ برآمدی پالیسی نرم کردی گئی، ٹیکسوں میں چھوٹ دی گئی۔ مزدور یونینوں پر بندشیں لگادی گئیں۔ زرمبادلہ پر بونس دیا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت نے پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے ذریعہ صنعتیں قائم کیں اور پھر ان کو پرائیویٹ سیکٹر میں منتقل کیا۔ ان تمام پالیسیوں سے ملک کے بورژوازیوں اور بیوروکریسی کے درمیان ایسے اچھے تعلقات قائم ہوئے جن کو دیکھ کر بڑے سے بڑا زمیندار رشک کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پاکستان کا یہ بورژوازی، بیوروکریسی اور فوج کے گٹھ جوڑ کی طاقت کے بڑھنے اور وسیع ہونے پر مطمئن رہا کیوں کہ وہ دولت بٹورنے میں اور سرکاری افسروں کو رشوتیں وغیرہ دے کر اپنا الو سیدھا کرنے میں لگا تھا۔

ایوب خاں کے دور اقتدار میں (۶۹-۱۹۵۹ء) پاکستان سیاسی اور اقتصادی ترقی کے ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ فوجی اتحادوں، اور بیرونی امداد اور سرمایہ کاری سے ملک پر امریکہ کے اثرات گہرے ہوگئے۔ امریکی صلاح کار، اقتصادی، تکنیکی اور منصوبہ بندی کے ماہرین پاکستان آئے تاکہ پاکستان کی ترقیاتی حکمت عملی اور منصوبوں کو تشکیل دینے میں ایک نمایاں حصہ لیں۔ صنعت کاری میں حکومت کا رول مزید بڑھ گیا اور حکومت کے کئی اکابرین، خود بھی تجارت اور صنعتوں کے شعبہ میں شامل ہوگئے۔ ان میں سینئر سول اور فوجی افسران شامل تھے جنھوں نے تجارت اور صنعتوں کی دنیا میں براہ راست یا اپنے رشتہ داروں کے ذریعہ شمولیت کی۔ اسی دور میں پاکستان کے تیسرے بااثر طبقہ، میٹروپالیٹن بورژوازی نے بے پناہ ترقی کی۔ یہ طبقہ مکمل طور پر مقامی نہیں ہے بلکہ یہ میٹروپالیٹن سرمایہ کی نمائندگی کرتا ہے جس کا بنیادی مرکز امریکہ میں ہے۔ امریکی، فوجی، اقتصادی اور ٹکنیکل امداد، جو پچاس کی دہائی کے وسط میں دی جانے لگی تھی، میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا۔ اس طبقہ کا سیاسی اثر ور سوخ بھی ملک میں بڑھتا گیا۔

پاکستان نے جو سیاسی اور اقتصادی پالیسیاں اختیار کیں، اور جن کی وجہ سے اسے وقت وقت پر

تباہ کن اور بیرونی بحران کا شکار بھی ہونا پڑا، ان پر باقی دو با اثر طبقوں کے مقابلہ میں اس میٹرو پالیٹن بورژوازی طبقہ کا بہت اثر رہا ہے۔ اگرچہ جماعت اسلامی جیسی رجعت پسند سیاسی پارٹیاں اس طبقہ کے مقاصد پورا کرتی ہیں مگر میٹرو پالیٹن بورژوازی نے اپنی تمام تر کارروائیوں کے لیے بنیادی طور پر بیوروکریسی اور فوجی گٹھ جوڑ کی حکومت کو استعمال کیا ہے۔ اس کا کبھی یہ مقصد نہیں رہا کہ ملک میں سیاسی اقتدار کے لیے ایک بورژوازی جمہوری متبادل مہیا کرنے کے لیے کوشش کی جائے۔ کیوں کہ اس کے مفادات "مستحکم" آمرانہ حکومتوں سے پورا ہو جاتے ہیں، جو میٹرو پالیٹن حکومت یعنی امریکہ کی اتحادی ہوں۔ اس طبقہ کے سیاسی موقف کی ترجمانی اس بیان سے ہوتی ہے جو اقوام متحدہ میں امریکی سفیر جین کرک پیٹرک نے دیا اور جس میں انھوں نے کہا کہ اُن کا ملک آمرانہ حکومتوں کے ساتھ کاروبار تو کر سکتی ہے مگر مطلق العنان حکومتوں کے ساتھ نہیں۔ ان کا اشارہ کمیونسٹ حکومتوں کی طرف تھا۔ لیکن ان تمام حقائق کے باوجود پاکستان میں آمرانہ حکومتیں اس طبقہ کے لیے ایک ایسی مستحکم فضا پیدا کرنے میں ہمیشہ ناکام رہیں جس میں وہ بہت دیر تک اپنا کام کاج کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایوب کی حکومت کے ختم ہو جانے اور بعد کے واقعات کو نظر میں رکھ کر میٹرو پالیٹن بورژوازی نے نئی سرمایہ کاری تو بالکل بند کی اور پہلے جو سرمایہ لگا تھا اس کو ملک سے باہر لے جانے لگا۔

پاکستان کے سماجی ڈھانچہ میں ان تین با اثر طبقوں کی حیثیت ہی ایسی تھی کہ وہ بیوروکریسی اور فوجی گٹھ جوڑ کو چیلنج نہ کر سکے۔ جس کی طاقت اور اختیارات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جا رہا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے مغلوب طبقوں کے اندر بے چینی پھیل گئی۔ بورژوا طبقوں کی دولت میں اضافہ اور مجموعی قومی پیداوار بڑھنے سے کثیر پرولتاریہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ان کا طبقہ اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں اور تنخواہ دار ملازموں پر مشتمل تھا۔ ان کی آمدنی میں ایک طرف سے تو کمی ہونے لگی اور دوسری طرف سے دولت صرف چند ہاتھوں میں جمع ہونے لگی۔ چنانچہ ۱۹۶۸ء میں ایک اعلا سرکاری افسر نے یہ انکشاف کیا کہ پاکستان میں ۸۷ فی صد بینک کاری اور انشورنس اور ۶۶ فی صد صنعتی اثاثوں کے مالک ملک کے صرف ۲۲ خاندان ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات یہ ہوئی کہ جو بھی نئی صنعتیں لگائی گئیں وہ مغربی پاکستان میں قائم ہوئیں جس سے زبردست علاقائی نابرابریوں کو جنم ملا۔ تیسری بات یہ کہ صنعتی پیداوار ان چیزوں پر مشتمل تھی جو درآمدی اشیا کی مبدل تھیں۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو صرف اونچے طبقہ کے لوگ استعمال کر سکتے تھے۔ غریب لوگوں کی بنیادی ضرورت کی چیزوں کی پیداوار کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔

زرعی ترقی میں بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ اس صدی کے وسط میں پاکستان میں "سبز انقلاب" کا پروگرام شروع تو ہوا لیکن اس پر خاص طور پر پنجاب اور سندھ کے ان

علاقوں میں عمل درآمد ہوا جہاں آبپاشی کی سہولیات میسر تھیں۔ اور اس کا اثر بھی دیہاتی آبادی کے مختلف حصوں پر بہت حد تک غیر مساوی رہا۔ زیادہ تر فائدہ ان بڑے زمینداروں کو حاصل ہوا جو جدید زرعی سازوسامان استعمال کرنے کی پوزیشن میں تھے اور جنھوں نے کھادوں اور جراثیم کش دواؤں کا استعمال کیا۔ چھوٹے زمین مالکوں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ زراعت کے جدید طریقے اپنا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پیداوار کے لحاظ سے پیچھے رہے اور ان کی آمدنیوں میں کمی ہوئی۔ اس کے علاوہ کھیتوں میں جدید زرعی آلات کے استعمال اور ۱۹۵۹ء کی زرعی اصلاحات کی وجہ سے بڑے بڑے زمینداروں نے بڑے پیمانہ پر کاشتکاروں کو اپنی زمینوں سے بے دخل کرنے کا کام شروع کیا۔

ان حالات کی وجہ سے جو بے اطمینانی اور بے چینی پھیل گئی اس کو آخر کار قومی پیمانہ پر ایک احتجاجی تحریک کی صورت مل گئی۔ ۱۹۶۸ء میں جب ایوب خاں کے دور اقتدار کے دس سال مکمل ہونے پر "ترقی کی دہائی" منانے کے سلسلہ میں سرکاری تقریبات کے پروگرام مرتب کیے جا رہے تھے۔ مشرق اور مغرب دونوں جگہ ہزاروں کارکن، کسان، طالب علم اور دوسرے طبقے حکومت کے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔ مغربی پاکستان میں ایوب خاں کی حکومت کے ایک سابق وزیر ذوالفقار علی بھٹو نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور انھوں نے ایک سیاسی پارٹی کا قیام عمل میں لایا۔ جس کے منشور میں کہا گیا کہ یہ پارٹی مخلوط جمہوری ڈھانچہ میں پاکستان کے مغلوب اور مظلوم طبقوں کے مفادات کی نمائندہ ہے۔ عوامی دباؤ کے تحت ایوب خاں کی حکومت برقرار نہ رہ سکی اور ایوب کی جگہ جنرل یحییٰ خاں نے اقتدار سنبھالا۔ انھوں نے ملک کا انتظام چلانے کے لیے مارشل لا کا استعمال کیا مگر یہ وعدہ کیا کہ وہ بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات عمل میں لائیں گے اور ملک کو واپس جمہوریت کی راہ پر لائیں گے۔ یہ انتخابات ۱۹۷۰ء میں ہوئے۔ مغربی پاکستان میں بھٹو کی پیپلز پارٹی نے وفاقی اسمبلی کی اکثر سیٹوں پر کامیابی حاصل کی۔ مگر مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمان کی "عوامی لیگ" نے صوبائی خود مختاری کا نعرہ دے کر چناؤ لڑا اور جیتا اور وفاقی اسمبلی میں اسی پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی۔

اس سے یحییٰ خاں کی حکومت مشکل میں پھنس گئی۔ عوامی لیگ مکمل طور پر مشرقی پاکستان کی پارٹی تھی اور ایسی پارٹی کو اقتدار سونپ دینے کا مطلب صرف یہ نہیں تھا کہ ملک کے معاملات پر مغربی پاکستان کا غلبہ ختم ہو جاتا، بلکہ اسے فوج اور سینئر بیوروکریسی کے مراعات کے لیے بھی ایک خطرہ تصور کیا گیا، کیوں کہ فوج اور بیوروکریسی کے بہت بڑے حصہ کا تعلق مغربی پاکستان، بلکہ پنجاب کے ساتھ تھا۔

اس لیے یحییٰ خاں نے چناؤ نتائج پر عمل درآمد میں اڑچن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان میں مزاحمت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ یحییٰ خاں نے اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے فوجی طاقت کا استعمال کیا جس کی وجہ سے وہاں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ پھر ہندوستان کی فوجی مداخلت سے ۱۹۷۱ء مشرقی پاکستان

الگ ہو گیا۔

اس سے پاکستان کی فوج کو ذلّت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ بہت پست ہمّت ہو گئی۔ اور اس نے اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کو سونپ دیا جنھوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں "روٹی کپڑا اور مکان" کا نعرہ دے کر رائے عامہ کو اپنی طرف کر دیا تھا۔ ان کی حکومت نے ایک نئے آئین کے تحت پارلیمانی جمہوریت بحال کر دی۔ اس کے علاوہ بنیادی صنعتوں، بنکوں، انشورنش کمپنیوں اور تعلیمی اداروں کو سرکاری تحویل میں لیا اور سماجی جمہوریت کے اور بھی بہت سے اصلاحات کی ابتدا کی۔

اب یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا اس طرح سے پاکستان جمہوریت کے اس راستے پر سختی کے ساتھ چلنے لگا جس کی تعریف مغربی ملکوں کی نصابی کتابوں میں یوں کی جاتی ہے ۔" ایک ایسی عوامی حکومت، جس کو عوام بنائے اور جو عوام کے لیے ہو۔" سیاسی تصورات اور عملی سیاست کے اپنے وسیع تجربوں اور حالات و واقعات کے بارے میں اپنی تیز حس کے باوجود بھی بھٹو کو یقین تھا کہ ایسا ہی ہوا ہے یعنی پاکستان جمہوریت کے راستے پر پوری طرح سے گامزن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ پاکستان کی فوج اور بیوروکریسی کی ملی بھگت کے رول سے پوری طرح واقف تھے۔ یہ اس امر سے عیاں ہو جاتا ہے کہ انھوں نے پاکستان کی سول سروس کے اعلیٰ افسروں کے اختیارات کم کر دیئے۔ کچھ بڑے بڑے جنرلوں کو ریٹائر کر دیا اور کمانڈر ان چیف کے عہدوں کو چیف آف اسٹاف میں بدل دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے قومی سلامتی فورس کا قیام بھی عمل میں لایا، ظاہر ہے، اس لیے کہ اگر کسی طرف سے بھی اقتدار، طاقت کے زور پر چھیننے کی کوشش کی گئی تو جوابی کارروائی کی جا سکے گی۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایک زبردست قوم پرست تھے۔ انھیں اس بات پر یقین تھا کہ ملک کی فوجی طاقت مضبوط ہونی چاہئے۔ فوج کو تو ۱۹۷۱ء کی ہند۔ پاک جنگ میں ذلّت آمیز شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا مگر بھٹو نے اس کو پھر سے مضبوط کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اور ایسا کرنے کے لیے انھوں نے جمہوریہ چین سے امداد حاصل کی ۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ وہ نیوکلیائی طاقت میں بھی ہندوستان کے ہم پلّہ رہنا چاہتے تھے۔ لیکن امریکہ نے ان کے نیوکلیائی پروگرام کی مخالفت کی اور یہ مخالفت ان کے لیے ایک مسلسل تکلیف کا باعث بنی رہی۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ وہ سول بیوروکریسی کے اختیارات کو کم کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر فوج کی مجلسی طاقت کے ساتھ چھیڑا نہیں گیا۔ نتیجہ یہ کہ ملک میں اقتدار کی کش مکش کی صورت میں اس کی دخل اندازی کی خاصیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

لیکن جمہوری حکومت کے آئندہ امکانات میں ابھی بھی ملک کے مختلف طبقوں کے اتحادوں کی نوعیت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ بھٹو نے ایک حقیقی انتخابی عمل کے بعد اقتدار حاصل کیا تھا اور یہ انتخابات ملک کی تاریخ میں پہلی بار عمل میں لائے گئے تھے۔ لیکن اقتدار حاصل کرنے کے بعد بھٹو نے اپنے جمہوری نظام کی حمایت کے لیے ایک نیا طبقاتی اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے کہ کارکنوں اور کسانوں کے مغلوب طبقوں میں ان کو کس قدر مقبولیت حاصل ہے۔ اور انھوں نے غالب طبقوں

کی طاقت سے نمٹنے کے لیے ایک ملی جلی حکمت عملی تیار کی۔ اگرچہ مالیاتی اداروں کو قومی ملکیت میں لینے پر ان اداروں کے مالکوں کو معاوضہ دیا گیا مگر ان اداروں کو سرکاری تحویل میں لینے سے بڑے مالیاتی اور صنعتی خاندانوں کی چھوٹے چھوٹے کارخانہ داروں اور بڑے بڑے زمینداروں کو قرضہ مہیا کرنے کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ حالانکہ اسکے ساتھ میں انھوں نے یہ بات بھی واضح کردی کہ وہ بورژوازی طبقوں کی معیشت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں مگر "سرکاری تحفظ کے سہارے نہیں بلکہ ان حالات کے تحت جو پرائیویٹ صنعت کاری کے لیے موزوں ہیں یعنی وہ حالات جن میں صنعتیں ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کرکے ترقی کریں"۔ بھٹو کے زرعی اصلاحات کے قانون سے انفرادی ملکیت کے زمینی رقبوں کی حد مزید کم ہوگئی۔ مگر اس قانون میں حسب معمول خامیاں تھیں، جن کا فائدہ بڑے بڑے زمیندار خاندانوں نے اٹھایا اور ان کے معاشی حالات میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ کچھ چھوٹے چھوٹے کسانوں کو بھی فائدہ ہوا لیکن جہاں تک عام کسانوں کا تعلق ہے ان کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ سرکاری اور قومی ملکیت کے اداروں کے کم اور درمیانی آمدنی والے ملازموں کی تنخواہوں میں اضافہ کردیا گیا مگر شہروں میں کارکنوں کی بے چینی پر قابو پانے میں حکومت ناکام ہوئی۔ ایوب کی حکومت کے خلاف مظاہروں میں پاکستان پیپلز پارٹی نے مزدور تحریک کے شانہ بہ شانہ لڑا تھا۔ اسوقت بہت سے مزدور لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا تھا اور ان کو جیلوں میں بند کردیا گیا تھا۔ پھر جب بھٹو نے اقتدار سنبھالا، انھوں نے ان لیڈروں کو رہا تو کیا اور قومی ملکیت کے کارخانوں کو یہ ہدایات بھی دیں کہ ان لیڈروں کو اپنی اپنی جگہوں پر واپس بحال کیا جائے، مگر مزدوروں کے ساتھ وہ وعدے پورے نہیں کیے گئے جو انتخابات کے دوران پارٹی نے کیے تھے۔ اس لیے جب ۷۳-۱۹۷۲ء میں کارکنوں نے اپنی جدوجہد نئے سرے سے شروع کی تو بھٹو سرکار نے ان کو پوری طاقت کے ساتھ کچل دیا۔ اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ "سڑکوں پر جو طاقت کا مظاہرہ کیا جارہا ہے اس کا جواب حکومت کی طاقت کے مظاہرہ سے دیا جائیگا"۔ کراچی کے صنعتی علاقوں اور دوسرے شہروں میں بہت سے کارکن پولیس فائرنگ میں مارے گئے۔

بھٹو نے طبقاتی مسئلہ سے نمٹنے کے لیے جو حکمت عملی اختیار کی اس کا بھرپور جائزہ لینے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان کی اس حکمت عملی میں تضاد تھا۔ ایک طرف تو وہ بااثر طبقوں کی طاقت میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کررہے تھے مگر دوسری طرف مغلوب اور مظلوم طبقوں کو اپنی حکومت میں کوئی مؤثر رول دینے کیلئے تیار نہیں تھے۔ وزارتی عہدوں اور اعلیٰ سرکاری عہدوں پر انھوں نے ان لوگوں کو تعینات کیا جن کا تعلق انکے اپنے زمیندار طبقہ کے ساتھ تھا۔ حالانکہ وہ کبھی کبھی اعلانیہ طور پر بڑے بڑے زمینداروں کی تذلیل بھی کرتے تھے۔ قومی ملکیت میں لینے کی کارروائی اور عوامی جلسوں میں ان کے تقریروں سے بورژوا طبقے کے مرتبے میں کمی تو آگئی مگر اس طبقہ کی حیثیت میں انقلابی تبدیلی لانے کے لیے جب مغلوب طبقے زور دیتے تھے تو بھٹو اس بورژوا طبقہ کی مدافعت کرنے لگتے۔ انھی پالیسیوں کی بنا پر ان کو کئی لوگوں نے بوناپارٹسٹ قرار دیا ہے۔ مارکس نے

۱۸۵۰ء میں نپیولین بوناپارٹ کے بارے میں لکھا تھا :

"بورژوازی کے ساتھ ساتھ، بوناپارٹ اپنے آپ کو کسانوں اور عام لوگوں کا نمائندہ سمجھتے تھے اور وہ بورژوازی ڈھانچہ میں نچلے طبقوں کو خوشحال بنانا چاہتے تھے ...... ان کی ذات میں موجود یہ تضاد ان کی سرکار میں بھی ظاہر ہو گیا.... کبھی ایک طبقہ کی تذلیل کرنا اور کبھی دوسرے کی...."

بھٹو کے اس طبقاتی تضاد کا سب سے سنگین نتیجہ شاید یہ تھا کہ وہ نام نہاد "پاکستان آئیڈیولوجی" جس کو کبھی "اسلامک آئیڈیولوجی" بھی کہا جاتا ہے، کی تمام رجعت پسندانہ خاصیتوں کو نہ سمجھ سکے اور نہ یہ کہ اس آئیڈیولوجی کے حمایتیوں میں ضابطہ پرست بورژوا حکومت کو تباہ و برباد کرنے کی کتنی طاقت اور صلاحیت موجود ہے۔ مسلم لیگ کی حکومت ایک نمایندہ حکومت تھی نہیں، بلکہ چند شخصوں کی حکومت تھی اس لیے اس کی جوازیت کے لیے پاکستان آئیڈیولوجی کا استعمال کیا گیا۔ حالانکہ اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ایوب خاں نے اپنے دور اقتدار میں اس "آئیڈیولوجی" کو محدود طریقہ سے استعمال کیا۔ انھوں نے اس کا استعمال خاص طور پر اس وقت کیا جب مشرقی پاکستان نے سیاسی اور اقتصادی خود مختاری کا مطالبہ کیا۔ ورنہ انھوں نے ان "آئیڈیولوجی والوں" رجعت پسند علماء اور جماعت اسلامی جیسی ان سیاسی پارٹیوں کو دبا کر رکھا۔ بھٹو اور ان کی پارٹی کو حکومت کرنے کا اختیار عام لوگوں، کارکنوں اور کسانوں نے دیا تھا، کیوں کہ انھوں نے ان طبقوں کے مفادات کی بات کی تھی۔ مگر بھٹو نے رجعت پسند قوتوں کو قابل اعتبار بننے میں بھی مدد کی۔ وہ اس بات پر مسلسل زور دیتے رہے کہ ان کا سوشلزم، اسلامی سوشلزم ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بنیاد پرست مذہبی تنظیموں کے مطالبوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور پارلیمنٹ میں قانون منظور کر دیا جس کے تحت احمدی (قادیانی) مسلم فرقہ سے الگ کر دیا گیا۔

ستم ظریفی یہ کہ ان کا زوال اس وقت ہوا جب انھوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت لوگوں سے منڈیٹ حاصل کرنے کے لیے انتخابات عمل میں لائے۔ ان انتخابات میں ان کی پارٹی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی مگر حزب اختلاف نے چناؤ نتیجوں کو اصلی ماننے سے انکار کیا اور وہ سڑکوں پر مظاہرے کرنے لگے۔ اس ایجی ٹیشن میں دائیں بازو کی مذہبی جماعتیں پیش پیش تھیں اور اطلاعات کے مطابق، ان کو امریکی محکمہ سراغرسانی 'سی آئی اے' کی حمایت حاصل تھی۔ انھوں نے بھٹو کو مرتد قرار دیا اور اپنے مطالبوں میں اس مطالبہ کو شامل کیا کہ ملک میں نظام اسلام قائم کیا جائے۔ اس طرح سے پاکستان آئیڈیولوجی کا اصل مدعا و مقصد لوگوں کے سامنے آیا۔ اس ایجی ٹیشن کا براہ راست فائدہ فوج کو ہوا جس وقت بھٹو کی حکومت اور حزب اختلاف میں نئے انتخابات کرانے کے سلسلہ میں ایک سمجھوتہ صورت پذیر ہو رہا تھا، جنرل ضیاء الحق نے سرکار کا تختہ الٹ دیا۔

یہ فوجی کاروائی ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو عمل میں لائی گئی۔

ان واقعات کی روشنی میں اگر ہم اس سے پہلے کے حالات کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فوج کی طرف سے پھر سے اقتدار پر قبضہ کرنے کے راستے میں جو رکاوٹ تھی وہ پاکستان کے بااثر طبقوں کا یہ ارادہ نہیں تھا کہ وہ اپنی سیاسی جماعتوں کے ذریعہ پاکستان کے انتظامی ڈھانچہ پر اپنا اثر ورسوخ قائم کریں، بلکہ یہ تھی کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو کسانوں، کارکنوں اور دوسرے عام اور مغلوب طبقوں میں حمایت حاصل تھی۔ لیکن جب بھٹو کی حکومت نے کچھ جمہوری اصلاحات کو قانونی صورت دینے کے بعد ۷۳-۱۹۷۲ء میں مزدور تحریک کے خلاف کارروائی کی اور اس تحریک کو بائیں بازو کی قیادت سے پاک کر دیا گیا تو فوجی سرکشتہ کو یہ اشارہ مل گیا کہ پیپلز پارٹی اپنے اس اتحادی سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے اور اس کے لیے اقتدار پر پھر سے قبضہ کرنے کے لیے راستہ ہموار ہو رہا ہے۔ اگر پیپلز پارٹی کی ان طبقوں میں حمایت برقرار رہی ہوتی تو شاید مخالف پارٹیوں کے اتحاد کی ایجی ٹیشن میں اتنی شدت بھی نہ آتی جس سے جنرل ضیاء کی طرف سے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔

جنرل ضیا نے ابتدائی طور پر یہ وعدے کیے کہ پاکستان میں پھر سے جمہوری نظام قائم کیا جائے گا لیکن ان کے یہ وعدے اس لیے خالی از معنی تھے کہ پاکستان میں ایسے طرز نظام کی بنیادوں کا ڈھانچہ پہلے ہی سے موجود تھا اور اس طرز نظام کا سرمایہ داری کے عالمی جدید نو آبادیاتی نظام کے ساتھ ناطہ جوڑا گیا تھا۔ مگر جن حالات میں ضیا نے اقتدار سنبھالا ان سے ان کی نئی فوجی حکومت کے استحکام کے لیے مختلف مسئلے اور موانع پیدا ہو گئے۔ ایوب کے زوال سے لے کر اس وقت تک، جب بھٹو نے اقتدار سنبھالا، پاکستان کے ساتھ طبقوں میں سیاسی بیداری بہت حد تک بڑھ گئی تھی۔ اس سیاسی بیداری کا نتیجہ یہ نکلا کہ ضیا کی حکومت شہری آبادی کے کسی بڑے حصہ کو اپنی حمایت کے لیے آمادہ اور منظم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی جیسا کہ ایوب ہوئے تھے۔ سماج کے بااثر طبقے عام طور پر بھٹو کی حکومت کے خاتمہ اور ضیا حکومت کی طرف سے ان کے عدالتی قتل پر خوش تو تھے مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کھلے بندوں فوجی حکومت کے ساتھ کسی قسم کا اتحاد ان کے لیے بالآخر خودکشی کے برابر ثابت ہو گا۔ کچھ انتہائی موقع پرست عناصر کو چھوڑ کر یہ طبقے فوجی حکومت سے دور رہی ہے جہاں تک کارکنوں اور کسانوں کے عام اور مغلوب طبقوں کا تعلق تھا ان میں فوجی ٹولے کو حمایت کی کوئی امید نہیں تھی کیونکہ ان طبقوں نے نظام سیاست پر سابق فوجی حکومتوں کی طرف سے اختیار حاصل کرنے کی طویل اور تلخ جدوجہد کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضیا نے فوجی نظام کو اپنی برہنہ صورت میں مسلط کیا۔ اور سول بیوروکریسی کو بھی اس میں برابر کا درجہ نہیں دیا گیا بلکہ اس کو ایک جونیئر شریک کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھا گیا۔

عملی اعتبار سے اس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت کا نظام مارشل لا آرڈی ننسوں کے تحت چلایا جائے۔ اس

سلسلہ میں خاص طور ۲۴ مارچ ۱۹۸۱ء کے عبوری آئینی حکم کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس حکم کے مطابق فوج کی کسی کارروائی کو کسی بھی غیر فوجی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ دوم یہ کہ تمام سیاسی مخالفت کو کچلنے کے لیے کوڑے مارنے کا عمل، قید و بند کی صعوبتیں اور اذیت رسانی کی کارروائیاں شروع کی جائیں۔ سوم یہ کہ شہری انتظامیہ کے ہر شعبہ اور خارجہ سروس میں فوجی عملہ کو تعینات کیا جائے اور چہارم یہ کہ عدالتوں، اعلا تعلیم، ٹریڈ یونینوں، سیاسی جماعتوں، ابلاغ عام اور تمدنی تنظیموں جیسے سماجی اداروں پر دھاوا بول دیا جائے۔ غرضیکہ اس حکومت کو اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے وہ تمام اقدامات کرنے پڑے جس سے پاکستان کے معاشرہ کی وہ حالت بن گئی جہاں تہذیب اور شائستگی کا نام و نشان نہیں رہا۔ بالآخر ضیاسرکار نے پاکستان کے معاشرہ میں اسلامی نظام قائم کرنے کی بات کی۔ یہ وہ دکھاوے کے لیے کر رہی تھی لیکن اس سے فوجی حکومت کیلیے اپنے اقتدار کی جوازیت پیش کرنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔ اسلامی نظام کا عملی اعتبار سے مطلب یہ تھا کہ معاشرے پر ایک رجعت پسند آئیڈیولوجی مسلط کی جائے جس کی داغ بیل پاکستان کے قیام کے وقت ہی پڑی تھی۔ اسلامی نظام قائم کرنے کے سلسلہ میں جو اقدامات کیے گئے ان کا پاکستان کے عام لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ الٹا اس سے عورت کے رتبہ اور مسلمانوں کے اقلیتی فرقوں پر ناکارہ اثر ڈالا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے ملک کے عدالتی نظام اور سیاسی ڈھانچہ کی صورت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ بات تو شک آور ہے کہ اسلامی نظام قائم کرنے کی حکمت عملی سے ضیا حکومت اپنے اقتدار میں رہنے کا جواز پیش کر سکے گی مگر یہ بات ماننا پڑے گی کہ ایران کے شاہ کے زوال اور افغانستان کے انقلاب کے بعد یہ حکومت، پاکستان کی جیوپالٹکل اہمیت کو استعمال کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ ایران اور افغانستان کے واقعات کے بعد ضیا سرکار کے استحکام میں امریکہ کی دلچسپی بڑھ گئی ہے کیوں کہ پاکستان میں فوج کی بالادستی کو مشرق وسطیٰ کی امریکی پالیسی میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ضیا کی طرف سے کھلے عام انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو امریکہ، اس کے اتحادیوں اور مغربی ملکوں کے ذرائع ابلاغ عامہ نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ اس سے اس بات کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ ریگن انتظامیہ کے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد امریکہ نے پاکستان کو تین عشاریہ دو بلین ڈالر کی فوجی اور اقتصادی امداد کیوں دی؟ اور امریکی محکمۂ خارجہ اور محکمۂ دفاع کے اعلا افسر آئے دن پاکستان کا دورہ کیوں کرتے ہیں۔ حال ہی میں جو اعلا افسر پاکستان آئے ان میں جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے چیرمین جنرل جوہن ویسی شامل تھے جنھوں نے وسیع پیمانہ پر پاکستان کی فوجی تنصیبات کا دورہ کیا اور جن کو جنرل ضیا نے پاکستان کا سب سے اعلا فوجی اعزاز 'نشان پاکستان' عطا کیا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ضیا سرکار کب تک امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی بیرونی حمایت، ملک کے اندر ظلم و جبر اور اسلامک آئیڈیولوجی کے استعمال پر اپنے اقتدار کو سنبھال کر رکھ سکے گی۔ مگر یہ بات عیاں ہے کہ سات سال تک مارشل لا کے ذریعہ حکومت کرنے کے بعد اس سرکار نے یہ ضروری سمجھا کہ اقتدار پر برقرار رہنے کے لیے ریفرنڈم کے ذریعہ لوگوں سے اجازت حاصل کی جانی چاہیے۔ یہ ریفرنڈم ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کو ہوا اور یہ بات دلچسپ ہے کہ جنرل ضیا نے ووٹ کی پرچی پر اپنا نام لکھنے کا خطرہ نہیں مول لیا۔ اس کے برعکس لوگوں سے یہ کہا گیا کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے ووٹ دے دیں۔ اگر لوگوں کی اکثریت نے اس سلسلہ میں "ہاں" کر دی تو اس سے ضیا کو مزید پانچ برسوں کے لیے حکومت کرنے کا حق مل جائے گا۔ سیاسی پارٹیوں پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ مارشل لا آرڈیننسوں میں ریفرنڈم میں شمولیت کرنے کے خلاف مہم چلانے والوں کے لیے سخت سزائیں مقرر کی گئیں اور سرکار نے لوگوں پر ووٹ کا حق استعمال کرنے کے لیے بے پناہ دباؤ کا استعمال کیا لیکن اس کے باوجود صرف بیس فی صد ووٹروں نے اپنے حق رائے دہی کا استعمال کیا۔ اور یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ جن لوگوں نے ووٹ کا استعمال کیا وہ 'اسلام' کے خلاف ووٹ نہیں دیتے۔

جہاں تک جنرل ضیا کی فوجی حکومت کے اپنے اقتدار و اختیار کا جواز پیش کرنے کا تعلق ہے تو اس میں ریفرنڈم کے نتائج اور ان انتخابات کو کوئی وقعت نہیں جو پروگرام کے مطابق فروری ۱۹۸۵ء میں ہونے والے ہیں۔ جو پارٹی بنیادوں پر نہیں لڑے جائیں گے اور جن کی تیاری کے لیے ہزاروں سیاسی کارکنوں اور لیڈروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا ہے۔ اہمیت اگر ہے تو اس بات کی کہ جب بھی ایسی حکومتوں کی طرف سے یہ مصنوعی جمہوری کارروائیاں عمل میں لائی جاتی ہیں، ملک میں سیاسی قوتیں دو دھڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ مختلف الاراکی جمہوریت کے بورژوا جمہوری عمل کو رسوا کیا جاتا ہے اور طبقاتی اور قومیت کے تضادات کو شدید کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ نقلی جمہوریت کی ان کارروائیوں کے دوران سیاسی عہدوں کا لالچ دے کر رجعت پسند اور بورژوا جمہوری تنظیموں کے زیادہ سے زیادہ افراد کو اپنا شریک بنایا جاتا ہے۔ جو لالچ میں نہیں آتے اور اپنے خیالات پر ڈٹے رہتے ہیں ان کو ہراساں کیا جاتا ہے یا انھیں اپنے صوبوں سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی، ٹریڈ یونینوں، وکیلوں، زنانہ انجمنوں، طالب علموں اور استادوں میں ان طبقوں کو پریشان کیا جاتا ہے، قید کیا جاتا ہے اور اذیتیں دی جاتی ہیں جو اسلامی طرز حکومت کے خلاف منظم ہوں۔ پریس اور ابلاغ عامہ کے دوسرے ذرائع کا منہ بند کیا جاتا ہے اور کھلے عام جو مظاہرے ہو رہے ہوں ان کو پولیس اور فوجی کارروائیوں کے ذریعہ کچل دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ با اثر اور غالب طبقے امن و قانون کی بحالی پر اطمینان کی سانس لیتے ہیں مگر غریب اور مغلوب طبقوں کے لیے

یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بورژوا جمہوری حکومت ایک عملی متبادل نہیں ہے اور یہ کہ حکومت کی آئیڈیولوجی غیر جانبدار نہیں ہوتی ہے۔ پاکستان میں "اسلامک آئیڈیولوجی" "طبقاتی آئیڈیولوجی" کی ایک اور صورت ہے۔ اس کے تحت غالب طبقوں کے مفاد جائز قرار دیے جاتے ہیں، اور کارکنوں، کسانوں، اقلیتی قومیتوں اور فرقوں، عورتوں اور آبادی کے دوسرے مظلوم طبقوں کا استحصال کو دوام حاصل ہوجاتا ہے۔

۱۹۸۳ء میں جب جنرل ضیاء نے زبردست سیاسی پابندیوں کے تحت، بلدیاتی اداروں کے انتخابات کروائے، پاکستان کی موجودہ فوجی حکومت کے خلاف مزاحمتی تحریک اپنے عروج پر پہنچی۔ فروری ۱۹۸۳ء میں جب عورتوں نے، حکومت کے "شہادت سے متعلق اسلامی قانون" کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ایک بہت بڑا جلوس نکالا تو پولیس نے بڑے وحشیانہ انداز میں اس پر حملہ کیا۔ کم از کم بیس عورتیں زخمی ہوئیں اور تیس عورتوں کو گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد ہائی کورٹ کے احاطہ میں وکیلوں کے اجتماع پر پولیس نے حملہ کیا۔ اس حملہ میں بھی خون بہایا گیا اور بہت سے لوگوں کو حراست میں لیا گیا۔ اگست ۱۹۸۳ء میں تحریک بحالی جمہوریت (جو ۱۹۸۱ء میں تشکیل دی گئی ہے) میں شامل سیاسی پارٹیوں کے اتحاد نے سول نافرمانی کی اپیل کی۔ اس اپیل کے ردعمل کے طور پر پورے ملک میں ہزاروں سیاسی کارکنوں اور لیڈروں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ لیکن جس چیز نے ایم۔آر۔ڈی کے لیڈروں اور فوجی حکومت، دونوں کو حیران کردیا وہ تھی سندھ میں عوامی احتجاج کی شدت۔ وہاں کے دیہاتی علاقوں میں کسی ارادے یا جبر کے بغیر خود بخود بڑے بڑے جلوس نمودار ہوئے، اور وہ مرکزی حکومت کے اختیارات کی علامتوں پر حملہ کرنے لگے اور ان کو مسمار کرنے لگے۔ جیل خانے، پولیس سٹیشن، عدالتیں، بنک، مواصلاتی ادارے، ٹرانسپورٹ ادارے، جو کچھ بھی ان کے سامنے آیا، اس پر انھوں نے حملہ کردیا۔ فوجی حکومت نے یکایک وہاں فوجی کمک بھیج دی۔ اور بہت سے دیہات پر ہیلی کوپٹروں سے گولہ باری کی۔ آٹھ سو لوگ مارے گئے اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ کچھ دیہات میں تمام مردوں کو پکڑ لیا گیا اور عورتوں پر فوج نے حملے کیے۔ آج کل ضیا کی سرکار کو سندھ میں "امن و قانون" برقرار رکھنے کے لیے نیم فوجی کارروائیاں کرکے بہت اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اس کے لیے سنٹرل پولیس فورس کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ اس فورس کے عملہ کو خصوصی تربیت دی گئی ہے اور فورس کو جدید ہتھیار اور گشتی وائرلیس یونٹ بھی مہیا کیے گئے ہیں۔ سندھ صوبہ کے انسپکٹر جنرل پولیس کا کہنا ہے کہ اگست ۱۹۸۴ء تک اس پولیس فورس نے دو سو "ڈاکوؤں" کو ہلاک کردیا تھا، ۱۲۰۰ کو گرفتار کرلیا تھا۔ اور اس کے علاوہ یہ فورس ان ۴۰۰۰ "ڈاکوؤں" کی تلاش میں ہے جو روپوش تھے۔ "ڈاکو" اور "شرپسند" سرکاری نام ہیں سندھ کے انتہاپسند سیاسی کارکنوں کے۔

پھانسی یافتہ وزیرِاعظم ذوالفقار علی بھٹو کے وطن سندھ کے لوگوں کو حال ہی میں ان قومیتوں میں شامل کر دیا گیا جن پر مرکزی حکومت نے فوجی مظالم ڈھائے ہیں۔ بلوچستان کو آزادی کے وقت ہی سے فوجی یلغاروں کا سامنا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے کچھ بلوچ لیڈر جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنے اور بلوچستان کی آزادی کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے پختون قوم پرستوں کو بھی فوجی جبر و استبداد کا برابر کا حصہ حاصل ہوتا رہا ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں فوج اور بیوروکریسی کے اتحاد کی طویل حکمرانی، طبقاتی اور علاقائی نابرابریوں اور ان حکومتوں کے تحت کیے گئے ظلم و تشدد کی وجہ سے پاکستان کے مختلف صوبوں کے درمیان رشتے بالکل کمزور اور موہوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ فوجی سررشتہ، جس پر پنجابیوں کا غلبہ ہے' اس بات سے پوری طرح باخبر ہے اور ملک میں اپنے اس رہنمایانہ رول کو اس بنیاد پر حق بجانب قرار دیتا ہے کہ ملک کا اتحاد قائم رکھنے کے لیے کسی بھی منتخب غیر فوجی حکومت کو ظلم و جبر کے یہ اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ جہاں تک بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کا تعلق ہے، جن کو یہ امید ہے کہ ایک بار فوج واپس بیرکوں میں جائیں اور انتخابات عمل میں لائے جائیں تو اقتدار اُن کو حاصل ہوگا۔ ان میں کچھ جماعتوں کو طبقاتی مسئلہ کا احساس تو ہے مگر قومیت کے مسئلہ کا نہیں۔ اس کی وجہ شاید ان کی سماجی اور طبقاتی ساخت ہے یا یہ ڈر کہ کہیں دائیں بازو کی انتہا پسند جماعتیں، جنھوں نے ضیا کے دورِ اقتدار میں بے پناہ طاقت حاصل کی ہے، ان پر کہیں وطن پرست نہ ہونے کا الزام نہ لگائیں۔ اس لیے یہ تمام جماعتیں' ایک یا دوسری صورت میں' "پاکستان آئیڈیولوجی" اور اس سے مشتق اس یقین کی حمایت کرتی ہیں کہ پاکستان کے اتحاد اور یکجہتی کے لیے اسلام پر عقیدہ ایک لازمی اور کافی شرط ہے۔

جہاں تک بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کا تعلق ہے وہ قومیت کے مسئلہ سے مخاطب تو ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتی ہیں کہ پاکستان مختلف قومیتوں پر مشتمل ایک وفاقیت ہے اور اگر اس کے اتحاد کو قائم رکھنا ہے تو مختلف قومیتیں ہونے کی حقیقت کی ترجمانی مرکزی حکومت کے کام کاج کے طریقہ کار میں ہونی چاہیے۔ مگر اس معاملہ یا دوسرے معاملوں میں جو لائحہ عمل اختیار کیا جانا چاہیے اس کے بارے میں ان جماعتوں میں اتفاق رائے حاصل کرنے کے سلسلہ میں جو رکاوٹیں آتی ہیں وہ یہ ہیں۔ حکومت کی طرف سے ظلم و جبر، جماعتوں کے اندر باہمی رقابت، جماعتوں کے حصہ بکھرے ہونا، ان جماعتوں کا اِن علمی بحثوں میں الجھ جانا کہ تاریخی ارتقا کے اس مرحلہ پر پاکستان میں قومیت کے تضاد سے زیادہ طبقاتی تضاد کو زیادہ اہمیت تو نہیں ہے۔ بہ ایں ہمہ بائیں بازو کی پارٹیوں اور ان دوسرے گروپوں، جو ملک کے اندر اور باہر سرگرم ہیں، کا رول بہت اہمیت رکھتا ہے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کے ریفرنڈم سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فوجی حکومت جمہوری عمل کو جوڑ توڑ کر اس کو اپنے حق میں استعمال کر سکتی ہے لیکن لوگوں کی حمایت حاصل نہیں کر سکتی خواہ وہ اسلامی نظام قائم کرے یا

نہ کرے۔ دنیا میں اور جگہوں پر فوج کی مطلق العنان حکومتیں یا تو محاصرہ میں آئی ہیں، جیسے فلپائن میں، یا خود ہی اقتدار سے دست کش ہورہی ہیں جیسے ارجن ٹینا اور برازیل میں۔ اس لیے ضیاء کے جانے کے بعد ان لوگوں اور پارٹیوں کے لیے، جنھیں پاکستان کے مستقبل اور جنوبی ایشیا، جس کا پاکستان ایک حصہ ہے، کے استحکام میں دلچسپی ہے، کس بات کو عملی اعتبار سے بہت اہمیت حاصل ہے؟ نو آبادیت سے آزاد ہوئے پاکستان جیسے کسی ملک کا مستقبل اس وقت کیا ہوگا جب اُس نے سیاسی نظام اور نظریات کے تمام راستے آزما لیے ہوں اور جب عالمی سرمایہ داری کا نظام، جس کا یہ ملک جدید نو آبادیاتی رول ادا کرتا ہے، کے بحران شدت اختیار کر لیں گے؟ یہ سوال ایسا ہے جو تحقیقی تجزیہ کے لیے ایک اچھا موضوع ہے۔

۷۔ پاکستان کا سیاسی نظام

کلیم بہادر

پاکستان تیسری دنیا کے اُن ممالک میں سے ایک ہے جہاں جدید بورژوا پارلیمانی جمہوریت اپنی جڑیں لگانے میں ناکام رہی ہے۔ اڑتیس سال پہلے پاکستان کے وجود میں آنے سے لے کر اب تک اس ملک میں پانچ آئین لاگو ہوئے۔ اور اس مدت کے تین چوتھائی حصے میں یہ ملک بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر فوجی حکمرانی کے تحت رہا۔ ہندوستان کے ساتھ اس کی تین جنگیں ہوئیں اور اپنی ایک خانہ جنگی کے بعد اس کے دو حصوں میں سے ایک حصہ، جہاں آبادی کی اکثریت تھی، اس سے جدا ہو گیا اور علاحدہ ہو کر ایک آزاد ملک بن گیا۔ پاکستان کی آزادی کے چار دہوں میں ملک میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر صرف ایک بار منصفانہ اور آزادانہ انتخابات عمل میں لائے گئے۔ آج بھی پاکستان کا کوئی آئین نہیں ہے اور نہ ہی وہاں جمہوری طریقوں سے منتخب کی گئی سرکار ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان کا کوئی سیاسی نظام نہیں ہے

سیاسی نظام کسے کہتے ہیں؟ کیا سیاسی نظام ملک کے آئین کو کہتے ہیں؟ کیا سیاسی نظام اور حکومت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟ سیاسی نظام ایک ایسا عمل ہے جو معاشرے کے وجود کو جس کا انتظام مرکزی طور پر سیاسی اختیارات کے تحت چلایا جا رہا ہو، متحدہ شکل میں برقرار رکھے۔ سیاسی نظام اقتصادی اور دانشورانہ ذیلی نظاموں کے ساتھ ساتھ معاشرے کے ذیلی نظاموں میں سے ایک ہے جس کو سماجی گروپوں کی سرگرمی نے الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ سیاسی نظام، معاشرے کے دوسرے نظاموں سے اپنی بالادستی کی وجہ سے ممتاز اور الگ ہے۔ سماج میں اس کے اختیارات سب سے زیادہ ہیں اور اس کے فیصلے سماج اور سماج کے دیگر ذیلی نظاموں پر لازمی ہیں۔ سیاسی نظام کا بنیادی کام وہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے وسائل اکٹھا کرنا ہے جو بڑی بڑی سماجی قوتوں نے معاشرے کے لیے مخصوص کیے ہوں۔ اس کی بنیادی خصوصیت اقتدار ہوتی ہے اگرچہ حکومت اور سیاسی نظام ایک ہی چیز نہیں ہیں لیکن وسیع تر معنوں میں سیاسی نظام اور حکومت کو اکثر ایک ہی مانا جاتا ہے۔

ہم اسی نظریاتی ڈھانچے کی حدود کے اندر پاکستان کے سیاسی نظام کے ارتقا کا جائزہ لیں گے۔ سب سے پہلے ہم مملکت پاکستان پر ایک نظر ڈالیں گے۔ پاکستان کا وجود ۱۹۴۷ء میں اس وقت عمل میں آیا جب انگریز برّصغیر ہند میں اپنے اقتدار سے دستبردار ہو گئے اور یہ خود مختار ملکوں میں تقسیم ہوا۔

ہندوستان اور پاکستان ۔ برطانیہ کے اقتدار سے دست کش ہونے کی وجہ یہ تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد قومی آزادی کی تحریک میں شدت آگئی تھی ۔ ہندوستان کی قومی تحریک جس کی قیادت انڈین نیشنل کانگریس کررہی تھی، نے ملی جلی قومیت کے لیے جدوجہد کی تھی ۔ مگر آل انڈیا مسلم لیگ، جو مسلمان زمینداروں، نئے مسلمان کارخانہ داروں اور متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک جماعت تھی، قومی تحریک کے دھارے سے ہٹ گئی تھی اور اس نے قومی تحریک کے خلاف بھی جہاد کیا تھا جس سے برطانوی سامراج کو برصغیر ہند کو تقسیم کرنے میں مدد ملی ۔ چنانچہ اِن دو ملکوں کو جو حکومت کے لیے انتظامی ڈھانچہ ورثے میں مِلا وہ برطانوی سامراجی حکومت نے تیار کیا تھا ۔ کانگریس کی قیادت میں ہندوستان کی قومی تحریک کے پاس ایک آئیڈیولاجی تھی جو برسوں کی سامراج مخالف جدوجہد کے دوران میں تیار ہوئی تھی ۔ لیکن مسلم لیگ کے پاس کوئی ایسی آئیڈیولاجی نہیں تھی ان کے پاس ہندوستانی مسلمانوں کو منظم کرنے کے لیے صرف کچھ دلکش نعرے تھے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انڈین نیشنل کانگرس نے آزادی کے بعد ایک نیا آئین لاگو کرکے اور اپنی خودمختاری کی مضبوطی کے لیے دوسرے اقدام کرکے مملکت ہندوستان کو ایک نئی صورت بخشی ۔ حالانکہ یہاں یہ بات کہنا لازمی ہے کہ نوآبادیاتی طرز حکومت کی کچھ نشانیاں ابھی بھی ہندوستان میں موجود ہیں ۔ کیونکہ نوآبادیاتی ڈھانچے کو مکمل طور پر تبدیل کرنے کا عمل طویل اور تکلیف دہ ہوتا ہے اور اس میں اقتصادی بنیاد کو بھی نئے سرے سے ترتیب دینے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مگر پاکستان کی صورت حال مختلف تھی ۔ مسلم لیگ کی ان علاقوں میں کوئی بنیاد موجود نہیں تھی جن پر پاکستان مشتمل ہے ۔ اِن علاقوں کے بااثر زمیندار طبقے نے پاکستان کی تحریک کی مخالفت کی تھی ۔ نئے ملک میں مشکل سے ہی کوئی سرمایہ دار طبقہ موجود تھا ۔ مسلم لیگ کو بلوچستان میں جہاں قبائلیوں کا غلبہ ہے کوئی نہیں جانتا تھا اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں اس کو محدود حمایت حاصل تھی ۔ جہاں تک سندھ اور پنجاب کا تعلق ہے تو ان دو صوبوں میں کافی وقت کے بعد مسلم لیگ کچھ حد تک اپنی بنیاد قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی ۔

جب پاکستان آزاد ہوا تو زمیندار اور قبائلی سردار ایک طاقت ور طبقے کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے ۔ سرمایہ دار طبقہ ابھی چھوٹا تھا اور یہ ان تاجروں پر مشتمل تھا جو ہندوستان سے، وطن چھوڑ کر آئے تھے ۔ تاجروں اور بیوپاریوں کے اس طبقے نے پچاس کی دہائی کے آغاز میں ان تجارتی سرگرمیوں کا پورا فائدہ اٹھایا جن کی وجہ کوریا کی جنگ تھی ۔ اِن ہی دِنوں پاکستان کی افسرشاہی (بیوروکریسی) نے ایسی پالیسیاں اختیار کیں ۔ جن سے تجارتی سرمایہ کو صنعتی سرمایہ میں تبدیل کرنے میں مدد ملی ۔ حمزہ علوی اور رشیدا مجد دونوں نے اپنی تحریرات میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ زمیندار طبقے کے غلبے کے باوجود افسرشاہی نے ایسی اقتصادی پالیسیاں اختیار کیں جن سے پاکستان میں سرمایہ دار طبقے کو آگے بڑھنے کا موقع مِلا ۔ بر کی بھی

ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زمیندار طبقے کے پاس کامیاب صنعت کار بننے کے وسائل نہیں اور افسر شاہی صنعت کاروں کا کردار ادا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ایسا انھوں نے خود صنعت کار بن کر نہیں کیا بلکہ انھوں نے یہ رول اپنا تجربہ ایک ایسا ڈھانچہ قائم کرنے کے لیے استعمال کر کے ادا کیا جو کارخانہ داروں کی ترقی کے لیے موزوں تھا۔

زمیندار طبقہ ایک متحدہ گروپ نہیں تھا بلکہ اس کے اندر مختلف گروپ تھے جو ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ، جو ابتدائی برسوں میں حکمراں پارٹی تھی اور جس پر زمیندار طبقے کا غلبہ تھا، ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ لیاقت علی خاں، جو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم تھے، کی وفات کے بعد مسلم لیگ کی حکومتیں یکے بعد دیگرے گر گئیں اور ان کو گرانے میں مخالف پارٹیوں کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ اسی پارٹی کے مخالف گروپوں کا۔ مسلم لیگ کی اس کمزوری سے بیوروکریسی کو مضبوط ہونے اور فوجی سر رشتے سے گٹھ جوڑ قائم کرنے میں مدد ملی۔ اس سے سرمایہ داروں کو زبردست فائدہ ہوا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جاگیرداروں کا کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا۔ ان کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ مرکز میں بھی اور صوبوں میں بھی۔ خاص طور پر پنجاب میں تو وہ لوگ سیاست پر چھائے رہے جن کا تعلق جاگیردار خاندانوں سے تھا۔ آزادی کے بعد پنجاب کے بیشتر چیف منسٹر انہی بااثر خاندانوں کے افراد رہے ہیں۔ زمیندار طبقے کے پاس کسی ایسے چیف منسٹر کی حکومت گرانے کے لیے کافی طاقت تھی جو زرعی اصلاحات کی بات کرنے کی جرأت کرے۔ اِن لوگوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک ایسوسی ایشن بھی قائم کی تھی۔ بیشتر پیشہ ور سیاستداں، زمینوں کے مالک تھے جو اپنی زمین و جائداد کا انتظام پیشہ ورانہ ہاتھوں میں سونپ دیتے تھے۔ اور اس طرح ان کے پاس سیاسی ہتھکنڈے آزمانے کے لیے بہت وقت ہوتا تھا۔ پاکستان کے وجود کے ابتدائی دس سالوں کے دوران جو پچاس سیاستداں مرکز یا صوبوں میں اہم سیاسی منصوبوں پر فائز رہے اُن میں بیس زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

مسلم لیگ کے لیڈروں کے پاس جمہوری نظام کے تحت قومی تعمیر نو کے لیے کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں کہ جناح جو پاکستان کے بانی تھے یا لیاقت علی خاں نے ایک جمہوری معاشرے کی تعمیر کے لیے کوئی منصوبہ بنایا تھا۔ اِن دونوں لیڈروں نے وہی نظام قائم و دائم رکھا جس کو خالد بن سعید نے وائس رائیوں کا نظام کہا ہے۔ یعنی وہ نظام جو برطانوی حکمرانوں نے بنایا تھا۔ جناح کے انتقال اور لیاقت علی خاں کے قتل اور مسلم لیگ کے کمزور ہو جانے سے افسر لوگ (بیوروکریٹس) اقتدار کے ایک طاقت ور مرکز کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ مسلم لیگ کے نئے رہنما بھی ان لوگوں میں سے نہیں تھے جنھوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ بلکہ یہ وہ لوگ تھے

جنھوں نے سول سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد سیاست میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ ان میں قابلِ ذکر حضرات غلام محمد، چودھری محمد علی، سکندر مرزا، اور دوسرے ہیں۔ یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں چیف منسٹر کے عہدے کے لیے عبدالقیوم خاں کے جانشین عبدالرشید تھے، جو اس صوبے کے انسپکٹر جنرل تھے، اور جنھوں نے چیف منسٹر کا عہدہ سنبھالنے کے لیے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

بیوروکریسی کی طرف سے اقتدار پر قبضہ کے ساتھ ہی تمام جمہوری عمل ختم کر دیئے گئے اور جمہوری قوتوں کے خلاف زور و زبردستی کے اقدامات شروع کیے گئے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی نے آئین کا دستاویز مرتب کرنے کا کام مکمل کر لیا تھا اور انتخابات عمل میں لائے جا سکتے تھے۔ مگر گورنر جنرل غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی کو برخاست کیا اور وزیر اعظم محمد علی بوگرا کو اپنی حکومت میں رد و بدل کرنے اور جنرل ایوب اور جنرل سکندر مرزا کو کابینہ میں شامل کرنے پر مجبور کیا۔ بیوروکریسی کو ملکی انتظام چلانے کے لیے فوج کی مدد لینی پڑی۔ فوج کی مدد کے بغیر ۱۹۵۳ء میں پنجاب کے قادیانی مخالف فسادات پر قابو پانا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کی متحدہ محاذ سرکار کو دبانے کے لیے بھی فوج کی مدد کی ضرورت تھی۔

پاکستان کی حکومتوں نے یکے بعد دیگرے، برطانیہ کی نوآبادیاتی حکومت کے جمہوریت کش اقدام کو استعمال کرنے کا کام جاری رکھا، تاکہ جمہوری قوتوں کو ختم کیا جا سکے۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت پاکستان نے بائیں محاذ کے لیڈروں اور کچھ ناراض فوجی لیڈروں کے خلاف جھوٹے مقدمے چلانے کے لیے بدنام راولپنڈی سازش کیس شروع کیا۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگائی گئی۔ اس سے پہلے ترقی پسند ادیبوں کی ایسوسی ایشن غیر قانونی قرار دی جا چکی تھی۔ علاوہ ازیں بہت سے جمہوریت پسند لیڈروں کو طویل مدت کے لیے جیلوں میں بند کیا گیا تھا۔ جن میں عبدالغفار خاں، ڈاکٹر خانصاحب، جی ایم سعید اور بہت سے اور شامل ہیں۔ ان لیڈروں کی سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کو بھی دبا دیا گیا۔

پاکستان کی مسلح افواج کی بنیاد برطانوی نوآبادیاتی فوج پر ہے۔ یہ نوآبادیاتی فوج سیاسی طور پر غیر جانبدار نہیں تھی، جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام والے باقی ترقی یافتہ ملکوں میں ہے۔ برطانوی ہندوستانی فوج کو برطانوی نوآبادیوں میں اور خاص طور پر ہندوستان میں امن و قانون برقرار رکھنے کی تربیت دی گئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اس فوج کا رول قومی قوتوں کو دبانا اور سامراجی مفادات کا تحفظ تھا۔ اس فوج کے افسروں کی بھرتی اکثر شاہی خاندانوں، جاگیردار خاندانوں اور شہروں کے امیر گھرانوں کے افراد میں سے ہوتی تھی۔ جہاں تک فوج کے باقی درجوں کا تعلق تھا تو ان کی بھرتی ان لوگوں میں سے کی جاتی تھی جن کو جنگجو نسلیں کہا جاتا ہے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم میں جب اس فوج میں توسیع کی گئی تو اس میں تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے افراد بھی بھرتی ہوئے۔ ان لوگوں پر قومی تحریک کا اثر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ کے دوران میں سبھاش چندر

بوس کی قیادت میں برما اور ملایا میں انڈین نیشنل آرمی کا قیام عمل میں آیا اور جنگ کے بعد ہندوستانی بحری فوج کے ایک حصے نے بغاوت کی۔ مگر عام طور پر مسلح فوج نے اپنی تربیت کے مطابق ہندوستان اور پاکستان میں اپنے نئے مالکوں کی خدمت کا کام جاری رکھا۔

پاکستان کی ہتھیار بند فوج کو ہندوستان کی تقسیم اور کشمیر میں ہند و پاک جنگ کے اثرات سے نکلنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس، جس میں بہت سے اعلیٰ فوجی افسر ملوث تھے، شروع کیا گیا اور بہت سے قوم پرست فوجیوں کو نکال دیا گیا۔ مسلح افواج نے سیاسی طاقت کا مزہ اس وقت چکھ لیا۔ جب اسے ۱۹۵۳ء میں احمدی مخالف فسادات کے موقعہ پر لاہور میں امن و قانون بحال کرنے کے لیے بلایا گیا۔ لاہور میں مارشل لا کے اعلان کا مقصد اگرچہ محدود تھا۔ مگر فوج اپنے اختیارات سے تجاوز کر گئی اور اس نے بہت سے ایسے کام بھی اپنے ذمّہ لیے جو اس کو سونپے نہیں گئے تھے۔ پاکستان میں فوج کی طرف سے تختہ الٹا دینے کی کارروائیوں کے سلسلے میں ۱۹۵۳ء کے مارشل لا کو ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل اعظم خاں نے پوری شہری زندگی کو پاک و صاف کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس میں انھوں نے میونسپلٹی کے صحت و صفائی کے چھوٹے معاملوں سے لے کر اخلاقی گراوٹ اور سیاسی اصلاحات تک کے بڑے معاملے شامل کئے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ ایک سابق بیوروکریٹ اور اس وقت کے گورنر جنرل سکندر مرزا نے خواجہ نظام الدین کو وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹا دیا۔ اس اقدام کو پاکستان کے شیشوں کے محل پر پہلا پتھر مانا جاتا ہے۔ اس بات پر غالباً بحث کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ یہ دو واقعہ ایک دوسرے سے جڑے ہیں بھی یا نہیں مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غلام محمد یہ غیر آئینی قدم فوج کی پس پردہ حمایت کے بغیر نہیں اٹھا پاتے۔ ان واقعات کے بعد اکتوبر ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا گیا اور فوج کے سربراہ جنرل ایوب خاں کو کابینہ میں بحیثیت وزیر دفاع شامل کر لیا گیا۔ اب فوج کی حمایت پس پردہ نہیں بلکہ کھلے عام رہی۔ جیسا کہ جمہوریت پر اس حملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار "ڈان" نے لکھا:

" ایسے بھی وقت آئے ہیں —— جیسا کہ اکتوبر ۱۹۵۴ء کی اس رات کو —— جب اپنے دائیں طرف ایک اور بائیں طرف دوسرے جنرل کو رکھ کر، ایک نیم پاگل گورنر نے ایک بند وزیر اعظم پر آئین ساز اسمبلی کے خاتمہ اور نیم فاشسٹ وزارت کے قیام (کا حکم) ٹھونس دیا۔"

ایک نئی آئین ساز اسمبلی نامزد کی گئی جس نے بہت محنت کے بعد ۱۹۵۶ء میں ایک نیا آئین مرتب کیا۔ اس آئین کے تحت ۱۹۵۸ء میں انتخابات کا پروگرام تھا۔ مگر ان انتخابات سے پہلے ہی

صدر سکندر نے آئین کو منسوخ کر دیا اور جنرل محمد ایوب خاں کی سربراہی میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ سکندر مرزا سانڈرسٹ (برطانیہ) کے تربیت یافتہ فوجی افسر تھے، مگر انھوں نے برطانوی دور حکومت میں پولیٹیکل سروس میں شمولیت اختیار کی تھی اور بیشتر وقت شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی علاقوں میں گزارا تھا۔ وہاں انھوں نے ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کے خلاف بھڑکانے کا حربہ سیکھا تھا اور اب یہ حربہ اس کے کام آیا۔ اپنے صدارتی عہدے کے تیس مہینوں کے دوران سکندر مرزا نے ایسے صورت حالات پیدا کرنے کے لیے تمام سیاسی چالبازیاں اور حربے استعمال کیے جن کے تحت چار وزارتوں نے دم توڑا۔ ان کو معلوم تھا کہ انتخابات ہونے کی صورت میں ان کے صدر بننے کی کوئی راہ نہیں ہے اس لیے ۱۹۵۸ء میں انھوں نے آئین کو منسوخ کر دیا۔ اسمبلیوں کو توڑ ڈالا اور مارشل لا نافذ کیا۔ بعد میں جب جنرل ایوب خاں نے، جن کے ہاتھوں میں پس پردہ اقتدار تھا، سکندر مرزا کو ہٹانے کا فیصلہ کیا، تو ان کے پاس مستعفی ہونے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ ان کا استعفیٰ حاصل کرنے کے لیے پانچ فوجی جنرلوں کو بھیجا گیا تھا۔

ایوب کے اقتدار کے دس برسوں کے دوران حکومت کو ۱۹۶۲ء کے آئین کے باوجود فوج کی حمایت حاصل رہی۔ یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں کہ جب ایوب کو کرسئ صدارت چھوڑنا پڑی تو انھوں نے اقتدار اپنے جانشین کو نہیں سونپا جو انہی کے آئین کے مطابق قومی اسمبلی کے صدر تھے، اس کے بدلے انھوں نے حکومت کی باگ ڈور جنرل یحییٰ خاں کے حوالے کی جو فوج کے سربراہ تھے۔ یحییٰ خاں ہی نے پاکستان میں پہلے آزادانہ انتخابات کروائے۔ مگر ان کا مارشل لا نہایت سخت تھا۔ پاکستان کی سرحدی سالمیت کو برقرار نہیں رکھا جا سکا اور اس کو ہندوستان کے ساتھ جنگ لڑنا پڑی۔ ۱۹۷۱ء کی ہند۔ پاک جنگ پاکستان کی تباہی کے ساتھ ختم ہوئی۔ پاکستان کی مسلح افواج، جو کسی چیلنج کے بغیر طویل مدت کے لیے ملک پر چھائے رہے، کو ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا اور مشرقی پاکستان الگ ہو گیا اور اس نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ مسلح فوج کے اندر فوجی لیڈروں کے خلاف غم و غصہ بغاوت کی حد تک بڑھ گیا، اور جنرل یحییٰ خاں کو مجبوراً اور بے آبرو ہو کر استعفیٰ دینا پڑا۔

بھٹو کی حکومت کے ابتدائی سال ہتھیار بند فوج کے لیے سب سے بُرے دن تھے۔ بھٹو نے ان جنرلوں میں سے بیشتر کو اپنے عہدوں سے ہٹا دیا جو جنرل یحییٰ کے دور حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے تھے۔ مسلح افواج خاموش رہ کر موقع محل کا انتظار کرنے لگے۔ بھٹو کی سیاسی ناعاقبت اندیشی کا یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ انھوں نے فوج میں بونا پارٹزم (BONA PARTISM) کے خلاف لڑنے کا دعویٰ تو کیا مگر فوجی جنرلوں کی طرف سے تختہ اُلٹا دینے کی کسی اور کوشش کے

امکانات کو دور کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے یہ وعدہ کیا کہ وہ پاکستان کی ہتھیار بند فوج کو ایشیا کی سب سے عمدہ فوج بنا دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی وہ فوج کے لیے بڑی بڑی رقمیں بھی مخصوص کرتے رہے۔ جنرل ضیائ نے جو بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کارروائی اس لیے نہیں ہوئی کہ اس میں کسی انفرادی افسر کی ذاتی پسند کا دخل تھا بلکہ اس لیے ہوئی پاکستان میں ہتھیار بند فوج کا انسٹی ٹیوشن وہاں کے سیاسی نظام کا مرکز بن گیا ہے۔

یہ سوچنا غلط ہوگا کہ پاکستان کے سیاسی نظام میں فوج کے عمل دخل کی وجہ وہاں کے حالات رہے۔ اصل میں پاکستان کے لیڈر ابتدا ہی سے، ملکی مسئلوں کو حل کرنے کے سلسلے میں اپنے رویہ میں نہ صرف قدامت پسند رہے بلکہ عالمی مسائل کی نسبت بھی وہ امریکہ کے خیالات سے اتفاق کرتے رہے۔ چالیس کی دہائی کے آخری برسوں اور پچاس کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں سرد جنگ اپنے عروج پر تھی۔ یہ امریکہ میں میکارتھی کا زمانہ تھا اور کمیونزم کو اپنے حدود میں رکھنے کے لیے ٹرومن کے نظریات کا دور تھا۔ شروع میں امریکا نے پاکستان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ کیوں کہ برصغیر برطانوی مفادات کے دائرہ اثر میں تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب جناح اور اس وقت کے وزیر خزانہ غلام محمد نے پاکستان کی مالی اور فوجی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے امریکہ سے پانچ سال کے دوران دی جانے والی بیس لاکھ ڈالر کے قرضے کے لیے بار بار درخواستیں کیں تو امریکی خارجہ اور دفاعی محکموں نے ان درخواستوں کو رد کر دیا حالانکہ پاکستان کے لیڈر قرضے کی درخواستوں کے ساتھ یہ دعوا بھی کرتے رہے کہ وہ بھی امریکا جیسے کمیونسٹ مخالف ہیں۔ پھر جب کوریا کی جنگ کے دوران اور جاپانی امن معاہدے کے وقت پاکستان نے امریکا کی حمایت کی تو وہ امریکا کے ہم خیال ملک کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی امریکا کو یہ احساس بھی ہوا کہ پاکستان روس کے صنعتی علاقوں کے نزدیک ہے۔ اس کے بعد امریکی پالیسی وضع کرنے والوں پر یہ زور دیا گیا کہ پاکستان کے ساتھ فوری طور پر مفاہمت کی جائے اور اس کی مسلح فوج کو ہتھیار بہم کیے جائیں تاکہ وہ روس کے خلاف کارروائی کے لیے دستیاب رہے۔ امریکی حمایت حاصل کرنے کی کوششوں میں اس وقت اضافہ ہوا جب پاکستان میں عملی اقتدار غلام محمد جیسے افسروں اور جنرل سکندر مرزا اور جنرل ایوب خاں جیسے فوجی لیڈروں کے ہاتھوں میں آیا۔ آئیزن ہارو کی انتظامیہ نے کمیونسٹ مخالف پالیسی کو جِلا بخشی اور پاکستان کی طرف وہ توجہ دی جانے لگی جس کی وہ کوشش کرتا رہا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں جان فوسٹر ڈلس نے پاکستان کا دورہ کیا اور اس وقت کے پاکستان کے کمانڈر ان چیف جنرل ایوب نے ترکی کا دورہ کیا جہاں سے وہ فوجی ٹھکانوں کو دیکھنے کے لیے امریکا چلے گئے۔ ایک طرف امریکا کی بااثر شخصیتیں یہ بات واضح کر رہی تھیں کہ ہندوستان غیر جانبداری کے سائے میں خودسری اور من مانی کر رہا ہے اور دوسری طرف یہ دعوا کیا جا رہا تھا کہ پاکستان میں کمیونزم

کے خلاف لڑنے کی صلاحیت ہے۔ پاکستان امریکہ کا ایک قریبی اتحادی بن رہا تھا۔ امریکا نے ہندوستان کے احتجاج اور عرب دنیا کی ناراضگی کو نظر انداز کیا اور پاکستان کی فوج کو نئے سرے سے ہتھیاروں سے لیس کرنے کا فیصلہ کیا۔ امریکا اور پاکستان کے درمیان پہلے دفاعی معاہدہ پر مئی ۱۹۵۴ء میں دستخط ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان جنوب مشرقی ایشیائی معاہدہ تنظیم اور ۱۹۵۵ء میں مرکزی معاہدہ تنظیم میں شامل ہوگیا۔ یہ دونوں تنظیمیں امریکہ کی طرف سے شروع کی گئی تھیں۔

پاکستان کے لیے امریکی فوجی امداد کو ہم دو مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا مرحلہ پچاس کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں شروع ہوا اور ۱۹۶۵ء کی ہند، پاک جنگ کے ساتھ ختم ہوا۔ دوسرا مرحلہ ۱۹۷۹ء میں افغانستان کے واقعات کے بعد شروع ہوا اور اسے پاکستان اور امریکا کے درمیانی رابطوں کی بحالی کا نام دیا گیا۔ امریکی فوجی امداد صرف ہتھیاروں کی سپلائی تک محدود نہیں رہی بلکہ امریکہ کے سیکڑوں افسروں اور ماہروں کو پاکستان بھیجا گیا۔ اسی طرح مختلف فوجی اور غیر فوجی پروگراموں کے تحت پاکستان کے سیکڑوں افسر امریکہ کی طرف سے شروع کیے گئے مطالعاتی کورسوں اور دوروں میں شریک ہوئے۔ امریکہ نے ہارورڈ کے اقتصادی ماہروں کے ذریعہ پاکستان کی اقتصادی پالیسیوں پر اور امریکی فوجی ماہروں کے ذریعہ پاکستان کی فوجی پالیسیوں پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ جنرل ضیا نے امریکی فوجی اداروں میں دوبارہ تربیتی کورسوں میں شرکت کی۔

پاکستانی فوج کو ایک نئی صورت دینے اور اس کی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کے کام میں بھی امریکہ کا ایک اہم رول رہا ہے۔ پاکستان نے ایک جنگی ٹیکنالوجی حاصل کی۔ پاکستان کی تکنیکی اور سائنسی ترقی اور اس کے وسیلوں کو مدّنظر رکھ کر اس جنگی ٹیکنالوجی کو حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پاکستان اس طرح سے اپنے مالی وسائل کا ایک بڑا حصہ فوج کے لیے مخصوص کرنے پر مجبور ہوا۔ امریکی ہتھیاروں اور تربیت کے ساتھ ساتھ امریکی فوجی نظریات کو بھی پاکستان کی فوج میں فروغ ملا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پچاس کی دہائی کے اواخر میں پاکستان کی فوج نہ صرف زبردست تکنیکی اور مادی وسائل سے لیس تھی بلکہ اس نے ایسا اندازِ فکر بھی حاصل کر لیا تھا جو دنیا کے سرمایہ دارانہ مفادوں کے حق میں تھا۔ بنیادی ڈھانچے میں تضاد ہونے کے نتیجے میں جب سیاسی عدم استحکام پیدا ہوا تو فوج نے بیوروکریسی کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے حکومت کے ڈھانچے پر قبضہ جما لیا اور آخر کار جمہوریت کی ظاہری نشانیوں کو بھی ختم کر دیا۔

یہ بات نہیں ہے کہ پاکستان میں فوج کی طرف سے اقتدار پر قبضہ کرنے کی کارروائی میں امریکی ملوث نہیں تھے۔ ریٹائرڈ ایر مارشل اصغر خاں نے جو اس وقت پاکستانی ہوائی فوج کے سربراہ تھے، ۱۹۵۸ء میں ایوب خاں کی طرف سے تختہ الٹ دینے کی کارروائی کے بارے میں اس بات کا اشارہ دیا ہے۔ خالد بن سعید نے

۵۷-۱۹۵۵ء میں پاکستان میں سی آئی اے کے ایک افسر کی مثال دی ہے جس نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں امریکہ، پاکستان کی سیاسی قوتوں کی نمائندگی کرنے والی دو بڑی شخصیتوں کی حمایت کر رہا تھا۔ سہروردی اور ایوب۔ ایوب کے لیے امریکی حمایت زیادہ عیاں تھی کیوں کہ ایوب نے امریکا کی طرف سے شروع کیے گئے دفاعی معاہدوں میں پاکستان کی شمولیت میں ایک خاص رول ادا کیا تھا۔

سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد پاکستانی مسلح فوج کا یہ خصوصی مفاد بن گیا کہ وہ اقتدار میں بنی رہے اور ملک میں نئے سرے سے جمہوری عمل شروع کرنے کی کوششوں کو ناکام بنادے۔ اس کے لیے مادی اور اخلاقی مدد امریکہ کی ان پالیسیوں سے حاصل ہوئی جن کے تحت وہ فوجی لیڈروں کو اقتصادی اور فوجی امداد دیتا رہا۔ پہلے ایوب اور پھر یحییٰ کے ساتھ امریکہ کے بڑے قریبی اور سیاسی تعلقات تھے۔ جنرل ضیاء الحق کو بھی امریکہ سے ۳،۲ بلین ڈالروں کی اقتصادی اور فوجی امداد حاصل ہوئی ہے۔

ان فوجی لیڈروں میں کوئی بھی پاکستانی عوام کے کسی بڑے طبقے کی حمایت حاصل نہیں کر سکا۔ اس کے برعکس جمہوریت پسند قوتوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ پاکستان میں جمہوری عمل بحال کرنے کی راہ میں فوجی حکومت ایک مستقل رکاوٹ ہے۔ اقتدار پر قبضہ کرنا ایک بات ہے اور لوگوں کی نظروں میں اس اقتدار کو جائز ثابت کرنا دوسری بات ہے۔ اپنے اقتدار کے جائز ہونے کے ثبوت کی عدم موجودگی میں یہ لیڈر فوجی مہم جوئی پر مجبور ہوئے۔ ہندستان کے ساتھ تصادم سے پاکستان کے لیڈر بیرونی حمایت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جہاں تک امریکا کا تعلق ہے ان کی عالمی حکمت عملی کے مقاصد، سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ممالک کے خلاف تھے اور ہند، پاک تصادم ان مقاصد کا ایک غیر اہم اور جزوی پہلو تھا۔ ایک طرف سے پاکستان کے لیڈروں کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ جنگ میں امریکہ کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور دوسری طرف امریکی حکمت عملی کے ماہر یہ سوچ رہے تھے کہ پاکستان امریکی فوج کے لیے سوویت یونین کی سرحدوں کے نزدیک ٹھکانے مہیا کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس خطے میں لڑائی کی آگ بھڑک اٹھنے کی صورت میں پاکستان سے امریکہ کو مسلح فوجی عملہ بھی حاصل ہو سکتا تھا۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اور ۱۹۵۹ء کے دونوں ملکوں کے درمیان باہمی سلامتی کے معاہدے کے باوجود ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی دونوں جنگوں میں امریکا مختلف وجوہ کی بنا پر پاکستان کی مدد کو نہیں آسکا۔ اس سے پاکستان کے پالیسی بنانے والوں کی آنکھیں کسی حد تک کھل گئیں۔ مگر افغانستان میں روسی کارروائی کے بعد امریکہ نے پاکستان کو اقتصادی اور فوجی امداد دینے سے اتفاق کیا اور جنرل ضیاء نے یہ بات مان لی کیوں کہ ملک میں ان کی پوزیشن کمزور تھی جس کی ایک وجہ تھی مخالف پارٹیوں کا جمہوریت کی بحالی کی تحریک کے تحت متحد ہونا۔ افغانستان میں جنرل ضیاء کے مفاد امریکی مفادوں کے ساتھ میل

کھاتے ہیں۔ کیونکہ افغانستان میں انقلابی حکومت کی کامیابی اور استحکام سے پاکستان کے چھوٹے صوبوں۔ بلوچستان، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے پر اثر پڑے گا۔ افغانستان میں انقلاب مخالف گروہوں کو مالی امداد مہیا کر کے امریکہ جو کھلے بندوں مداخلت کر رہا ہے اُس سے افغانستان میں صورت حال غیر مستحکم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے روس اُس ملک میں اپنی مسلح افواج رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

پاکستان کی فوجی حکومت نے ہندوستان کے تئیں جو رویہ اختیار کیا ہے اُس کا مقصد دو ملکوں کے درمیان حل طلب مسائل حل کرنا نہیں۔ جنرل ضیا نے جو ہندوستان کو نا جنگ معاہدے کی پیش کش کی ہے اس میں بھی یہ چال ہے کہ امریکا کی طرف سے پاکستان کو ہتھیاروں کی سپلائی نئے سرے سے شروع کرنے کے لیے جواز پیدا ہو جائے۔ ہندوستان کے ساتھ اپنے تعلّقات بہتر بنانے کی نیّت صدر ضیا کے عمل سے غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سکھ انتہا پسندوں کے ساتھ جنرل ضیا کا پاکستان اور امریکہ دونوں بہت ہی دوستانہ رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے دونوں نے ہندوستان کی سرحدی ریاست میں عدم استحکام پیدا کرنے کے لیے سکھ انتہا پسندوں کے استعمال پر اتفاق کر لیا ہے۔

جنرل ضیا کی فوجی حکومت نے تیل کی دولت سے مالا مال عرب ملکوں کی مادی اور اخلاقی مدد حاصل کرنے کے لیے شد و مد سے اسلامی یک جہتی کا استعمال کیا ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے پاکستان، مسلم ممالک کی تنظیم کا ایک سرگرم رکن رہا ہے۔ یہ تنظیم مغربی ایشیا میں امریکی مفادوں کو نظر میں رکھ کر کام کر رہی ہے۔ پاکستان نے اپنے فوجی یونٹوں کو سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات بھیجا ہے تاکہ عوامی اور جمہوری تحریکوں کے خلاف وہاں کی شاہی حکومتوں کا بچاؤ کیا جاسکے۔ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کی فوج خلیج فارس میں کرائے کے فوجیوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ستّر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں جنرل ضیا نے اردن میں پاکستان کے فوجی دستوں کی کمان سنبھالی تھی اور خود شاہ حسین کے صلاح کار تھے۔ ضیا نے اس وقت شاہ حسین کو فلسطینی تنظیم آزادی کو ختم کرنے میں مدد دی تھی۔ موقع ملنے پر پاکستان کے فوجی دستے، خلیج فارس میں بھی ایسا ہی رول انجام دے سکتے ہیں۔

پاکستان کے جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا میں امریکی حکمت عملی کے منصوبے کا ایک حصہ بننے سے اور پاکستان کی فوجی حکومت کے امریکہ پر بڑے پیمانے پر انحصار کی وجہ سے اس خطے میں یہ دونوں ملک ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کارروائی کریں گے۔ اور یہ اس خطے کے لیے ایک صحت مند علامت نہیں ہے۔ اس خطّے کے استحکام میں پاکستان کے جمہوری سیاسی نظام کو ہی اپنا مفاد نظر آسکتا ہے، ایک ایسا جمہوری سیاسی نظام جسے اپنی بقا کے لیے بیرونی حمایت کی ضرورت نہ ہو اور جو لوگوں کی آرزوؤں اور ارمانوں کی طرف زیادہ توجہ دے۔ پاکستان کا فوجی نظام نہ صرف اس ملک کی سرحدی سالمیت کے لیے

ایک خطرہ ہے بلکہ امریکہ کی پالیسیاں عمل میں لانے کا ایک آلۂ کار ہونے کے ناطے اس پورے خطّے کے استحکام کے لیے ایک خطرہ ہے۔

پاکستانی فوج ملک کی سرحدی سالمیت اور ملک کی آزادی کا دفاع کرنے کے اہل نہیں رہی ہے۔ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اس نے حال ہی میں ایک ریفرنڈم اور قومی اسمبلی کے لیے انتخابات عمل میں لائے مگر مارشل لا ہٹایا نہیں گیا ہے اور نہ ہی جمہوری آزادی بحال کر دی گئی ہے۔ پاکستانی فوج کی یہ کوشش رہی ہے کہ ملک پر ایک ایسا نظام ٹھونسا جائے جس کے تحت غیر فوجی شکل میں فوجی حکمرانی قائم و دائم رہے۔ حال ہی میں قائم کی گئی غیر فوجی حکومت اپنے جائز ہونے کی بات اس لیے نہیں ثابت کر سکے گی کیوں کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ مکمّل طور پر فوج پر انحصار کرتی ہے۔

فوج کی طرف سے، جس پر پنجابیوں کا غلبہ ہے، تمام جمہوری عمل ختم کیے جانے سے چھوٹے چھوٹے صوبے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ حکومت پنجابیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے قومی پیمانے پر ٹکراؤ بڑھ گیا ہے اس ٹکراؤ کا ثبوت یہ ہے کہ حال ہی میں سندھی، بلوچی، پٹھان محاذ قائم کیا گیا اور پنجابیوں کو اس سے باہر رکھا گیا۔ اس کے بہت سنگین نتائج نکلیں گے۔ مسلّح فوج سیاسی مسایل حل کرنے کی اہل نہیں ہے۔ اس لیے یہ امید نہیں کہ مستقبل قریب میں پاکستان کا سیاسی نظام اس بحران سے نکل جائے جس کا یہ ہر وقت شکار ہوتا رہا ہے۔

۸۔ غیر منقسم پاکستان میں مطلق العنانیت اور جدید نوآبادیاتی جبریت کے ابھرتے رجحانات

پانڈو نائک

(۱)

۱۹۵۸ء میں ایوب کی طرف سے حکومت کا تختہ الٹائے جانے سے پہلے پاکستان کی سول سروس غالباً وہاں کی حکومت کا ایک اہم آلہ کار تھی۔ اگرچہ یہ سروس افسر شاہی (بیوروکریسی) کے صرف 0.07 حصے پر مشتمل تھی مگر حکومت کے انتظامی ڈھانچے میں اسے ہر سطح پر بہت طاقت حاصل تھی۔ خالد بن سعید کا کہنا ہے کہ جناح کے دور میں بھی، جب اختیارات کی باگ ڈور مسلم لیگ اور مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں ہونی چاہئے تھی، سرکاری افسر (سول سرونٹ) امن وقانون یا ایماندار اور قابل حکومت کے نام پر صوبائی وزارتوں کو مقررہ معیار سے پہلے ہی ہٹا سکتے تھے۔

جناح اور لیاقت علی خاں کے انتقال کے بعد سول سروس اپنی طاقت کی عروج پر پہونچ گئی۔ ۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۷۱ء میں بھٹو کے اقتدار سنبھالنے تک، پاکستان کی حکومت یا سول سروس کے کسی سابق افسر کے ہاتھوں میں رہی یا کسی فوجی افسر کے۔ جناح اور لیاقت کی وفات کے بعد اختیارات عملی طور پر شہری اور فوجی بیوروکریسی کے ہاتھ منتقل ہو گئے۔ چنانچہ برٹش (انڈین) آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے ایک سینئر افسر غلام محمد نے پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا جبکہ عملی اختیارات سکندر مرزا کو حاصل ہوئے جنہوں نے سانڈھرسٹ ملٹری کالج میں گریجوئیشن کی تھی لیکن بعد میں وہ سر اولف کارو کے اثر کے تحت برٹش (انڈین) پولٹکل سروس میں شامل ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد وہ وزارت دفاع کے سیکریٹری بنے اور پھر پاکستان کے

پہلے صدر جنرل مرزا کے گورنر جنرل بننے کا ایک اہم نتیجہ یہ تھا کہ سول سرونٹس کو یہ یقین ہو گیا کہ سیاستدانوں کو بقول مرزا "ہر کام چوپٹ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔" . . یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ انھوں نے چودھری محمد علی کو اپنا پہلا وزیر اعظم بنایا۔ چودھری بھی ایک سرول سرونٹ تھے اور سیکریٹری جنرل کی حیثیت سے انھوں نے پاکستان کی پوری سول سروس کو منظم بھی کیا تھا اور اس کی سربراہی بھی۔ پاکستان کی حکومت کا کنٹرول سرکاری افسروں کے ہاتھ آنے کا عمل ان واقعات کا لازمی نتیجہ تھا جو جناح کے دور میں عمل میں آئے تھے اور جن میں ان افسروں کو صوبائی حکومتیں برخاست کرنے کی اجازت حاصل رہی۔ غلام محمد نے گورنر جنرل کی حیثیت سے حکومت کو سرکاری ملازموں کے اثر میں لانے کے اس عمل کو تیز کیا اور اس کام میں انھوں نے فوج سے مدد حاصل کی۔ ۱۹۵۳ء میں انھوں نے نظام الدین کو وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹا دیا اور اس کے ایک سال بعد آئین ساز اسمبلی کو برخاست کیا۔ ایوب کے دعوے کے مطابق غلام محمد حکومت کو فوج کے حوالے کرنے پر بھی تیار تھے اور اس مجوزہ منتقلی کی دستاویزات انھوں نے ایوب کے حوالے کیے تھے۔ مگر ایوب نے انکار کر دیا۔ اگر ایوب نے یہ پیش کش قبول نہیں کی، جیسا کہ انھوں نے دعویٰ کیا ہے، تو صرف اس لیے کہ وہ سول افسروں کی آمریت کو سنبھلنے کا موقع دے رہے تھے۔ ملکی سیاست میں فوجی دخل اندازی ۱۹۵۸ء میں شروع نہیں ہوئی، جب مرزا نے بالآخر اقتدار ایوب کو سونپا، بلکہ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آغاز میں ہی شروع ہوئی تھی۔

پاکستانی امور کے ایک نامور ماہر پروفیسر وین ول کاکس کا خیال ہے کہ "پاکستان میں ۵۱-۱۹۵۰ء ہی سے پالیسی وضع کرنے کے عمل میں فوج کو ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل رہی۔" اس لیے یہ بات استدلال پر پوری اترتی ہے کہ سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد پاکستان کی سول سروس، بیوروکریسی کی ان شاخوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے لگی جو اس کے جمہوریت مخالف خیالات سے اتفاق کرتی تھیں۔ یہ ایک محض اتفاق نہیں کہ اس گٹھ جوڑ سے پاکستان کے فوجی اور غیر فوجی معاملات میں امریکی مداخلت کے لیے ایک ٹھوس بنیاد قائم ہو گئی۔ بلال رشمی اپنے تحقیقی مقالہ (غیر مطبوعہ) میں دستاویزی شہادتیں پیش کر کے لکھتے ہیں:

" اقتدار سول اور فوجی افسروں کے ہاتھ منتقل ہونے سے، امریکہ کے بچاؤ اور خارجہ محکموں کیلئے فوجی امداد کے معاملوں کے بارے میں، ان افسروں کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنا نسبتاً آسان ہو گیا" سیاسی لیڈروں کے ساتھ نہیں۔ ول کاکس کے مطابق امریکی ہتھیاروں کی سپلائی سے مسلح افواج کے داخلی اور خارجی مشن انجام دیئے جانے کی صلاحیت میں اضافہ ہو گیا۔ زرنگ کا کہنا ہے کہ فوجی اور سول افسروں کو اس بات کا یقین تھا کہ ملک کی حکومت سنبھالنے کے لیے وہی سب سے زیادہ قابل اور اہل ہیں اور انھوں نے اپنے سیاسی

اقتصادی اغراض کو قومی مفاد جان کر ان کی نشاندہی کی۔ ایوب خاں اور ان کے فوجی ٹولے نے مارشل لا کا پہلا جھٹکا اس وقت دیا جب پاکستان کی سول سروس کے (317) ممبروں میں سے بارہ کو ملازمت سے برخاست کر دیا گیا اور 272 فوجی افسروں کو سول محکموں کا انتظام چلانے کے لیے تعینات کیا گیا۔

غیر فوجی آمریت کے دور کو ہم دو مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے مرحلے کا لازمی نتیجہ دوسرا مرحلہ تھا۔ اور اس عمل کے دوران نسبتاً زیادہ جابر مطلق العنان قوتوں کے لیے راستہ ہموار ہو گیا یہ قوتیں تھیں ۔ فوج ۔ پہلا مرحلہ قائد اعظم جناح کے ساتھ شروع ہوا اور اپریل ۱۹۵۲ء میں نظام الدین کی حکومت کو برخاست کیے جانے تک جاری رہا۔ دوسرا مرحلہ غلام محمد کے گورنر جنرل بننے کے ساتھ شروع ہوا۔ جن کے جانشین سکندر مرزا تھے ان کے بعد فوج نے اقتدار سنبھالا۔ جناح، لیاقت اور نظام الدین چونکہ سیاستداں تھے اس لیے انھوں نے ایڈمنسٹریٹو طریقۂ کار کو ترجیح دی اور جمہوری طور طریقوں کی طرف کوئی دھیان دیئے بغیر ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۴ء کی درمیانی مدت میں کم از کم دس صوبائی وزارتوں کو برخاست کیا۔ غلام محمد اور سکندر مرزا جو اعلیٰ تربیت یافتہ بیوروکریٹ تھے، نے ایڈمنسٹریٹو ظلم وجبر کے اس دائرہ کو مکمل کر دیا۔ غلام محمد نے نظام الدین کی حکومت کو برخاست کیا اور آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا جبکہ سکندر مرزا نے سہروردی کی حکومت کو ہٹا دیا۔ نظام الدین اور سہروردی کی حکومتوں کو اس وقت ہٹا دیا گیا جب ان کو مرکزی قانون سازیہ میں اکثریت حاصل تھی۔

اس پس منظر میں، جہاں جمہوری طور طریقوں اور تقاضوں کا فقدان تھا اور جس کو اپنی نوآبادیت پسند اور عوام دشمن صورتوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔ پاکستان، پہلے کے اندازوں کے مطابق، ایک جمہوری ملک کے بدلے ایک ایڈمنسٹریٹو سٹیٹ کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا۔ اہم بات یہ ہے کہ آزاد پاکستان میں اس ناقص انتظامی ڈھانچے کی خصوصیات کو اعلیٰ ترین اداروں میں بھی جائز مان لیا گیا۔ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دونوں آئینوں نے سول اور فوجی بیوروکریسی کے باہم تعلق کے بنیادی ڈھانچے کو متبرک قرار دیا ہے۔ چنانچہ دونوں اعلیٰ ترین سروسوں اور ہتھیار بند فوج کو آئینی طور، منتخب سرکار کے بدلے، براہ راست گورنر جنرل یا صدر کے دائرۂ اختیار میں رکھا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں بیوروکریسی کی عام طور پر اور سول سروسز کی خاص طور پر، خود اختیاری اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ برکی، جو خود بھی پاکستانی سول سروس کے افسر تھے، نے شکایت کی کہ حکومت کا یہ حق ختم ہو گیا ہے کہ وہ سول سروس کے کسی رکن کا ایک عہدے سے دوسرے عہدے پر تبادلہ کرے۔ سعید نے عمر کا حوالہ دیتے ہوئے، جو حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات کے سابق پلاننگ اور ایوالویشن صلاح کار تھے، کہا ہے کہ ۱۹۵۰ء میں "بڑے بڑے سول سرونٹ عوام یا ان کے نمائندوں سے پوچھے بنا پالیسیاں اور پروگرام وضع کرتے تھے اور ان کو عملی صورت دیتے تھے۔ وہ سیاسی لیڈروں کو ناتجربہ کار اور (ان کو) ہدایات دینے کے نااہل سمجھتے تھے۔"

پاکستان میں کل پانچ گورنروں میں سے چار برطانوی آئی سی ایس افسر تھے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۱ء تک ماسوائے ۱۹۵۹ء کے، مختلف محکموں کے سیکریٹری برطانوی افسر تھے جو انتظامیہ کی بنیادی پالیسی وضع کرنے کے ذمہ دار تھے اور انھوں نے (برٹش) انڈین سول سروس کی روایات کو قائم و دائم رکھا۔ سکندر مرزا اسی روایت کی اعلیٰ درجے کی پیداوار تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۴ء میں اعلان کیا تھا:

"برطانی طرز نظام میں ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (جو اکثر ایک آئی سی ایس افسر ہوتا تھا) انتظامیہ کا مرکز ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ ہمیں وہی بحال کرنا ہے۔۔۔۔"

یہاں ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ ۱۹۵۸ء کے بعد، فوج کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے باوجود، فوجی افسروں کو غیر فوجی عہدوں پر فائز نہیں کیا گیا۔ ۱۹۵۸ء – ۶۳ کے دوران میں فوجی حکومت نے اصلاحات کے لیے ساٹھ کمیشن تشکیل دیئے اور ان کمیشنوں کے لیے اتنی ہی تعداد میں چیرمین مقرر کیے لیکن ایک بھی کمیشن کے لیے کسی فوجی افسر کو چیرمین تعینات نہیں کیا گیا۔ فوج کے عروج پر ہونے کے باوجود یہ قابل قدر عہدے سول سروسز کے لیے چھوڑ دیئے گئے۔ اسے مارشل لا کے تحت فوجی اور سول افسروں کے درمیان ایک گہرے تعلق کی علامت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا تعلق تھا جس میں فوج کو تو قطعی اقتدار اعلیٰ حاصل تھا مگر غیر انقلابی اور معمول کے قواعد کے تحت، انتظامیہ چلانے کا انحصار مکمل طور پر سول سروسز پر تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ پاکستان کی سول سروس کے دروازے مسلح افواج کے لیے اس وقت کھولے گئے جب ۱۹۶۰ء میں فوج کے پانچ نوجوان افسر پاکستان کی سول سروس میں شامل ہوئے۔ اس طرح سے باہمی اغراض کی بنیاد پر قائم، سول اور فوجی سروسوں کے اتحاد کا جشن منایا گیا۔ ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک بری اور بحری فوج کے جن چودہ افسروں نے سول سروس میں شمولیت اختیار کی ان میں سے آٹھ کے فوجی بیوروکریسی کے اعلیٰ ترین ممبروں کے ساتھ قریبی روابط تھے۔ اس لیے یہ بات باعث حیرت نہیں کہ فوج کو سول سروس کی علیحدہ انفرادیت کو برقرار رکھے جانے میں خصوصی مفاد پیدا ہو گیا۔ ساٹھ کی دہائی میں جب یہ سیاسی آمریت صاف اور واضح شکل میں سامنے آرہی تھی، اس اتحاد کو، جس میں فوج کا غلبہ تھا، یہ پتہ چلا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک نہیں ہے اور کسی ملک کا نظام چلانے میں صرف سول بیوروکریسی کی حمایت ہی کافی نہیں ہوتی۔ لوگوں کے مختلف طبقے ـــــ شہروں میں کام کرنے والے ورکر، طلبا، وکیل، اور دیگر تنخواہ دار ملازم، پیشہ ور اور گاؤں میں رہنے والے بے زمین لوگ، چھوٹے کاشتکار، علما وغیرہ ـــــ ایوب کی دس سالہ حکومت کے خلاف بغاوت پر اتر آئے اور آخر کار ان کو اقتدار سے ہٹا دیا۔ ایوب نے بھی مرزا کی چالاکی کو دوہرایا۔ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوتے وقت، انھوں نے اقتدار اسپیکر کو نہیں سونپ دیا، جیسا کہ انھیں، ۱۹۶۲ء کے انھی کے آئین

کے مطابق کرنا تھا، بلکہ انھوں نے یہ اقتدار ملک کی فوج کے سربراہ کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے اس سے پہلے ایک دن یحییٰ خاں کو لکھا تھا۔ " صرف وہی (فوج) فہم وفراست کو بحال کر سکتے ہیں اور ملک کو مناسب اور آئینی طور طریقوں سے واپس ترقی کی راہ پر لا سکتے ہیں۔"

جنرل یحییٰ خاں نے فوجی حکومت کا وہی سلسلہ شروع کر دیا جس کا ایوب نے اقتدار سے ہٹائے جانے سے پہلے "ترقی کے دس سال کہہ کر" جشن منایا تھا۔ اس طرح پاکستان پھر وہیں پہونچا جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ ۱۹۶۲ء کا آئین منسوخ کیا گیا، سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگائی گئی، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا گیا، مرکزی اور صوبائی وزارتوں کو ہٹا دیا گیا اور پورے ملک میں مارشل لا نافذ کیا گیا۔ یحییٰ کے دور میں فوجی حکومت نے اپنی بدترین صورت کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے جس ناعاقبت اندیشی سے ملک کی سیاسی صورت حال کو نمٹانے کی کوشش کی اس کا نتیجہ بنگلہ دیش کے بحران کی صورت میں ظاہر ہوا اور آخر کار ملک کے ٹکڑے ہو گئے۔ یحییٰ کو بھی سول اور فوجی سروس کے اتحاد کا سہارا لینے کے بغیر اور کوئی راستہ نظر نہیں آیا حالانکہ یہ اتحاد ایوب کو اقتدار پر قائم رکھنے میں ناکام ہوا تھا۔ یہ بات یحییٰ کی کابینہ پر ایک نظر ڈالنے سے عیاں ہو جاتی ہے۔ آٹھ میں سے چار سینئر افسر (بیوروکریٹ)، ایک میجر جنرل، دو ایوب کی کابینہ کے وزیر، اور ایک سابق چیف جسٹس تھا۔ فوجی حکومت کا یہ مرحلہ جن جمہوریت مخالف روایات کی نمائندگی کر رہا تھا وہی آخر میں اس کی واحد سیاسی تبدیلی کی پاداش کا سبب بنی۔ یہ تبدیلی تھی وہ قانونی ڈھانچہ جس کی رو سے ۱۹۷۰ء کے چناؤ عمل میں لائے گئے مگر بعد کے حالات میں اسقدر بدانتظامی سے کام لیا گیا کہ فوج کو زبردست ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ غالباً دنیا میں پہلی بار ایک قوم کی فوج نے دوسری قوم کی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ پاکستانی فوج کی لڑنے کی ساکھ ختم ہو گئی کیونکہ اسے بنگلہ دیش کی جنگ میں ایک فیصلہ کن شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا اور یہ مسلمانوں کا علیحدہ وطن ہے اور ہندوستان ہندوؤں کا۔

بہر حال ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیرمین بھٹو نے ایک نمائندہ سرکار قائم کی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ستر کی دہائی کے آغاز میں حالات کا رُخ پلٹ گیا اور اقتدار پر فوج کی گرفت مضبوط کرنے کا جو عمل پچاس کی دہائی کے اواخر میں شروع ہوا تھا، اس پر ۱۹۷۱ء میں کاری ضرب لگی۔

یہاں ایک اور عمل کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے وہ یہ کہ ۱۹۵۸ء میں جب ایوب خاں نے سیاسی اقتدار پر قبضہ کیا تو انھوں نے اپنے سیاسی عقائد کا اظہار ایک پمفلٹ میں کیا۔ اس پمفلٹ کا نام "شارٹ ایپریسی ایشن" تھا، اور اس میں ایک اکائی کی سکیم، بنیادی جمہوریت، اشتراکیت کے خلاف الزام تراشیاں اور بالواسطہ حق رائے دہی جیسے پہلوؤں کی وضاحت کی گئی تھی۔

ان کا کہنا تھا کہ "بے قابو جمہوریت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ خاص کر موجودہ دور میں جب اندر اور باہر

کی اشتراکی قوتیں اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے سے چوکتی نہیں۔ اس لیے ہماری جمہوریت ایسی ہونی چاہیئے جس میں کچھ بندشیں ہوں اور انسدادی انتظامات ہوں۔" ایوب کے پاس اس قسم کی جمہوریت کا مطلب پارلیمانی نظام کو خارج کرنا اور صوبوں پر مرکزی طاقت کا استعمال کرنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ "چونکہ جمہوریت کی کوئی ایک صورت نہیں جسے کسی ترمیم وتبدیلی کے بغیر ہر ملک پر لاگو کیا جاسکے اس لیے مناسب یہ رہے گا کہ لوگوں کو ہر ذیلی یونٹ میں کچھ لوگوں کا ایک کالج منتخب کرنے کا موقعہ دیا جائے جو پھر صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے لیے ممبروں کا انتخاب کریں گے۔ انتخابات کے ایسے نظام کا انتظام آسانی سے چلایا جاسکتا ہے۔" صدر کو اس " نظام حکومت میں معتمد کی حیثیت" حاصل ہونی چاہیئے۔ چونکہ مغربی ملکوں کی طرز کا پارلیمانی نظام جس میں سیاسی پارٹیاں منظم ہوتی ہیں، پاکستان جیسے ملک کے لیے، جہاں خواندگی کی شرح بہت کم ہے اور جہاں مواصلات کا روایتی نظام موجود ہے، موزوں نہیں ہے۔ اور قرآن میں بھی" کسی مخصوص طرز حکومت" کی بات نہیں کہی گئی ہے اس لیے" اپنا نظام وضع کرنے کا کام ملک کے عوام پر ہی چھوڑ دیا جانا" چاہیئے۔

اوپر کے حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایوب کے دور حکومت میں پاکستان میں جو کچھ ہوا اس پر 'شارٹ ایپری سیشن' کے کیا اثرات تھے۔ ول کاکس اس کتاب 'ایپری سیشن' کو "پاکستان کے مستقبل کے واقعات کے بارے میں ایوب خاں کے خیالات کا منشور" بتاتے ہیں۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ "ظاہرا طور پر یہ مجموعی نظریہ ۱۹۵۳ء میں امریکہ میں کسی بند کمرے میں فوجی سامعین کے سامنے بھی پیش کیا گیا۔" ول کاکس کے اس شبہ میں بہت حد تک حقیقت موجود ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ تحقیقاتی کمیشن جیسے عوامی اداروں اور صدر ایوب کے خیالات میں ٹکراؤ کی صورت میں عام طور پر صدر کے خیالات کو کمیشن کی رپورٹ پر فوقیت ملتی تھی۔ یہ اختلافات اس امر کے باوجود پیدا ہوتے تھے کہ انھوں نے، ہر حکمراں کی طرح، ان کمیشنوں کو اپنی مرضی سے چنے ہوئے عملے سے بھر دیا تھا۔ ۱۹۶۲ء کا آئین، جو انہی حالات میں وجود میں آیا، صدر کے پاس ایک لونڈی بن کر رہ گیا۔

حالانکہ جہاں تک نظام حکومت کے مفہوم ومنشا کا تعلق ہے ۱۹۶۲ء کا آئین ۱۹۵۶ء کے آئین سے کوئی خاص مختلف نہیں تھا۔ دونوں میں جمہوری سیاست کے روپ میں بیوروکریسی کی آمریت کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ یہ بات ایوب کی حکومت کی کارکردگی کا جائزہ لینے سے واضح ہو جاتی ہے۔

ایوب کے اقتدار سنبھالنے کے بعد فوجی حکومت نے کئی مارشل لا آرڈی ننس جاری کیے جن میں کچھ ایک کا مقصد سیاستدانوں کو سرگرم سیاسی زندگی سے موثر طور پر ہٹانا تھا۔ ایک ایسا آرڈی ننس پی او ڈی او

یعنی سرکاری افسروں کو نا اہل قرار دیئے جانے سے متعلق ۱۹۵۹ء کا حکم ـــــ (Public Officers Disqualification order 1959) ـــــ تھا، جس کا مقصد ان عہدیداروں کو جو "بے راہ روی کے قصوروار" پائے جائیں' اپنے عہدوں پر برقرار رہنے کے نا اہل قرار دینا تھا۔ مگر یہ قانون صرف ان لوگوں پر عائد ہوتا تھا جن کے پاس سرکاری عہدے تھے۔ قانون سازیہ کے ممبر اس کے دائرے میں نہیں آتے تھے۔ اُن کے لیے ضمنی آرڈی ننس جاری کیا گیا جس کو ای بی ڈی او یعنی منتخب اداروں کے لیے نا اہل ہونے کا حکم (ELECTIVE BODIES (DISQUALIFICATION) ORDER, 1959) کا نام دیا گیا۔ اس کو ضرورت کے مطابق، مخالف سیاستدانوں کو، کوئی سخت مزاحمتی راہ اختیار کرنے سے روکنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ ان دونوں آرڈی ننسوں کو، ۱۹۵۹ء میں پاس کیا گیا اور ان کو ۱۹۴۹ء کے اس قانون کا ایک لازمی سلسلہ کہا جا سکتا ہے، جو سرکاری اور منتخب افسروں کو نا اہل قرار دیئے جانے سے متعلق' قانون سے موسوم تھا اور جو سرکار کا ایک ایسا آلہ تھا جس کو ماضی میں منتخب نمائندوں کے اداروں کے خلاف بنایا اور استعمال کیا گیا تھا۔ کتنے لوگوں کو نا اہل قرار دے کر خارج کر دیا گیا ان کی تعداد جاننا مشکل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ تعداد چھ ہزار تھی۔

پی او ڈی او اور ای بی ڈی او سے تو مخالف پارٹیوں کے دبے رہنے کی بات یقینی بن گئی۔ کم سے کم ۱۹۶۶ء تک۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ انھوں نے فوجی حکومت کی غلطیوں اور انتہائی ظالمانہ حرکتوں کے معاملے اٹھا کر پھر سے سرکار پر حملے شروع کر دیئے جو پہلے ہی ۱۹۶۵ء کی ہند۔پاک جنگ کے بعد رسوا ہو چکی تھی۔ مخالف پارٹیوں نے قومی پیمانے کے مزاحمتی حالات کو ایوب سرکار کو ختم کرنے کیلئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ مگر مخالف پارٹیوں کے ساتھ فوجی حکومت کا برتاؤ صرف پی او ڈی او اور ای بی ڈی او جیسے قانونی اقدامات تک ہی محدود نہیں رہا۔ مخالف پارٹیوں کے ممبروں کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا۔ چنانچہ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۲ء میں سیاسی قیدیوں کی تعداد ایک ہزار پانچ سو تھی۔ ایوب کے ایک بھائی سردار بہادر خاں کے مطابق فوجی حکومت نے ۱۹۶۲ء میں کنسن ٹریشن کیمپ (CONCENTRATION CAMPS) بھی منظم کیے تھے جہاں بڑے پیمانے پر سیاسی انتقام گیری کی کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ کچھ سیاسی قیدیوں کو "نیم عریاں حالت میں الٹا لٹکا دیا گیا" اور کچھ کو مار دیا گیا۔

فوجی حکومت کے عتاب سے اعلیٰ تعلیم کا دائرہ بھی بچ نہ سکا۔ کمیونسٹ لٹریچر پر پابندی لگائی گئی جبکہ امریکی انفارمیشن سینٹر سروس کی طرف سے اُس لٹریچر کا ترجمہ کیا جانے لگا اور اُسے رعایتی قیمتوں پر تقسیم کیا جانے لگا جس میں امریکی سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے جمہوری طرز نظام کے گیت گائے ہوں۔ اسکی

ایک مخصوص مثال روسٹو کی 'دی پراسپیکٹس آف کمیونسٹ چائنا' ہے جو دس سینٹوں (CENTS) کے بھاؤ بک رہی تھی۔

اس سے پاکستان کے فوجی حکمرانوں پر زبردست امریکی اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ دلیل بھی غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ کم ترقی یافتہ ملکوں کی فوجی حکومتیں اپنے مقاصد میں "نظریہ پرست نہیں تھیں"۔ جیسا کہ جانسن اور رشید الزماں جیسے میصروں نے کہا ہے۔ یہ بات اس حقیقت سے بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ ۱۹۶۷ء کا سرکاری حکم، جس کے تحت سیاسی پارٹیوں پر عاید پابندیاں ہٹا دی گئیں، پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی پر لاگو نہیں ہوا جس پر ۱۹۵۴ء ہی میں پابندی لگائی گئی تھی۔

گرد یزی بھی کہتے ہیں کہ فوجی حکومت نے ملک کے "بائیس بڑے خاندانوں" کے ساتھ مل کر کاروائی کر کے پاکستان کے پریس پر اجارہ داری حاصل کی۔ یہ حالت کم از کم ۱۹۷۰ء تک جاری رہی۔

پاکستان کی سیاسی زندگی پر افسر شاہی کا اتنا غلبہ رہا ہے کہ فوجی اور غیر فوجی عہدوں کے نام، ان عہدوں سے ریٹائر ہونے اور سیاسی زندگی میں داخل ہونے کے بعد اپنے ناموں کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے چناؤ میں ایسے امیدواروں کی کثرت تعداد کو دیکھ کر ایک تبصرہ نگار نے کہا:

" عوامی لیڈر شپ کے نئے دعویدار اس طرح نمودار ہو رہے ہیں جس طرح بارش کے بعد مشروم۔ ان کے رول نئے ہیں لیکن چہرے جانے پہچانے۔ کئی سابق جنرل، ایئر مارشل، وزیر، سیکریٹری، سول سروس کے افسر اور جج اپنے ریٹائرمنٹ کی آسائشوں سے نکل کر ظاہر ہو رہے ہیں وہ جس انداز سے اپنی فہم و فراست کی تشہیر اور اپنے سابق عہدوں کے ناموں کی نمائش کر رہے ہیں اس سے ایک ہوشربا منظر پیش ہو رہا ہے۔ جمہوریت کے ان نام نہاد عاشقوں کو اپنے موجودہ اور پچھلے رولوں کے تضاد کی طرف نظر نہیں جاتی۔ اس کے برعکس وہ بڑے فخر کے ساتھ ان منصوبوں کے نام کی نمائش کر رہے ہیں جن پر وہ فائز رہ چکے ہیں۔ یہ قبیلہ پرستی کی ایک نئی صورت ہے۔ لیڈر شپ کے دعوی کی بنیاد اب بھی دعویدار کے رتبے پر ہے مگر اب دعوی کا جواز سابق عہدوں کی بنیاد پر پیش کیا جا رہا ہے۔"

(۲)

پاکستان کو امریکہ کی فوجی نوعیت کی حکمت عملی میں ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ ایران کے شاہ مخالف انقلاب اور افغانستان کے انقلاب کے بعد مشرق وسطیٰ کے تیل کی دولت سے مالا مال علاقوں کے دفاع کے سلسلے میں امریکہ کے مفادات نے ایک نئی صورت اختیار کی۔ ان مفادات کو یوں تو ان واقعات سے بہت پہلے پچاس کی دہائی کے آغاز میں ہی ٹھوس شکل حاصل ہوئی تھی۔

کیونکہ ان علاقوں کی اہمیت کو ۱۹۵۱ء میں سر اولف کارو نے، جو برٹش انڈین سول سروس کے ایک ممتاز رکن تھے، اپنی کتاب " WELL OF POWER : THE OIL FIELDS OF SOUTH WESTERN ASIA" — (ویل آف پاور : دی آئل فیلڈس آف ساؤتھ ویسٹرن ایشیا) میں واضح کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسی سال (۱۹۵۱ء) میں ہینری بائی روڈ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ بن گئے اور وزارت خارجہ میں انھوں نے مشرق قریب، جنوبی ایشیا اور افریقی خطہ کے معاملات کا چارج سنبھالا۔ یہ عہدہ سنبھالنے کے بعد انھوں نے برگیڈیر جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دیا تھا۔ انھوں نے کارو کی تھیسز پر اعتبار کیا اور ان کے ساتھ اسوقت مفصل تبادلۂ خیال بھی کیا جب وہ ۱۹۵۲ء میں واشنگٹن آئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ستمبر ۱۹۵۱ء میں امریکی ہوائی فوج کے چیف آف سٹاف جنرل ہائٹ فان ڈین بیر گٹ نے ایک رپورٹ کے مطابق چسٹر باولز کو لکھا تھا " ہم آپ کو اُدھر ہندوستان میں کچھ زحمت دینے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ہماری نظریں پاکستان میں فوجی ٹھکانوں پر لگی ہوئی ہیں۔" سر اولف کارو اس بات پر زور دے رہے تھے کہ مشرق وسطیٰ کے دفاع کے لیے پاکستان کو اڈہ بنایا جائے۔ چونکہ برطانیہ یہ علاقہ خالی کر رہا تھا اس لیے امریکہ سے کہا جا رہا تھا کہ وہ اس پراجیکٹ میں شامل ہو جائے اور برطانیہ کی معلومات کا استفادہ کرے۔

پاکستان کے نئے حکمراں طبقہ کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ امریکہ کی عالمی نوعیت کی سیاسی اور فوجی حکمت عملی میں پاکستان کو اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے زبردست اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے اس جانبدارانہ رویہ سے واضح ہو جاتی ہے جو انھوں نے واشنگٹن میں نیشنل پریس کلب کو خطاب کرتے ہوئے اختیار کیا۔ انھوں نے کہا تھا:

> " خلیجی علاقوں کے بھاری وسائل حاصل کرنے کی ایک شعوری پالیسی وضع کرنے اور جنوب مغربی ایشیا میں کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لیے فلاحی ملکوں کا ایک گروپ قائم کرنے کی پہل شاید پاکستان ہی کو کرنا پڑے۔"

چنانچہ پچاس کی دہائی کے آغاز میں پاکستان کے سیاسی لیڈروں اور اعلیٰ فوجی اور غیر فوجی افسروں نے اپنے ملک کا امریکہ کے ساتھ باہم ناطہ جوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ابتدائی طور پر اس اتحاد کی نوعیت ایک دوسرے پر انحصار کرنے کے باہمی تعلق کی رہی۔ وہ اس طرح کہ پاکستان کسی طاقتور ساتھی کی تلاش میں تھا اور امریکہ مغربی ایشیا میں اپنے تیل کے مفادات کے دفاع کے لیے اڈوں کی تلاش میں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ صورتِ حال بدل گئی۔ چھوٹا ملک تو اب بھی طاقتور ساتھی کی تلاش میں تھا، مگر طاقتور ساتھی کی فوجی ترجیحات کی تشریح میں صرف فوجی سہولیات کی فراہمی ہی شامل نہیں تھی بلکہ اس کا سیاسی اور اقتصادی استحکام بھی۔ اس لیے باہمی انحصار کی یہ صورت حال جلدی ہی بدل گئی

اور پاکستان پوری طرح امریکہ پر انحصار کرنے لگا۔ اس سمت میں، توقع کے مطابق، فوج نے پہل کی اور سول بیوروکریسی اس کے نقش قدم پر چلی۔ وہ عناصر جو سیاسی ڈھانچہ سے وابستہ تو تھے، مگر خارجی طور، اس پر قبضہ نہیں کر سکے، وہ بھی اس نوآبادیاتی صف بندی میں شامل ہو گئے۔ یہ رجعت پسند قوتیں، جن میں نیم جاگیردارانہ زمیندار، تاجر سرمایہ دار، مذہبی تقلید پسند عناصر، اور بھاری تعداد میں ادنیٰ بورژوا شامل تھے۔ زراعت اور صنعت میں سرمایہ دارانہ عناصر اور بورژوا طبقہ کے انقلابی عناصر کے خلاف کمربستہ ہو گئے تاکہ قسم قسم کے پراگندہ کرنے والے پیداواری طریقے پیدا کیے جائیں جو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہو کر موجود ہوں ایسا سیاسی نظام مقابلتاً زیادہ خود مختار اداروں کی وجہ سے ضروری ہو گیا تھا جو عموماً ایک نو آزاد ملک میں دستیاب نہیں ہوتے۔

پاکستان کے نظام کے مختلف پہلو بہت سے اسکالروں کی تحقیق کا موضوع رہے ہیں۔ گڑناو، ہاشم، حمزہ علوی، طارق علی وہ محقق ہیں جنھوں نے اس موضوع پر کام کیا ہے اور اکثر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پاکستان کے، بے قاعدگی سے بدلتے ہوئے حالات میں، امریکی امداد پر اس کے انحصار کو ایک بڑا عمل دخل رہا۔ لیکن ہمارے اس جائزہ کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ جدید نوآبادیاتی اثرات کس حد تک اور کب تک بیوروکریسی گٹھ جوڑ کے انتہا پسندوں پر قائم رہنے جا رہا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں، کیا ایک متبادل بورژوا جمہوری حکومت اس بیوروکریسی گٹھ جوڑ کو تباہ کیے بغیر جدید نوآبادیاتی آرائشوں کا مقابلہ اور ان کی مخالفت کر سکے گی۔

جن حالات میں مسلح فوج پاکستان کی فوجی سیاست پر چھا گئی ان کی ابتدا پاکستان کے ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود میں آنے کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں کشمیر میں تصادم ہوا، اور تب سے، جیسا کہ علوی نے صحیح کہا ہے کہ پاکستان میں وطن پرستی نے ایک منفی صورت اختیار کی۔ اور کشمیر کے اس جھگڑے کو وطن پرستی کے جذبات ابھارنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اس تصادم سے فوج کو ایک مستقل احساسِ مقصد بھی حاصل ہو گیا اور یہی فوج کے اعتماد کا موجب بھی بنا۔ اور ساتھ ہی ایک ایسی صورتِ حال نے بھی جنم لیا جس میں پاکستان ایک طاقتور ساتھی کی تلاش کرنے لگا۔ مسلح افواج کے کمانڈر ان چیف تو اگست ۱۹۵۱ء ہی میں یہ سوچنے لگے تھے کہ ہندوستان کے ساتھ جنگ میں پاکستان کا کوئی طاقتور اور قابل بھروسہ دوست ہونا چاہیے۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں امریکہ کے ساتھ سفارتی سطح پر ابتدائی نوعیت کی بات چیت ہوئی۔ نومبر ۱۹۵۳ء میں گورنر جنرل غلام محمد اور کمانڈر ان چیف جنرل ایوب نے امریکہ کا دورہ کیا اور امریکہ کے نائب صدر دسمبر میں پاکستان کے دورہ پر آئے۔ اس کے بعد پاکستان نے رسمی طور پر امریکہ سے فوجی امداد کی درخواست کی۔ امریکہ بھی چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹ مئی ۱۹۵۴ء کو باہمی دفاعی معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ اور اس کے بعد

سیٹو اور سینٹو اتحاد قائم ہوئے اور اس طرح پاکستان امریکہ کے دفاعی جال کا ایک حصہ بن گیا۔

ایوب خان نے ۱۹۵۱ء میں امریکہ میں اعلان کیا تھا کہ اس برِ اعظم میں پاکستان ہی وہ واحد ملک ہے جس کی سرزمین پر امریکہ کی مسلح فوج آزاد دنیا کی حفاظت کے لیے کسی بھی وقت اُتر سکتی ہے۔ امریکہ کے ساتھ اس ٹھوس اتحاد کے باعث ایک طرف ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی فوج مضبوطی حاصل کر رہی تھی اور دوسری طرف سے پچاس کی دہائی کی وزارتوں میں فوجی افسروں کو شامل کیا جا رہا تھا۔

امریکہ نے پاکستان کو جو فوجی امداد فراہم کی اس کی صحیح مالیت بتانا اگرچہ مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی ۱۹۶۵ء کی ہند۔ پاک جنگ کے دوران جو ہتھیار پاکستان کو فراہم کیے گئے، ان کے جائزہ سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ پاکستانی فوج کو جدید بنانے میں امریکہ کا رول بہت اہم رہا ہے۔ جنگ کے بعد امریکہ نے اپنی فوجی امداد بند تو کی مگر، جیسا کہ ایک وسیلہ کا کہنا ہے، چین کی ہتھیاروں کی سپلائی مقابلتاً کم رہی یا کم از کم اتنی کم کہ پاکستان کے ہتھیاروں کی بھاری تعداد میں امریکی چھاپ بدستور قائم رہی اور نتیجہ یہ کہ کل پرزوں اور کسی حد تک گولہ بارود کی سپلائی کے لیے امریکہ پر پاکستان کا انحصار کم نہیں ہوا۔

امریکی ہتھیار آنے سے یہ ضروری ہو گیا کہ پاکستان کے فوجی عملہ کو ان ہتھیاروں کی جانکاری فراہم کی جائے اور ان کو تربیت دی جائے۔ یہ کام امریکہ نے "فوجی امداد کے پروگرام" کے تحت انجام دیا۔ اس پروگرام کو مختصراً میپ (MAP) کہا جاتا ہے یعنی MILLITARY ASSISTANCE PROGRAMME

اس پروگرام سے امریکہ کے دو مقاصد پورے ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ لیفٹ ور نے قومی سلامتی سے متعلق امریکہ کی سینٹ سب کمیٹی کو بتایا:

"ایک یہ کہ اس پروگرام میں شامل ہونے والے ملکوں کے اندر اور ان ملکوں کے درمیان استحکام کو فروغ ملتا ہے اور ان کی اپنی دفاعی صلاحیت بڑھ جاتی ہے جس سے ہمارا سلامتی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ دوم یہ کہ ان ملکوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے آنے سے ان کے ساتھ ذاتی رابطے اور مراسم بڑھ جاتے ہیں۔ ان لوگوں میں ان ملکوں کے آج کے لیڈر اور کل کے امکانی لیڈر شامل ہوتے ہیں۔ وہ یہاں آکر امریکہ کی زندگی اور ہمارے طریقوں سے واقف ہو جاتے ہیں جس سے ہمارے دور رس سیاسی مقاصد پورے ہو جاتے ہیں۔"

صدر ایوب نے یہ کہہ کر اس بات کی تصدیق کی کہ "امدادی پروگرام کے تحت کورسوں اور مطالعاتی اداروں سے بہر صورت فوجی افسروں کے خیالات پر فیصلہ کن اثرات پڑیں گے۔" اس کا ثبوت ۱۹۵۸ء میں اس وقت ملا جب ایوب نے سرکار کا تختہ الٹ دیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس کارروائی میں سی آئی اے نے ان کی مدد

کی تھی۔ خود ایوب کے بھائی کی رائے بھی یہی تھی کہ "۱۹۵۸ء کی تختہ الٹ دیئے جانے کی کارروائی میں ضرور سی آئی اے کا ہاتھ تھا۔"

چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ پچاس کی دہائی میں ملک کی پالیسیاں وضع کرنے اور ان پر عمل درآمد کرنے میں سیاسی نمائندوں کے بدلے اعلیٰ فوجی اور غیر فوجی افسروں کا ہاتھ تھا۔ ہاشمی کی ایک سروے کے مطابق ۱۹۵۱ء ـ ۱۷ کی مدت کے دوران امریکہ اور پاکستان کے درمیان جو اہم معاہدے ہوئے یا معاہدوں میں ترمیم و تبدیلی ہوئی، ان سے متعلق دستاویزات پر پاکستان کی طرف سے دستخط کرنے والے انسٹھ (۵۹) افراد میں انتالیس (۳۹) اعلیٰ پایہ کے بیوروکریٹ تھے۔ اس سلسلے میں یہ اعتراض پیش کیا جاسکتا ہے کہ ان معاہدوں کو آخر کار عملی صورت افسر لوگ ہی دیتے ہیں، اس لیے دستخط کرنے والوں میں ان کی تعداد زیادہ ہونے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ مگر اس قسم کا اعتراض کرنے والے اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں، اور یہ حقیقت سیاسی لحاظ سے اہم ہے کہ پاکستان میں ۱۹۵۱ء سے ہی، جب ایک اعلیٰ پیمانہ کے بیوروکریٹ غلام محمد نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا، فوجی یا غیر فوجی افسروں کی حکومت رہی ہے۔

(۳)

نوکرشاہی کی آمریت کی سیاسی بناوٹ میں ہمیشہ نوآبادیاتی اثر و حمایت کا زبردست دخل رہا ہے۔ اس پہلو کا تجزیہ اس سیاسی اثر و رسوخ کا مکمل تنقیدی جائزہ لینے سے ہی ہو سکتا ہے، جو امریکہ کی خارجہ امداد کی وجہ سے اس کو حاصل رہا۔ پاکستان کا سیاسی معیشت کا مکمل جائزہ لینے سے بہت ہی دلچسپ رجحانات کا پتہ چل جاتا ہے۔ پاکستان کو بیرونی ممالک سے جو امداد حاصل ہوتی ہے اس کا ۴/۵ حصہ امریکہ سے یا امریکہ کی رہنمائی میں او ای سی ڈی ملکوں سے آتا ہے۔ اس بات کا اشارہ تو پہلے ہی دیا جا چکا ہے کہ ابتدا میں امداد کی رقم ساٹھ فی صد کے برابر تھی مگر اب یہ کم ہو کر پانچ فی صد رہ گئی ہے۔ اب امریکہ سے جو امداد حاصل ہو جاتی ہے وہ قرضوں کی صورت میں دی جاتی ہے اور ان قرضوں کے ساتھ مختلف شرط و شروط عائد کیے جاتے ہیں۔ پاکستان ان قرضوں کی واپسی ادائیگی میں لٹتا جا رہا ہے۔ اوسطاً اپنی برآمدات کی کل آمدنی کا تقریباً تیس فی صد حصہ اسے صرف سود کی صورت میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان نے ۱۹۶۹ء میں امریکہ سے "ترقیاتی قرضہ" کے تحت ۷ء۱۴۹ ملین ڈالر ادھار لیے تھے۔ مگر وہ صرف ۳ء۴۷ ملین ڈالر کی رقم واپس ادا کر سکا ہے جبکہ ۶ء۱۲۱ ملین ڈالر کی رقم بطور سود ادا کی گئی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ قرضوں کی یہ رقم اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس کے بوجھ تلے دب کر پاکستان، امریکی اثر و رسوخ کے سامنے، بالکل لاچار ہو کر

رہ گیا ہے۔

امریکہ کا یہ اثر دو طرح سے اپنا کام کرتا ہے۔ ایک یہ کہ امریکی ٹیکنیکل امداد کے تحت پاکستان میں بیرونی ماہرین کی خدمات میسر رہتی ہیں اور پاکستانی عملہ کو باہر جاکر تربیتی سہولیات۔ اس سے سول بیوروکریسی کے انتظامی اختیارات غیر مرکوز بھی ہوگئے ہیں اور ان کا دائرہ بڑھتا بھی گیا ہے۔ دوم یہ کہ سول بیوروکریسی کو بھاری پیمانہ پر ترقیاتی وسیلہ بہم رہتے ہیں جس سے ان کی طاقت میں زبردست اضافہ ہوگیا ہے انتظامیہ کے شعبہ میں USAID (یونائیٹڈ سٹیٹس ایجنسی برائے بین الاقوامی ترقی) اور فورڈ فاؤنڈیشن کا بڑا رول رہا ہے۔ فورڈ فاؤنڈیشن تو ۱۹۵۳ء ہی میں پاکستان کے منصوبہ ساز کمیشن کو مشاورتی خدمات مہیا کررہا تھا۔ اس کے علاوہ لاہور میں پاکستان ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج اور پشاور اور کومِلا میں رورل ڈیولپمنٹ اکیڈمیاں قائم کرنے میں فورڈ فاؤنڈیشن کا ہاتھ رہا ہے۔

یو، ایس ایڈ نے اپنی تمامتر توجہ پاکستان میں انتظامی صلاحیت رکھنے والے نئے افسروں کو تربیت دینے کی طرف دی۔ ان تربیتی سہولیات اور ٹیکنیکل امداد کی وجہ سے پاکستان کے بیوروکریٹ انتظامیہ کے امریکی نظریئے سے پوری طرح واقف ہوگئے۔ اس بندھن کو اس وقت قانونی جوازیت حاصل ہوگئی جب ۱۹۶۴ء میں پاکستان سرکار کے اسٹیبلشمینٹ ڈویژن نے اس بات کو لازمی قرار دیا کہ پاکستان سول سروس کے نوجوان افسروں کو بیرونی ملکوں میں اعلیٰ تربیت حاصل کرنے کیلئے بھیجا جائے۔ ان میں ان تمام افسروں کو شامل کیا گیا جو ۱۹۵۹ء یا اس کے بعد سول سروس میں شامل ہوئے تھے۔ ایسے قواعد وضوابط سے پاکستان سول سروس کے افسروں کو مستقبل میں دوسروں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے چھوٹ حاصل کرنے میں مدد مل گئی۔ یہ چیدہ افسر اگرچہ کم ہی تھے، مگر یہ بااختیار عہدوں پر اپنی تعداد بڑھاتے رہے اور ۱۹۶۹ء تک معیشت سے تعلق مرکزی وزارتوں میں ڈپٹی سیکریٹری اور اس سے اوپر کے عہدوں میں ان کی تعداد ۶۰ فی صد اور غیر معاشی وزارتوں میں ۶۶،۶ فی صد ہوگئی۔

اب جہاں تک ترقیاتی وسیلوں کا تعلق ہے تو ہمیں پی ایل ۴۸۰ کے تحت حاصل ہوئی زرعی اشیا کی امداد کے استعمال کے طریقہ پر نظر ڈالنی چاہئے۔ ہاشمی نے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۱ء تک کی مدت کا جائزہ لیا ہے اور وہ جن نتیجوں پر پہنچے ہیں وہ قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۵۱ء سے پاکستان کو ۱،۱۳۱۳ ملین ڈالر کی مالیت کی "فاضل زرعی اشیاء" کی امداد حاصل ہوئی اور اس سے جو رقومات میسر ہوئیں وہ مختلف سرگرمیوں کے لیے استعمال ہوئیں۔ ۲۲،۷ ملین ڈالر کی رقم " اطلاعات اور تعلیم" پر خرچ کی گئی۔ جبکہ ۵۰ ملین ڈالر پرائیویٹ کارخانہ داروں کو قرضوں کی صورت میں فراہم کی گئی۔ امریکی قانون کے تحت ایسے قرضے یا تو "امریکی اداروں کو دیئے جاسکتے ہیں یا ان اداروں کو جو امریکی اشیاء کی مارکیٹنگ کا کام کرتے ہوں"

ایسے قرضے" امریکہ کو برآمد کی جانے والی ایسی ایسی اشیاء کی پیداوار کے لیے نہیں دی جاسکتی، جو امریکہ میں تیار ہوتی ہوں "۔ ۲۱۳ء۱۲ ملین ڈالر کی رقم بہت زیادہ شرحِ سود پر حکومت پاکستان کو بطور قرضہ دی گئی۔ "فوجی اخراجات" کی ۴۴ء۹۷ ملین ڈالر کی رقم اسی مد میں شامل ہے۔

اس طرح فاضل اشیاء کے تحت جو امداد دی گئی، اس کی کل مالیت اگرچہ ۱۱۲ء۱۳۱۳ ملین ڈالر تھی مگر "گرانٹس" کی صورت میں صرف ۹۳ء۲۸۵ ملین کی رقم فراہم کی گئی۔ اس میں جنرل ایوب خاں کے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد اضافہ کیا گیا۔ لیکن ترقیاتی گرانٹوں میں جو ۱۹۵۸ء سے اضافہ ہوگیا، اس کے فائدے بھی امریکی تاجروں کو اپنا کاروبار بڑھانے کے لیے مہیا کیے گئے۔ کیونکہ فوجی حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے بعد پاکستان میں مقابلتاً "سیاسی استحکام" پیدا ہوگیا تھا۔

چنانچہ امریکہ کو پاکستان میں ترقیاتی پراجیکٹوں کے منصوبے بنانے اور ترقیاتی کاموں کے اخراجات پر پورا کنٹرول حاصل ہوگیا۔ اس کو پراجیکٹوں پر نگرانی کے حقوق بھی حاصل ہوئے۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۳ء کے مالی سال کے دوران امریکہ کے ۸ء۱۷۶ ملین ڈالر کے ترقیاتی قرضے اور ۹ء۸ ملین کے گرانٹ پندرہ پراجیکٹوں کے لیے مخصوص کیے گئے اور ان سبھوں میں امریکہ کو نگرانی کے حقوق حاصل تھے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس سال میں ۸۵ء۱۰ ملین ڈالر کے قرضے اور گرانٹ امریکہ کی طرف سے ان پراجیکٹوں کی پلاننگ اور سروے پر صرف کیے گئے۔ علوی اور خسرو نے سرکاری کنٹرول کے اخبار (پاکستان ٹائمز، ۱۱ جون ۱۹۶۱ء) کا حوالہ دے کر بتایا ہے کہ امریکی مشاورتی خدمات کی لاگت اتنی زیادہ ہے کہ" امریکہ نے ایسی خدمات کے لیے الاٹ کی ہوئی اپنی رقم کا پچاس سے ساٹھ فی صد حصّہ واپس لیا"۔

پاکستان کی بیوروکریسی نے ایک تو امریکہ پر کھلم کھلا انحصار کے لیے ملکوں کی خود کفالت قربان کردی اور ساتھ ہی ایسے ملکی سرمایہ داروں کو جنم دیا جو اس کا اتحادی بن گیا۔ سول سروس اور تاجر سرمایہ داروں کا یہ اتحاد اس طرح عمل میں آیا کہ سول سروس کے افسر سرمایہ داروں کو سرکاری وسیلے مہیا رکھنے اور بدلے میں ان سے رشوت حاصل کر لیتے۔ اس طرح سے دونوں کا یہ گٹھ جوڑ مضبوط ہوگیا۔ رچرڈ ونشینز کا کہنا ہے:

" ان کا (ملکی سرمایہ داروں کا) سول سروس کے ساتھ گاہکوں جیسا تعلق رہا۔ سول سروس کی طرف سے ان کو رعاتیں اور سرپرستی حاصل رہی اور بدلے میں وہ رشوت، سہولیات، چندہ اور دوسری ضروری چیزیں مہیا کرتے جس سے سول سروس میں وسیع پیمانے پر کرپشن پھیل گیا . . . پاکستان کا تاجر دولت مند بن گیا . . . مگر اس کو براہ راست سیاسی اقتدار حاصل کرنے سے ہمیشہ باز رکھا گیا۔ اس طرح سے ایک آزاد سرمایہ دار طبقہ کے بدلے ایک ایسا بورژوا طبقہ وجود میں آگیا جو سرکار کی سرپرستی پر زندہ تھا۔ اور جو فوجی اور سول بیوروکریسی کے موجودہ ڈھانچہ کے ساتھ جڑ کے رہ گیا"۔

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اعلیٰ فوجی افسروں اور بیوروکریسی کے اتحاد پر مبنی اس نظام نے امریکی جدید نوآبادیاتی مفادات اور پاکستان کے کمزور بورژوا طبقہ کے درمیان ایک رابطہ کا کام کیا۔ اور اسی نظام کی بدولت سامراجی سرمایہ تک رسائی آسان ہوگئی۔

امریکی سرمایہ نے پاکستانی منڈی کو آسانی کے ساتھ زیادہ نفع کمانے کے لیے نہایت موزوں پایا چونکہ امریکی قرضوں کا ۹۵ فی صد حصہ، معاہدوں کے مطابق، امریکہ ہی میں مشینری اور بنیادی سرمایہ کی دوسری چیزیں خریدنے کے لیے صرف کرنا پڑتا ہے، اس لیے یہ ملک بیرونی سرمایہ داروں کے مفادات کی آماجگاہ بن گیا۔ امریکہ کی بدیشی امداد کے بارے میں سینٹر چرچ نے کہا۔" اس بات کی کافی شہادتیں ہیں کہ ہمارے بدیشی امداد کے پروگرام کی بنیاد اس حد تک انسان دوستی اور ہمدردی پر نہیں ہے جتنا کہ ہم ظاہر کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف ہمارے فائدے کے لیے ہے" ایڈ کے سابق ڈائریکٹر ولیم گاڈ نے یہ انکشاف کیا۔" امدادی فنڈ کا ۹۳ فی صد براہ راست امریکہ ہی میں صرف کیا جاتا ہے۔ ابھی پچھلے سال تقریباً چار ہزار امریکی فرموں کو ان پیداواری اشیاء کے لیے ۱،۳ بلین کی ایڈ رقم حاصل ہوگئی، جو بدیسی امداد کے پروگرام کے تحت سپلائی کی گئیں"

(۴)

ان باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں مطلق العنانیت کی بنیادیں اس دور میں موجود ہیں جب نوآبادیاتی حکومت کے خاتمہ کے بعد ملک میں سیاسی نظام کا ارتقا عمل میں آرہا ہے۔ سیاسی آمریت کا یہ رجحان ملک کے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچوں کا امریکہ کے ساتھ ناطہ جوڑنے سے مضبوطی حاصل کرتا جارہا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ہندوستان کو تقسیم کرکے پاکستان کا وجود بھی رول ادا کرنے کے لیے عمل میں لایا گیا تھا۔ درجہ اور اہمیت کے اعتبار سے پاکستان کی سیاسی آمریت میں تبدیلی تو آتی رہی ہے لیکن اس کا بنیادی کردار بدل نہیں گیا ہے۔ جب بھٹو اقتدار میں آئے تو انھوں نے اس مرض کی تشخیص تو کی لیکن مرض کی بنیاد کیا ہے، اور یہ کس حد تک پھیل گیا ہے، اس کا اندازہ کرنے میں وہ ناکام رہے۔ لہذا انھوں نے پاکستان کے سیاسی نظام کے کردار کو بدلنے کے لیے بیدلی سے اقدام کیے؛ اور ان کو نہیں پتہ تھا کہ وہ ایک خونخوار جانور سے برسرپیکار رہیں۔

ان واقعات و حالات کو سامنے رکھ کر ہم جن نتائج پر پہنچ سکتے ہیں وہ یہ ہیں :

۱۔ نام نہاد "پارلیمانی سیاست" کے دور میں پاکستان کا سیاسی نظام چلانے میں بیوروکریسی خاص طور پر پاکستان سول سروس کا بڑا دخل تھا، بلکہ وہی اس کی رہبری کر رہے تھے۔

۲۔ ایوب کے اقتدار سنبھالنے پر، فوجی بیوروکریسی نے برتری حاصل کی مگر اس نے سول بیوروکریسی کے اختیارات اور ان کو حاصل رعایتوں میں کسی قسم کا کوئی خلل نہیں ڈالا کیونکہ وہ فوج کے نقش قدم پر چلنے کو تیار تھے۔

۳۔ آئین اور منیر تحقیقاتی کمیشن جیسے اعلیٰ اور غیر جانبدار اداروں میں بھی بیوروکریسی کے حق میں ترجیحات ظاہر کرنے سے پس و پیش نہیں کیا۔

۴۔ آمریت کے رجحانات کو جمہوری سیاست کی فضا میں نشوونما حاصل ہوئی۔ (خود جناح نے جمہوری تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا) پی او ڈی او، پی آر او ڈی اے، ای بی ڈی او جیسے غیر جمہوری اقدام کیے گئے۔ آئین ساز اسمبلیوں کو توڑا گیا۔ منتخب سرکاروں کو ہٹا دیا گیا اور ۱۹۵۹ء میں انتخابات عمل میں لانے کے پروگرام کو ختم کیا گیا۔

۵۔ فوج اور سول بیوروکریسی کی پہل پر آمریت کے رجحانات ابھرنے کی بات جدید نوآبادیاتی حمایت اور ان کی چالوں سے ممکن ہوئی۔ پاکستان کے اس مطلق العنان اتحاد کو امریکہ کے سرمایہ تک براہ راست رسائی حاصل رہی۔ جس کی گواہی امریکہ کے ساتھ معاہدوں پر بیوروکریٹو کی طرف سے دستخط کرنے کے رجحان سے ملتی ہے۔ تربیتی پروگراموں، بیرونی دوروں ، اور جدید نوآبادیاتی مرکزوں سے بھاری پیمانہ پر وسائل فراہم ہونے سے یہ رجحانات مضبوطی حاصل کرتے گئے۔

۶۔ جدید نوآبادیاتی امداد سے اعلیٰ سول افسروں اور فوجی جنرلوں کا ایک گروپ وجود میں آیا۔ اور ان افسروں کا تعلق پنجاب سے تھا۔

۷۔ اور آخر میں یہ کہ جدید نوآبادیاتی طاقتوں نے ساٹھ کے اختتام تک پاکستان کی معیشت کو مکمل طور پر اپنے زیر اثر لانے کی کارروائی مکمل کی تھی۔ پاکستان کے لوگ بیرونی قرضوں کی ادائیگی کے لیے بڑی بڑی رقمیں ادا کر رہے ہیں اور امداد کی صورت میں دیئے گئے قرضوں کی رقمیں مغربی پاکستان کے اعلیٰ افسر اور تاجر طبقہ جس کا سارا دارومدار، ان اعلیٰ افسروں پر ہے، لوٹتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف یہ تاجر طبقہ بیوروکریسی کا دست نگر ہے اور دوسری طرف بیوروکریسی کے اقتدار کے تحت پاکستان، سامراجی سرمایہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ پاکستان میں ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس میں ایک غیر ذمہ دار تاجر طبقہ وجود میں آ رہا ہے۔ جن کو خزانہ عامرہ کے فنڈوں سے سرپرستی کی جا رہی ہے۔ اور خود سرکاری خزانہ کے فنڈ بدیسی امداد سے حاصل ہوتے ہیں جو جدید نوآبادیاتی طاقتوں سے فراہم کی جا رہی ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید نوآبادی جبریت ناگزیر طور پر پاکستان کے سیاسی نظام کا سہارا بن کے رہ گئی ہے۔

امن کے ساتھ اور اچھے پڑوسیوں کی طرح رہنے کی اچھی اچھی باتیں کرنے کے باوجود یہ بات عیاں ہے کہ پاکستان امریکہ کی فوجی اسکیموں اور پڑوسی ملکوں کی جاسوسی کرنے کا ایک اڈہ بنتا جا رہا ہے۔ ایٹم بم تقریباً وہ بنا ہی چکا ہے۔ اس کے علاوہ اس سال کے آخر تک وہ امریکہ سے بہت خطرناک قسم کے چالیس ایف۔ ۱۶ لڑاکو ہوائی جہاز حاصل کرے گا۔ یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان، امریکہ اور چین کی شہ پر ایشیائی ملکوں میں دخل اندازی کرنے کے لیے ایک حربہ بن رہا ہے۔ اس سب کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی عوام جمہوری حقوق حاصل کرنے کے لیے لگاتار جدوجہد کر رہے ہیں۔

"پاکستان اور ایشیائی امن" میں پاکستان اور ہندوستان کے دانشوروں نے اُس ملک کی اسی دو رُخی تصویر کا حقیقت پسندانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ پاکستان کے اندرونی معاملوں اور ہند۔پاک رشتوں پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن یہ شاید پہلی ایسی تصنیف ہے جس میں ایشیائی امن کو ذہن میں رکھتے ہوئے پاکستان کے موجودہ حکمرانوں کے رول اور کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں جہاں پاکستان اس کی بیرونی پالیسی اور اس کے پڑوسیوں — خاص طور سے ہندوستان و افغانستان کے ساتھ اس پالیسی کے ناقص اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے وہیں اس کے دوسرے حصے میں پاکستانی سیاسی نظام کے ارتقا اور اس نظام پر وہاں کے "ناناشاہی حکمراں طبقے کی گرفت کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

وی ڈی چوپڑا جو ایک کہنہ مشق صحافی اور مصنف ہیں، "پیٹریاٹ" اخبار اور "لنک" کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ڈپٹی چیرمین ہیں، "انڈیا اینڈ دی سوشلسٹ ورلڈ" تصنیف پر "سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ" ملا ہے۔ وہ "پنٹاگن شیڈو اوور انڈیا" کے بھی مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے "اسٹڈیز اِن انڈو پاک ریلشنس" مرتب کی ہے " اگونی آف پنجاب" اور " انڈیاز یونٹی اینڈ سیکوریٹی" کے بھی معاون مصنف ہیں۔

قیمت : ۵۰ روپے